اکتوبر - دسمبر ۲۰۰۸ء

اُردو ادب میں عالمی معیار کا تحقیقی و تخلیقی مجلہ

عظیم مستشرق ...... رالف رسل

الاقرباء فاؤنڈیشن، اسلام آباد

سہ ماہی **الاقرباء** اسلام آباد

(تہذیب و معاشرت، علم و ادب اور تعلیم و ثقافت کی اعلیٰ قدروں کا نقیب)

جلد نمبر ۱۱ | شمارہ نمبر ۴ | اکتوبر۔دسمبر ۲۰۰۸ء

الاقرباء فاؤنڈیشن، اسلام آباد

مکان نمبر ۲۶۴، سٹریٹ نمبر ۵۸، آئی ۸/۳، اسلام آباد

Ph: 051-4442686 Fax: 051-2102670

Website www.alaqreba.com

E-mail alaqreba@hotmail.com

بیرونِ ملک معاونینِ خصوصی

یورپ بیرسٹر سلیم قریشی

2-A, Barclay Chamber, Barclay Road,
Leytonstone, London, E-11, 3DG
Phone: (0208) 5582289, Fax: 0(208) 5583849
E-mail: qureshi@ss.life.co.uk

امریکہ پروفیسر محمد اویس جعفری

218 North East, 175th Street,
P.O. Shore Line, Seattle (Washington) 98155-3516, USA
Phone: (206) 361-8094, Fax: (206) 361-0411
E-mail: jafreyomi@gmail.com

زرِ تعاون

فی شمارہ	۱۰۰؍روپے
سالانہ (مع محصول ڈاک)	۴۰۰؍روپے
بیرونِ ملک فی شمارہ (مع محصول ڈاک)	۷؍ڈالر/۵؍پاؤنڈ
بیرونِ ملک سالانہ (مع محصول ڈاک)	۳۰؍ڈالر/۲۰؍پاؤنڈ

کوائف نامہ

شمارہ	اکتوبر-دسمبر ۲۰۰۸ء
طابع	شیامہ پرنٹرز، اسلام آباد
ناشر	سیّد ناصر الدین
تدوین و ترتیب	محمد طارق علی، عبدالکریم قادری

مندرجات

'چو کفر از کعبہ برخیزد۔۔۔!'

جدید و مہذب ریاست کا تصور کسی آئین یا دستور کے بغیر نہیں کیا جاسکتا کہ یہ ایک ایسی ناگزیر دستاویز ہے جو صرف ریاست کا بنیادی قانون ہی نہیں بلکہ قومی تشخص اور اجتماعی زندگی کے اصول وضوابط کا سرچشمہ بھی ہوتی ہے۔ صرف ملکی ہی نہیں بین الاقوامی سطح پر جو تقدیس واحترام اسے حاصل ہوتا ہے وہی بین المملکتی تعلقاتِ کار کے تعین کی بنیاد بنتا ہے۔ مملکت کے بنیادی اجزائے ترکیبی میں مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ اہم ترین ستون خیال کیے جاتے ہیں۔ خاص طور پر عدلیہ کے فرائض منصبی میں جہاں آئین کی ترجمانی اور تصریحات شامل ہیں وہیں آئین کے حرف حرف کا تحفظ اور پاسداری اس کا اولین فریضہ ہے۔ اس فریضہ کی بروقت اور موثر ادائیگی ہی معاشرتی نظم وضبط اور قومی آرزوؤں کی تکمیل کی ضامن ہو سکتی ہے۔

دنیا کی کسی بھی مملکت کا آئین ایسا نہیں جس میں قومی وسرکاری زبان کا تعین نہ کیا گیا ہو چنانچہ پاکستان میں آئین سازی کی تاریخ شاہد ہے کہ اسلام کے نام پر حاصل کی گئی اس مملکتِ خداداد میں جتنے بھی آئین تشکیل دیے گئے یعنی ۱۹۵۶ء، ۱۹۶۲ء اور ۱۹۷۳ء کے دساتیر، ان میں سے ہر ایک میں اردو بحیثیت قومی زبان ایک قدرِ مشترک کے طور پر موجود ہے بلکہ ۱۹۷۳ء کے آئین میں جسے آج تک قومی اتفاق رائے کے صحیفے کی حیثیت حاصل ہے اردو زبان کو دفتری سطح پر مروج ومستقل کرنے کے لیے آرٹیکل ۲۵۱ میں واضح احکام موجود ہیں اور اس عمل کی تکمیل کے لیے پندرہ سال کی مدت کا تعین بھی۔ چنانچہ اس مدت کو گزرے دو دہائیوں سے بھی زیادہ وقت گزر چکا ہے۔ اس برملا اور سفاک بے حسی کی مثال شاید کرۂ ارض پر کہیں اور نہ مل سکے لیکن ہمیں اس کے باوصف غیرت مند قوم ہونے پر اصرار ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہماری معزز ومحترم عدلیہ نے آج تک اردو کے قومی زبان ہونے کے باوجود اس کے سرکاری زبان کے طور پر عدم نفاذ کا

نوٹس تک نہیں لیا جو ایک سنگین اور بلا جواز خلاف ورزی ہی نہیں بلکہ آئین جیسی مقدس سیاسی دستاویز کی شرمناک توہین بھی ہے اور توہین بھی کسی اجنبی کے ہاتھوں نہیں بلکہ اپنے ہی ملک کی انتظامیہ کے ہاتھوں جو مقننہ کو بھی جواب دہ ہے اور عدلیہ کو بھی۔ ٹریفک تک کے فروعی مسائل پر تو 'از خود نوٹس' لینے کا عدالتی اختیار استعمال کیا گیا لیکن سرکاری زبان جیسے اہم ترین مسئلہ کو بھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا یہی نہیں بلکہ ۱۹۹۱ء میں چند محبِ وطن اور غیرت مند پاکستانیوں کی جانب سے جناب محمد اسمٰعیل قریشی، سینئر ایڈووکیٹ عدالت عظمٰی پاکستان نے جس دردمندی، اخلاص اور غیرتِ قومی کے جذبے کے ساتھ عدالتِ عالیہ لاہور میں ناقابلِ تردید دلائل اور شواہد کے ساتھ آئین کے آرٹیکل ۱۹۹ کے تحت جو تاریخی درخواست پیش کی تھی وہ آج بھی سترہ برس گزر جانے کے باوجود عدالتی سردخانے سے باہر نہیں آسکی ہے۔ اس درخواست کا مکمل متن اور جناب قریشی کا چشم کشا مکتوب 'الاقرباء' کے زیرِ نظر شمارے میں شریکِ اشاعت ہے یہ مکتوب اور درخواست جہاں عدالتی حصار میں بلند و بالا کرسیوں پر متمکن قومی حمیت سے بیگانہ بعض افراد کے تعصب آلود اور تدبر باختہ ذہنی غلامی کے افرنگ زدہ رویوں کو بے نقاب کرتا ہے وہیں اعلیٰ عدلیہ کے ماضی میں کردار کے بارے میں بھی دل شکن سوالات کو جنم دیتا ہے۔ محبِ وطن پاکستانیوں کے سر شرم سے جھک جاتے ہیں جب اُن سے بیرونِ ملک یہ سوال کیا جاتا ہے کہ ساٹھ برس گزر جانے کے باوجود بھی کیا آپ کی قومی زبان کو اجازت نہیں کہ وہ دفتروں اور سرکاری ایوانوں میں بار پا سکے؟

قومی حمیت کے جسدِ نحیف پر یہ زخم ہی کیا کم تھا کہ اسلام آباد کی نومولود عدالت عالیہ نے حکومت پاکستان کے غیر معمولی گزٹ مجریہ ۲۹ مئی ۲۰۰۸ء کے ذریعہ یہ حکم صادر فرما دیا کہ عدالت عالیہ میں پیش کی جانے والی ہر دستاویز، بیان اور درخواست کا انگریزی زبان میں تحریر کیا جانا لازمی ہوگا اور یہ کہ انگریزی کے علاوہ کسی بھی دوسری زبان میں پیش کی جانے والی کوئی بھی دستاویز قابل

قبول نہیں ہوگی۔ تاوقتیکہ اُس کا انگریزی زبان میں ایسا تحریری ترجمہ نہ پیش کیا جائے جو منجملہ دیگر شرائط کے مصدقہ ترجمہ ہو اور جس پر فریقین متفق ہوں۔ نیز کوئی بھی مقدمہ یا عدالتی کارروائی اس وقت تک زیرِ سماعت نہیں لائی جائے گی جب تک کہ تمام فریقین یہ یقین دہانی نہ کرا دیں کہ تمام دستاویزات جو پیش کی گئی ہیں اور جن پر انحصار کیا جانا مقصود ہے انگریزی زبان میں تحریر کردہ ہیں یا ان کا ترجمہ انگریزی زبان میں کر دیا گیا ہے۔ اللہ اللہ! کیا یہی وہ مقاصد تھے جن کے لئے پاکستان قائم کیا گیا تھا؟ کیا واقعی اب انگریزی زبان ہمارے قومی تشخص کی ضامن ہے؟ کیا قومی زبان کے بارے میں بانیٔ پاکستان کے واضح فرمودات کو فراموش کر دیا گیا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں! جب تک قومی حمیت سے سرشار افراد پاک سرزمین پر زندہ ہیں وہ ایسے اقدامات کی مزاحمت کرتے رہیں گے جو اُن کا آئینی حق بھی ہے اور قومی فریضہ بھی۔

ہمیں یاد ہے کہ ۱۹۶۸ء میں ایسی ہی ایک صورتِ حال منظرِ عام پر آئی جب عدالتِ عالیہ نے خیری خاندان کے چشم و چراغ جناب حبیب الوہاب الخیری ایڈووکیٹ کی اردو میں تحریر کردہ درخواست کو قبول کرنے اور اردو میں اُن کے دلائل سننے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ عدالتی زبان انگریزی ہے۔ جس پر جناب خیری نے جن کے بزرگوں ڈاکٹر عبدالجبار خیری اور پروفیسر عبدالستار خیری نے فرنگی استبداد کے سامنے کبھی سرِ خم نہیں کیا اور علامہ راشد الخیری بھی کہ مسلمان نسلوں کو اخلاقیات پر مبنی بیش بہا ادب پارے ورثے میں دیے گئے ہیں یہ کہہ کر عدالتی حکم ماننے سے انکار کر دیا کہ آئین کی رُو سے جب تک اردو پاکستان کی قومی زبان ہے وہ اسی کو استعمال کرتے رہیں گے چنانچہ جناب خیری کا موقف تسلیم کیا گیا اور آج تک عدالت ہائے عالیہ و ماتحت میں اردو درخواستوں اور اردو میں دلائل دینے پر کبھی اعتراض نہیں کیا گیا لیکن اس بوالعجبی کو کیا کہیئے کہ اسلام آباد کی عدالتِ عالیہ جس کے آئینی فرائض میں قومی زبان کا نفاذ و احترام شامل ہے کل نظر بن کر رہ گئی ہے اور اردو جو زبانِ غیر سے اپنا منصب واگزار کرانے کے لئے گذشتہ چھ دہائیوں سے سرگرداں چلی آرہی ہے آج غالب کے اس شعر کی عصری معنویت کی عبرتناک مثال

بن کر رہ گئی ہے کہ:

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

عظیم مستشرق اور مبلغ اردو 'رلف رسل' کی رحلت:

اردو زبان کی لسانی مقناطیسیت اور سحر آفریں جذب و کشش کا یہ اعجاز ہے کہ اس نے دنیا بھر میں اپنے پرستار پیدا کیے اور خاص طور پر مغرب میں ایسے سکالرز کو اپنی آغوشِ عاطفت میں لیا جنہوں نے اردو کو بطور ذریعۂ اظہار عالمگیریت عطا کی اور اس میں تخلیق ہونے والے عظیم ادب کو چار دانگ عالم میں متعارف کرایا۔ ایسے ہی سکالرز میں رلف رسل کا نام سرِفہرست ہے۔ ۱۴ ستمبر ۲۰۰۸ء کو نوے برس کی عمر میں لندن میں آپکے انتقال کے ساتھ اردو زبان و ادب ایک عظیم مستشرق محسن اور مبلغ سے محروم ہو گئے ہیں۔ انہیں بجا طور پر مغربی دنیا میں 'بابائے اردو' کی حیثیت سے یاد کیا جاتا رہا ہے۔

کیمبرج یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ رلف رسل نے ترجمہ و تحقیق کے ذریعہ اردو کے لئے اپنی خدمات کو ضرب المثال بنا دیا ہے۔ انہوں نے لندن یونیورسٹی کے افریقی والسۂ شرقی کے سکول سے بحیثیت طالب علم ۱۹۴۶ء میں اپنی وابستگی کا آغاز کیا اور ۱۹۴۹ء میں اردو میں ڈگری لے کر فارغ التحصیل ہوئے۔ یہاں اردو کے ساتھ ذیلی مضمون کے طور پر انہوں نے سنسکرت زبان کا بھی مطالعہ کیا۔ ۱۹۴۹ء ہی میں انہیں اپنے مادرِ علمی میں معلمی (لیکچررشپ) کی پیش کش ہوئی جسے انہوں نے قبول کر لیا اور ۱۹۸۱ء میں قبل از وقت ریٹائرمنٹ لینے تک بتیس برسوں میں انہوں نے جامعہ میں اردو کے تدریسی نظام کو موثر ترین بنا دیا۔ انہوں نے طلباء کے لئے متعدد نصابی کورس وضع کیے جن سے درسگاہ کے اندر اور باہر بے شمار لوگوں نے استفادہ کیا۔ انہوں نے سکول کی ملازمت کے آغاز ہی میں نومبر ۱۹۴۹ء سے اکتوبر ۱۹۵۰ء کے دوران برصغیر پاک و ہند کا مطالعاتی دورہ کیا اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں خاصا وقت گزارا۔ رسل نے اس قلیل مدت میں پاک و ہند کے

تقریباً تمام ممتاز و قابلِ ذکر علمی و ادبی مراکز سے رابطے کیے اور معاصر شخصیات سے ملاقاتیں کیں۔ اس دوران رالف رسل کو خورشید الاسلام سے متعارف ہونے کا موقع ملا جو بالآخر اُن کی آئندہ چالیس برس تک علمی و ادبی رفاقت کا سبب بنا۔ یہ رفاقت اردو زبان و ادب کے لیے نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوئی۔ ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۶ء تک خورشید الاسلام بھی سکول برائے افریقی و السنۂ شرقی سے وابستہ رہے اس رفاقت کار نے دونوں سکالرز کو موقع فراہم کیا کہ وہ مغربی دنیا کو اردو ادب کے بہترین ورثے سے متعارف کرائیں چنانچہ یہ عظیم الشان کام وسیع پیمانے پر تراجم کے ذریعے انجام دیا گیا۔

رسل اور خورشید الاسلام کے اس اشتراکِ عمل کے نتیجے میں متعدد کتب تصنیف و تالیف کی گئیں جن میں اٹھارہویں صدی عیسوی کے تین عظیم شعراء میر تقی میر، میرزا رفیع سودا اور میر حسن پر انگریزی زبان کی مبسوط تالیف سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب تینوں شعراء کے عہد اور معاشرتی پس منظر پر جو اُن کی شاعری کو فکری بنیاد فراہم کرتا ہے۔ ایک مستند دستاویز ہے۔ مغل عہد حکمرانی کا سریع الحرکت زوال اور معاصر شعری روایات بھی کتاب کے موضوعات میں شامل ہیں۔ پہلی بار یہ کتاب امریکہ میں ہارورڈ سے شائع ہوئی جسے بعد میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس انڈیا نے بھی شائع کیا۔ انگریزی زبان میں ایک اور کتاب رسل اور خورشید الاسلام کے اشتراکِ عمل سے منظرِ عام پر آئی جس میں اٹھارویں صدی کے میرؔ اور انیسویں صدی کے غالبؔ کے فکر و فن کا بسیط و وسیع جائزہ لیا گیا ہے۔ مغربی قارئین کو اس کتاب کے ذریعہ اردو شاعری کی عظمتوں کے نقیب میر و غالب کے اسالیبِ شعری اور متنوع موضوعات پر اُن کی بے مثال گرفت سے مولفین نے جس طرح متعارف کرایا ہے اور دو سو سال (۱۷۵۰۔۱۹۵۰) کے ادب کا جائزہ پیش کیا ہے۔ اس کے بعد اردو شعر و ادب کا انگریزی ادب سے تقابلی جائزہ لینے والوں کو ہر طرح کے احساسِ کہتری کو جھٹک دینا چاہیے۔ رسل کو یہ شکایت اردو ادب کی نسبت ہیچ مقداری کے احساس میں مبتلا اشخاص سے ہمیشہ رہی اور اُس نے اپنے مضامین و مقالات سے اس تاثر کی مدلل نفی کی۔ ایک اور انگریزی زبان کی تصنیف جس کے عنوان کا ترجمہ "اردو ادب کی تلاش میں" کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے

رسل کی ایسی شاہکار کاوش ہے جس کے ذریعہ اس نے مغربی دنیا میں اردو زبان وادب کا سکہ بٹھا دیا۔ اس کتاب کا ترجمہ محمد سرور راجہ نے کیا جسے انجمن ترقی اردو پاکستان نے ۲۰۰۳ء میں شائع کر کے اہم خدمت انجام دی۔

اردو زبان وادب کے حوالے سے رسل کی خدمات ناقابل فراموش ہیں اس کی خودنوشت سوانح ۲۰۰۱ء میں ہی منظر عام پر آ چکی ہے اور ایسے امکانات کی غماز ہے جو متقاضی ہیں کہ ہم اردو والے اس محسن اردو پر وسیع تحقیق کا جامعاتی وغیر جامعاتی اہتمام کر کے احسان شناسی کا ثبوت فراہم کریں۔ یہی نہیں ضرورت اس امر کی ہے کہ رسل کی مطبوعات کا انتخاب کر کے مختلف سطحوں پر نصابی درسیات کا حصہ بنایا جائے۔ اس شخص نے اپنی تمام عمر اردو کی تحقیق و ترویج میں صرف کر دی اور کلاسیکی عہد سے موجودہ دور تک کونسا ایسا قابلِ ذکر موضوع یا شخصیت ہے جس پر رسل نے سرمایۂ تحقیق ورثے میں نہ چھوڑا ہو۔ غالب کے خطوط اور مرزا محمد ہادی رسوا کی ''امراؤ جان ادا'' سے لے کر محمد حسین آزاد، عبدالحلیم شرر، فرحت اللہ بیگ، الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد، تحریک علی گڑھ، اکبر الہ آبادی کے مقصدی طنز و مزاح پر مبنی شاعری اور اقبال کا پیغام اور فکر و فن رسل کی توجہ کا ہدف بنے رہے ہیں۔ اُس نے اردو غزل پر بحیثیت صنفِ سخن لازوال کام کیا ہے اور افسانہ و ناول کے حوالے سے پریم چند، عصمت چغتائی، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو اور شوکت تھانوی وغیرہ کو عالمی سطح پر اُن کی نگارشات کے آئینہ میں منعکس کر کے رسل نے اردو سے اپنے اخلاص اور والہانہ تعلق کا برملا ثبوت فراہم کیا ہے۔ یہاں تک کہ اپنی آئندہ نسل کو بھی وہ یہی خدمت سپرد کر گیا ہے چنانچہ آج رسل کا بیٹا ایان رسل اُسی جامعہ لندن کے سکول برائے افریقی والسنۂ شرقی میں جہاں اُس کے باپ نے مدت العمر تک اردو کی خدمت کی اُس کا جانشین ہے:

''خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را''

پروفیسر ڈاکٹر محمد معز الدین

گنجینۂ معارف مولانا تمنا عمادیؒ

(۱۳۰۵ھ تا ۱۳۹۲ھ)

مولانا تمنا عمادیؒ نے صوفی خاندان میں تربیت پائی۔ آپ کے والد ماجد مولانا سید شاہ نذیر الحق فائز عمادی کا شمار ممتاز اور مشہور حکیموں میں ہوتا تھا۔ فارسی میں صاحب دیوان تھے۔ چنانچہ مولانا تمنا عمادی کا بچپن ہی سے شعر و شاعری اور حکمت کا ماحول تھا۔ کہا جاتا ہے کہ آٹھ سال کی عمر سے ہی مذاق سخن اور قافیہ پیمائی کا آغاز ہوا اور باقاعدہ شعر کہنے لگے۔ اس علمی ماحول میں اپنے والد بزرگوار کے سامنے زانوئے علم تہہ کیا اور نوجوانی میں ہی درس نظامی کی سند حاصل کر لی۔ خانقاہ عمادیہ کے حضرت شاہ رشید الحق سجادہ نشین کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اور خانقاہ عمادیہ پھلواری شریف کے علماء، صوفیہ اور شعراء کی صحبت سے فیض یاب ہوئے۔ شمشاؔد لکھنوی کی شاگردی اختیار کی اور فن شاعری کا مطالعہ ذوق و شوق سے شروع کر دیا۔ فن عروض و بلاغت میں عبور حاصل ہو گیا۔ فارسی میں مولانا شبلی نعمانی سے استفادہ کیا۔ فارسی زبان میں ان کی برجستگی، شگفتگی اور فصاحت بیاں قابل تحسین ہیں۔ غزلوں اور نظموں کے مجموعہ کے علاوہ ان کی دو مثنویاں ''تہذیب و عقل'' اور ''معاش و معاد'' تھیں۔ جن میں زندگی کے مسائل پر بھرپور روشنی ڈالی گئی۔ ان کے حسن بیان کی داد دینی پڑتی ہے۔ زندگی کے نشیب و فراز اور علائق پر ان کی گہری نظر تھی۔ دینی علوم کے مختلف پہلوؤں پر ان کو کمال حاصل تھا۔ آپ بیک وقت مفسر قرآن حکیم اور حدیث و فقہ کے عالم بے مثال تھے اور امام علم اسماء الرجال تھے۔ اس میں ایسا درک تھا کہ اس علم و فن پر ہندوستان و پاکستان میں شاید ہی کوئی ان کا مد مقابل ہو۔ تحقیق اور مطالعۂ اسلام و تاریخ میں ساری عمر گزار دی۔ حتیٰ کہ بینائی بری طرح متاثر ہو گئی۔ خورد بین سے کام لیتے۔

مولانا بہ حیثیت محدث: بہ حیثیت محدث مولانا تمنا کا مقام بہت بلند تھا۔ تحقیق و درایت کے ضمن میں ان کا مقابل ان کے زمانے میں مشکل سے کوئی اور نظر آتا ہے۔ انہوں نے جھوٹی روایتوں کو پارہ پارہ کرکے دین اسلام کے پانی کو گدلا ہونے سے روکا۔ قرآن کریم کے باب میں ان کی دو کتابیں جمع القرآن اور اعجاز القرآن نہایت مستند اور عالمانہ سمجھے ہیں۔ تاریخ و تحقیق سے انہوں نے ثابت کر دیا تھا کہ قرآن پاک کی ترتیب اور تدوین خود محمد مصطفی ﷺ کے مبارک ہاتھوں سے ہوئی۔

مولانا احادیث پر گہری نظر رکھتے تھے۔ وہ ماہر اسماء الرجال تھے۔ ہر حدیث کو اس کے راوی کی کسوٹی پر جانچتے تھے۔ ان کے نزدیک ہر راوی کا قابل وثوق ہونا ضروری تھا۔ وہ فرقے اور گروہ کے سخت مخالف تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمارے نبی آخر الزماں ﷺ اور خلفائے کرام مسلم تھے لہٰذا ہمیں بھی صرف مسلم ہی ہونا چاہئے۔ روایت پرستی' فرقہ بندی کو جنم دیتی ہے۔ اور وحدت ملی کے لئے یہ سم قاتل ہے۔ ان کا یہ شعر روایت پرستی کے ضمن میں قابل توجہ ہے۔

کرتا ہے ہر خبر پہ تمنا یقین کیوں؟ — ناداں تو یہ دوست، فریب خوردہ ہو

اہل سنت کی معتبر احادیث بخاری' مسلم' ترمذی وغیرہ میں بعض حدیثیں اہل سنت کے مسلک کے خلاف قرار دی جاتی ہیں۔ مولانا نے عربی میں ایک کتاب ایسی تصنیف کی جس سے صحیح اور غلط حدیثوں کی جانچ کی جا سکتی ہے۔ یہ بڑا دقت طلب کام تھا۔ مولانا کا یہ ایک منفرد کام ہے۔ اس بحث پر ان کی ایک رباعی برمحل ہے۔

چارہ نہیں ہر چند روایت کے بغیر — مانوں نہ روایت کو درایت کے بغیر
تقلید ہے 'رات' اور تحقیق ہے شمع — شب کو نہ چلو شمع ہدایت کے بغیر

اس سلسلے میں مولانا کے بے شمار مضامین عربی اور اردو میں موجود ہیں جن سے ان کے فکر و نظر کی گہرائی' قوت' استدلال اور تحقیق کی داد دینی پڑتی ہے۔ قرآن و حدیث پر ان کی تحریریں امت

مسلہ کے لئے نایاب مواد فراہم کرتی ہیں۔ حضرت مولانا تمنا عمادی کو علم عروض وقواعد زبان عربی' اردو اور فارسی پر مکمل دسترس حاصل تھی۔ ان زبانوں کے نحو وصرف پر استادانہ عبور حاصل تھا۔ یہاں تک کہ اس فن میں مشکل سے کسی کو اپنے برابر سمجھتے تھے۔ حتیٰ کہ حضرت شادؔ عظیم آبادی کو بھی فنی لحاظ سے تسلیم نہیں کرتے تھے چنانچہ ان کا ایک شعر

حضرتِ شاد سے جا کر یہ تمنا کہہ دو — آپ کا رنگ تغزل ہے مگر فن میرا

ہم اسے تعلّی کہیں کے یا شاعرانہ چشمک یا شادؔ عظیم آبادی کے رنگ تغزل کا اعتراف۔ ان کا ایک شعر ہے:

کچھ نہ کچھ بات تمنا کے ہر ایک شعر میں ہے — نہ ہو مضمون تو لفظوں کی رعایت ہو گی

تاہم یہ حقیقت ہے کہ ان کی نہایت جامع اور ہمہ گیر شخصیت تھی اور ان کی قادر الکلامی پر بڑے بڑے شعراء داد دیتے اور خراج تحسین پیش کرتے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے ایک عظیم الشان مشاعرے کے موقع پر حضرت داغؔ دہلوی کے شاگرد رشید احسنؔ مارہروی مشاعرے کے مہمانِ خصوصی تھے۔ مولانا تمنا عمادی میر مجلس تھے۔ اس مشاعرے کے صدر سر علی امام تھے۔ جو وائسرائے ہند کی ایگزیکیٹو کونسل کے نائب صدر تھے اور وائسرائے کے عہدے پر بھی عارضی طور پر فائز رہ چکے تھے۔ شعر وسخن کے نہایت دلدادہ تھے۔ علامہ اقبال کے دوست تھے۔ علامہ نے اپنی فارسی مثنوی 'اسرار خودی' کے پہلے ایڈیشن کو ان کے اسم گرامی سے معنون کیا تھا۔ اس مشاعرے میں برعظیم کے ممتاز شعرائے کرام مدعو تھے۔ مشاعرے کے درمیان احسنؔ مارہروی نے مولانا تمنا کو مخاطب کر کے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ:

تازی و فارسی و اردو میں — قدرت شعر ہو یکساں جس کو
ایک تمنائے عمادی کے سوا — میں بتاؤں تو بتاؤں کس کو

پٹنہ کی ایک عربی فارسی درسگاہ میں برسوں عربی و فارسی کی تعلیم دیتے رہے اور درسی معیاری کتابیں لکھیں اور بہت جلد ذہین وفطین مدرس اور محقق اور فقہ کے عالم کی حیثیت حاصل کر لی۔ درس وتدریس قرآن ان کا ساری عمر نصب العین رہا۔ قرآن پاک کے ترجمے کے اغلاط کی نشان دہی کرکے مترجمین کو خطوط لکھتے اور قرآن حکیم کو ان اغلاط سے پاک دیکھنا چاہتے تھے۔

حضرت تمنا عمادی کو جس قدر علم عروض وقواعد پر عبور تھا اس کی تعریف وتحسین فصاحت جنگ حضرت جلیل مانک پوری استاد میر عثمان علی خاں نظام حیدرآباد دکن برملا کرتے تھے کہ ''ہندوستان میں اس علم پر ایسی قدرت رکھنے والا علامہ تمنا عمادی کے علاوہ اور کوئی شخص نظر نہیں آتا''۔ خان بہادر رضا علی وحشتؔ' ڈاکٹر عندلیب شادانی اور ماہر علم عروض امیر الاسلام مشرقی ان کی زباندانی' عربی' فارسی اور اردو میں ان کا لوہا مانتے تھے۔ بلاشبہ مولانا تمنا ایک عالم بے بدل تھے۔ دورِ حاضر کی علمی' دینی' ثقافتی اور شعروسخن کی امتیازی شخصیات میں ایک بلند وامتیازی شان اور نمایاں مقام رکھتے تھے۔ محمد انفس الرحمٰن ایڈووکیٹ سندھ ہائی کورٹ کراچی اور اردو اور انگریزی کے ممتاز صاحب نظر مصنف مولانا تمنا عمادی کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ان کی علمی' ادبی اور قومی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں:

''علامہ تمنا عمادی کی شخصیت دبستان عظیم آباد کی گراں مایہ شخصیتوں میں امتیازی شان کی حامل ہے۔ وہ ساری عمر اپنی علمی گہرائی' فکری بلندی' جودت طبع اور ذہن رسا کی مدد سے دین کی مدافعت کا حق ادا کرتے رہے۔ دشمنانِ اسلام کے دلوں پر اسلام کی عظمت کا سکہ بٹھاتے رہے اور مخالفوں کی مغالطہ آمیز تحریروں اور تقریروں کی دھجیاں بکھیرتے رہے۔''

مولانا کی ایک مشہور تصنیف ''ایضاح سخن بتوضیح اصلاح سخن'' ہے۔ یہ کتاب دراصل شعروشاعری پر نقد ونظر کا ایک جامع جائزہ ہے۔ شوق سندیلوی کے دس اشعار کی ایک غزل پر سترہ مشہور اساتذہ کی اصلاحوں کا جائزہ ہے۔ علامہ نے نہ صرف ان غزلوں پر تبصرہ کیا ہے بلکہ اصلاح کرنے والے اساتذہ کو بھی مخاطب کرکے فنی نکات سے بحث کی ہے۔ جس سے علامہ کی فنی اور استادی

باریکیوں پر ان کی عالمانہ نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ فصاحت، بلاغت، نیز زبان و بیان اور مذاقِ سخن پر بھی انتقادی نظر ڈالی ہے۔ مذکورہ کتاب جب شائع ہوئی تو اردو کے ممتاز اساتذہ اور اہلِ نظر نے اس پر اظہارِ خیال کیا۔ مولانا کی اس تصنیف پر چند ہم عصر مشاہیر کے تبصرے قابلِ غور ہیں:

- **مولانا نیاز فتح پوری:**

''شوقؔ کی غزل میں کوئی خاص بات تھی نہ اس کی اصلاحوں میں لیکن مولانا تمنا عمادی نے بہ سلسلۂ تشریح و تنقید سیکڑوں لغوی، لسانی، فنی نکات ایسے پیش کر دیے ہیں کہ کتاب ''ایضاح سخن'' ایک عالمانہ تصنیف ہو گئی۔''

- **حضرت جوش ملیح آبادی:**

''میری تمنا ہے کہ حضرت تمنا کے سے ماہر زبان تا دیر تندرست اور زندہ رہیں اور اس کے دوش بدوش میری آرزو ہے کہ سجادے سے دور ہو کر پھر ایک بار مسند ادب پر جلوہ افروز ہو جائیں اور اردو ادب کے مطلع کو دوبارہ جگمگا دیں۔''

- **پروفیسر رشید احمد صدیقی:**

''فن شعر پر آپ کو جو عبور ہے اس پر اعتقاد نہ رکھنے والا آپ بے بہرہ ہے۔ آپ ایسے کامل الفن اب بہت کم ملیں گے۔ جن اساتذہ نے پورے پورے مصرعے بدل دیئے ہیں وہ بھی شعر کی کوئی قابل لحاظ حیثیت نہ بنا سکے۔ البتہ آپ نے اس سلسلے میں جو نکات فن و زبان اور اس کے متعلقات بیان کر دیے ہیں وہ ہر اعتبار سے نہایت قابل قدر ہیں جس کے لیے خدمت گذارگان شعر و ادب آپ کے احسان مند رہیں گے۔''

- **پروفیسر ڈاکٹر عندلیب شادانی:**

''ایضاح سخن'' دوسرے اساتذہ کی اصلاحوں پر صرف تنقید ہی نہیں بلکہ تنقید کے ضمن میں بہت سے لسانی، ادبی، لغوی اور فنی مسائل زیر بحث آ گئے ہیں اور مولانا کی فاضلانہ بحثوں نے ''ایضاح سخن'' کو ایک قابل تصنیف بنا دیا ہے۔

علامہ تمنا کہ ہیں اک علم کا دریا　　　واقف نہیں کون آپ سے ادنیٰ ہو کہ اعلیٰ

اخلاق میں اطوار میں تقویٰ میں عمل میں	ذات ان کی نمونہ ہے بزرگان سلف کا
لکھا ہے مہمات مسائل پہ بہت کچھ	آسان نہیں جملہ تصانیف کا احصا
گو شاعری ہے آپ کے رتبے سے فروتر	جاتا ہے ادھر سے بھی ورنیض کو رستا

○ **پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی:**

''مولانا نے جن ادبی نکات کی نقاب کشائی کی ہے وہ آج بھی اہل ذوق کیلئے ویسے ہی تروتازہ اور بصیرت افروز ہیں جیسے نصف صدی پیشتر تھے۔ انہوں نے بعض الفاظ' محاورات اور ترکیبوں پر محققانہ بحث اور اغلاط نامہ کی تصحیح کی ہے ان سے نوآموز نوجوان ہی نہیں بلکہ مشاق اہل قلم اور اہل تحقیق بھی فیض یاب ہو سکتے ہیں۔ ان کا تفنن طبع اور ذوق تحرج مولانا شبلی مرحوم کی یاد تازہ کرتا ہے۔ علم الرجال میں ان کی نظیر ہندوستان و پاکستان میں نظر نہیں آئی۔''

○ **پروفیسر ڈاکٹر شوکت سبزواری:**

''ایضاح سخن'' میں مولانا مدظلہ نے شوقؔ سندیلوی کی کتاب ''اصلاح سخن'' کی اصلاحات پر ناقدانہ نظر ڈال کر ان کی استادانہ شرح وتنقید کی ہے۔ ضمناً بہت سے علمی وادبی اور لغوی مسائل بھی زیر بحث آگئے ہیں۔ مولانا مدظلہ نے دقیقہ نظر اور علمی تبحر سے کام لے کر جس مسئلے پر روشنی ڈالی ہے اس کی تحقیق وتنقید کا حق ادا کر دیا ہے۔ خداوند تعالیٰ ان کو اس کی جزا اور خیر الجزا عطا فرمائے۔ آمین!''

○ **جناب مولوی حکیم سید محمد یوسف صاحب پھلواروی:**

ایضاح سخن دیکھ کے کہتے ہیں سخنور	اس طرز کی تصنیف تو نایاب ہے گویا
الفاظ ہیں تابار تو درخشاں ہیں معانی	ہر فقرہ تر گوہر خوش آب ہے گویا
دریائے سخن کے وہ شناور ہیں تمنا	ہر بحر معانی جنہیں پایاب ہے گویا
یوسف نے کہی سن کے یہ تاریخ طباعت	ایضاح سخن اک گل شاداب ہے گویا

۱۹۶۱ء

علامہ تمنا عمادی کثیر الجہت فنی شخصیت کے مالک تھے۔ درسی' علمی' ادبی معروفیات کے علاوہ معاشرتی نیز سیاسی سرگرمیوں کے ساتھ قانونی دلچسپی حیران کن ہے۔ چوٹی کے انگریزی داں وکلاء کو اپنی فارسی دانی سے ایک دلچسپ مقدمے میں مات دے دی۔ ہندوستان میں ایک سنسنی خیز مقدمے میں مولانا تمنا کو فارسی کے ایک لفظ کے صحیح معنی کی وضاحت کے لئے پیش ہونا پڑا۔
"مقدمے کی نوعیت یہ تھی کہ ضلع شاہ آباد کے ایک گاؤں کے مہاراج کا انگریزوں کے ساتھ برما کی زمین کا وثیقہ تھا۔ اس زمین سے پیداوار نہ ہونے کے سبب مہاراج انگریزوں کو واپس کرنا چاہتا تھا۔ اس کے دیوان نے گزارش کی کہ میری خدمات کے عوض مجھے عطا کر دیں۔ مہاراج نے تحریری طور پر برما کی ساری زمین دیوان کو عطا کر دی۔ کچھ دنوں کے بعد مہاراج اور دیوان فوت ہو گئے۔ وقت گزرنے کے بعد زمین زرخیز ہو گئی تو مہاراج اور دیوان کی اولاد میں زمین کی ملکیت کے لئے مقدمہ شروع ہو گیا۔ مہاراج نے جو دستاویز لکھ کر دیوان کو دی تھی وہ ایک شکستہ فارسی زبان میں تھی جس کی صحیح تشریح پر مقدمے کا دارومدار تھا۔ اس کی عبارت یہ تھی:

''برائے آبادی زمین برما مبلغ بست و پنجاہ ہزار روپیہ اعانت ''منظوری تمام'' اس کا ایک لفظ 'اعانت' بھی پڑھا جاتا تھا اور 'اینجاب' بھی۔ دونوں الفاظ کے مختلف معنی ہیں اس کے نتائج دو نکلتے تھے۔ اس لفظ کو پڑھ کر صحیح لفظ کا تعین کرنا تھا۔ ہندوستان کے مختلف جید علماء اور قانون دان بلائے گئے تھے۔ ڈاکٹر محمد اقبال لاہور سے اور الہ آباد یونیورسٹی سے صدر شعبۂ اردو و فارسی پروفیسر ڈاکٹر عبدالستار اور مولانا تمنا عمادی پھلواروی حیدر آباد دکن سے آئے۔ اس وقت وہ وہاں شعبۂ دینیات سے وابستہ تھے۔ دلی سے موتی لال نہرو اور بہار سے بابو راجندر پرشاد جو بعد میں ہندوستان کے صدر ہوئے، دیون کے جانشین 'ہری جی' کی طرف سے مقدمے کی پیروی کر رہے تھے۔ مہاراج کے ورثاء کی طرف سے ہندوستان کے بڑے بڑے نامی گرامی وکلاء بلائے گئے تھے۔ مولانا تمنا عمادی نے مطلب کو واضح کرنے کے لئے بروقت ایک کتابچہ بعنوان اعانت نامہ لکھ کر اپنے علم و دانش کا سکہ بٹھا دیا۔ دلائل و شواہد کا انبار لگا دیا۔ مولانا کی غیر معمولی علم و دانش سے موتی لال نہرو اور راجندر پرشاد ششدر رہ گئے۔ بڑے قانون دانوں اور چوٹی کے وکلاء کے ہجوم میں

مولانا تمنا کی نکتہ سنجی کی دھوم مچ گئی۔ مولانا نے فارسی لغت' بہار عجم' اور دیگر فارسی کتب کے حوالے دے کر ثابت کر دیا کہ امداد کردن کو اعانت نمودن کے معنی میں لکھا گیا ہے۔ مرزا قتیل کی کتاب' ظفر الامانی' پیش کی۔ علاوہ ازیں لفظ اجتناب کا محاورہ اہل زبان کے استعمال کے خلاف ثابت کیا۔ مقدمہ کا فیصلہ دیوان کے حق میں ہوا۔ علامہ کے تمام دلائل و براہین کو پٹنہ ہائی کورٹ نے مان لیا۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد تو ان کے علم و دانش سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ہندوستان کے عدم تعاون کے زمانہ میں جو قومی یونیورسٹی پٹنہ میں قائم کی گئی اس میں عربی' فارسی اور اردو کے پروفیسر کے لئے حضرت علامہ تمنا سے گذارش کی۔

مولانا بہ حیثیت شاعر:

علامہ تمنا کا بہ حیثیت شاعر ادبی دنیا میں بلند مقام ہے۔ عربی' فارسی اور اردو میں ان کی بے شمار تصانیف ہیں۔ ان زبانوں کے یہ سرگرم محقق اور عظیم شاعر و ادیب تھے۔ بلاشبہ دبستان عظیم آباد کی شعری عظمتوں کو روشن سے روشن تر کر دیا۔ شاد عظیم آبادی کے شاگرد رشید پروفیسر مسلم عظیم آبادی ان کے بچپن کے دوست تھے۔ انہوں نے بہار کے ممتاز صاحبانِ علم و نظر پر اپنی رحلت سے کچھ پہلے خاکوں پر مبنی ایک دلچسپ کتاب ''حریفانِ بادہ پیما'' لکھی تھی۔ اس میں وہ حضرت تمنا کے خاکے میں لکھتے ہیں کہ ''مولانا تمنا عمادی اپنے صغر سنی ہی کے ابتدائی دور سے شاعری کے رسیا ہیں۔ تغزل ان کا مرغوب و محبوب تھا۔ شمشاد لکھنوی کے شاگرد ہوئے اور فن کا غائر مطالعہ کیا کوئی قافیہ ان کی دسترس سے بچ نہ پاتا۔ فارسی شاعری میں مولانا شبلی نعمانی سے استفادہ کیا۔''

مولانا کا شعری انتقاد میں کیا مقام تھا۔ اور ان کا دائرۂ عمل زندگی کے ہر شعبے پر کتنا پھیلا ہوا تھا اور اپنے اشعار سے ملت مسلمہ کی کتنی خدمت انجام دی اس کا اندازہ گذشتہ صفحات کے مندرجات سے کیا جا سکتا ہے۔ ہندو مسلم فسادات ہوں' مسلم لیگ کی صف آرائی یا تحریک خلافت کی سرگرمیاں' ان کا قلم بیچ رہنمائی کے لئے متحرک ہو جاتا۔ تحریک پاکستان کے ہر موقع پر اپنے اشعار سے مسلمانوں کی صحیح سمت پر ان کی رہنمائی کے لئے کوشاں رہتے۔ ان کے اس انداز فکر کا عکس ان کی بعض نظموں میں جو انہوں نے ۱۹۵۸ء میں ایوب خان کے فوجی انقلاب کے بعد اردو، فارسی اور

عربی میں تضمین، نظر آتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

چاہیے فاروقِ اعظم کا تمہیں نقشِ قدم   کیوں ہو فکرِ نقشِ پائے قائدِ اعظم تمہیں
تم کو قرآن و سنن سے چاہیے رکھنا شغف   نفع کیا دے گا یہ موسیقی کا زیر و بم تمہیں
ابنِ آدم ہو تو ہو گا کچھ نہ کچھ تم سے گناہ   مرشد توبہ ہے لیکن توبۂ آدم تمہیں
بازپرسِ آخرت سے تم اگر ڈرتے رہے   کون کہہ سکتا ہے رازِ دیں سے نامحرم تمہیں

ان کو پاکستان کی تعمیر و ترقی اور اصلاح کا خیال تھا۔ اپنی نظمیں ایوب خان کے پاس بھیجیں۔ قومی نظمیں ان کے فکر و نظر نیز مسلمانوں کے فلاح و بہبود پر ان کی بے قراری کی غماز ہیں اور مولانا حالیؔ کے مسدس کی یاد دلاتی ہیں۔ ایک طویل نظم سے چند اشعار:

دل رو رہا ہے دیکھ کے خیر الامم کا حال   بے دست و پا غریب عجب بے بسی میں ہے
دم کوئی دم میں توڑنے والی ہے اب یہ قوم   ہچکی لگی ہوئی ہے ابھی جاں کنی میں ہے
کیا جانے روزِ حشر کب آنے کو ہے، مگر   ہاں ایک حشر کا تو سماں ہر گھڑی میں ہے
کیونکر مٹا دے امتِ خیر الوریٰ کا نام   ہاں ہاں میں جانتا ہوں یہی سب کے جی میں
پروردگار کر کوئی تائیدِ غیب سے   امت ترے نبیؐ کی بڑی بے بسی میں ہے

اب مولانا کی غزل کا رنگ و آہنگ بھی دیکھیے:

اگر آنکھوں سے خیالِ رخِ جاناں بندھ جائے   تو مرے تارِ نظر سے مہِ تاباں بندھ جائے
لاکھ گریے پہ مرے ہو وہ فسوں سازِ نظر   غیر ممکن کہ یہ پانی کسی عنواں بندھ جائے

سنوں تو کہہ نہ سکوں اور کہوں تو سن نہ سکوں   وہ ان کہی یہ مری دکھ بھری کہانی ہے

وہی کچھ جانتے ہیں رازِ غنچوں کے تبسم کا   چمن میں جو فریبِ گریۂ شبنم سمجھتے ہیں

آج میخانوں کا ہے جشن، ٹھہر جائے ابھی　　اور جانا ہی چمن سے ہے تو کل جائے بہار

ڈرتے رہو خدا سے تو پھر کوئی ڈر نہیں　　ہر خوف سے امان اسی ایک ڈر میں ہے
کسبِ ہنر جو تم سے تمنا نہ ہو سکے　　پیدا کرو وہ عیب جو داخل ہنر میں ہے

ہر اک بلا سے سوا کچھ بلائے جاں ہوگی　　وہ اک ادا جو تبسم کے درمیاں ہوگی

رنگ اُڑا، آنکھیں چڑھیں، پلکیں گریں، ہچکی بندھی
چپ لگی تو لاکھ عنوانِ بیاں بنتا گیا

- رباعی سے مولانا کی مشقِ سخن اور قادرالکلامی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

یہ بھیڑ یہ اژدحام اللہ اللہ　　یہ حشر کا اہتمام اللہ اللہ
بندوں سے یہ داروگیر کیسی یا رب　　مالک اور انتقام اللہ اللہ

کھوتا ہے سفر جو ہو رفاقت کے بغیر　　ملتی نہیں آبرو، لیاقت کے بغیر
لیکن مجھے رونے کی اجازت نہیں دیتی　　چلتی ہے امارت کہیں طاقت کے بغیر

گرتے گرتے تھک گئی برقِ نشیمن سوز بھی　　خاروخس اُڑتے گئے اور آشیاں بنتا گیا
اُن کی معجز آفریں نظریں اِدھر پڑتی رہیں　　دل مرا لوحِ طلسمِ کُن فکاں بنتا گیا

○ فارسی کلام:　　فارسی میں مولانا نے بہت کچھ لکھا ہے۔ قصائد اور طویل نظموں کا

دیوان موجود ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں جو ان کے رنگ اور مسلک کے ترجمان ہیں:

مصحف روایت ہیچ آرد ایمانے دگر — بعد قرآں ہر کہ تشنید است قرآنے دگر
آمد و رفت نفس ہیں انتظام نبض ہیں — فہم کن اے چارہ گر این است سامانے دگر
با قدش فتنہ ز ہر فتنہ و حشرے دیگرے — در رخش صد جلوہ و ہر جلوہ را شانے دگر
کرد قربانت تمنائے حزیں جانے کہ داشت — باز کردے نذر تو گر داشتے جانے دگر

عربی میں بھی مولانا نے بہت کچھ لکھا ہے۔ عربی صرف و نحو پر ان کی کتابیں عربی مدارس کے کورس میں پڑھائی جاتی ہیں۔

حضرت تمنا سے میری نیاز مندی ہندوستان میں میری طالبعلمی کے زمانے سے تھی۔ مشاعروں اور ادبی محفلوں میں جاتا تو ان سے ملاقات ہو جاتی۔ مولانا پاکستان دیر سے آئے اور ڈھاکہ آئے۔ میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۱۹۵۰ء میں ڈھاکہ آیا۔ ایک بار سر راہ ملاقات ہو گئی تو میں نے سلام عرض کرنے کے بعد ان سے کہا کہ میں پروفیسر مسلم عظیم آبادی کا داماد ہوں۔ یہاں یونیورسٹی میں لیکچرر ہوں۔ پھر تو گلے لگا لیا۔ انہوں نے کہا کہ عزیزم ملتے رہا کرو۔ ان کے جگری دوست جناب مسلم آبادی دیر سے پاکستان آئے اور کراچی آئے۔ مسلم صاحب ڈھاکہ آئے تو مولانا اکثر ان سے ملنے آتے اور دونوں میں حقہ کے کش پر خوب باتیں ہوتیں۔ عروض و بلاغت پر میری کتاب 'رہنمائے سخن' چھپ رہی تھی۔ انہوں نے کہا کہ عزیزم میری کتاب 'ایضاح سخن' چھپوا دو اور اپنے کاتب سے کتابت کراؤ۔ ان کی کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو گیا تو اس کے مقدمے میں لکھا کہ "میرے عزیز جلیل معز الدین صاحب پروفیسر ڈھاکہ یونیورسٹی سلمہ اللہ تعالیٰ اگر اس کی طباعت کا انتظام اور کاپی و پروف کی دیکھ بھال میں میری مدد نہ کرتے تو مجھ سے اس کی طباعت کی مہم کبھی سر نہیں ہو سکتی تھی۔۔۔۔ اللہ اللہ! ان بزرگوں کی وضع داریاں اب کہاں!

سقوط ڈھاکہ سے کچھ پہلے مولانا کراچی آ گئے۔ میں بھی انہیں دنوں کراچی آ گیا تھا۔ تلاش معاش میں سرگرداں، ان کا پیغام ملا تو میں ان سے ملنے چلا گیا۔ بیمار تھے۔ کہنے لگے کہ عزیزم

میں نے کچھ کتابیں تمہارے لئے رکھی تھیں تم دیر سے آئے جعفر پھلواروی لے گئے۔ ایک دیوان نکلا جو ان کے سرہانے ہی تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں شکریہ ادا کر کے چلا آیا۔ آتے وقت میں نے ان کی صحت کے لئے دعائیہ کلمات کہے۔ کہنے لگے کہ بس جانے کی تیاری ہے۔ میرا ایک شعر سن لو:

ہنگام رحیل آمد بیچارہ تمنارا پائے بہ زمیں وارد پائے بہ رکاب اندر

ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ

مولانا عبدالقادر گرامیؒ

حفیظ ہوشیار پوری میرے پی۔ایچ۔ڈی کے مقالے کا بنیادی موضوع تھے، مقالہ لکھتے ہوئے مجھے ان کے علاوہ کئی شخصیات نے متاثر کیا۔اس کام کے دوران احساس ہوا کہ کیسے کیسے یگانۂ روزگار لوگ موجود تھے۔علامہ اقبال کے رتبے اور شاعرانہ تفکر اور تدبر کا پورا جہان قائل ہے چنانچہ وہ ہستی جسے اقبال بھی اپنے مثنوی استاد کا درجہ دیتے ہیں ''گرامی'' کے علاوہ اور کون ہو سکتی ہے۔

گرامی نے میرے مقالے میں دو بھائیوں راحل ہوشیار پوری اور حفیظ ہوشیار پوری کے پیر و مرشد اور استاد کی حیثیت سے قدم رکھا پھر اقبال کے حوالے سے ان کی شخصیت کی کئی پرتیں کھلیں اور ہر پرت در حیرت وا کرتی چلی گئی۔راحل اور حفیظ کی شخصیت میں مولانا گرامی کا پرتو واضح طور سے دیکھا جا سکتا ہے۔حفیظ و راحل کی شخصیت و کردار میں گرامی کی سی قلندری، خواص میں نمایاں ہوتے ہوئے بھی نمایاں نہ رہنے کی عادت، شہرت و ستائش سے بے نیازی، اپنے کلام کی اشاعت سے عدم توجہی، بدرجۂ اتم موجود تھی۔نقوش جولائی ۱۹۷۳ء میں حفیظ کے حالات زندگی میں شیخ عبدالرشید راحل سے اکتساب فیض کا بطور خاص ذکر ہے۔''فن اور فنکار'' کے عنوان کے تحت افکار کے شمارہ نمبر ۱۵ جولائی ۱۹۶۳ء میں بھی حفیظ کی سوانح شائع ہوئی۔اس میں بھی عبدالرشید راحل کا ذکر حفیظ نے محبت کے ساتھ کیا۔شفیع عقیل نے ۱۹۵۲ء میں ''چٹان'' کے لئے حفیظ کا انٹرویو کیا۔حفیظ اس انٹرویو میں بھی کہتے ہیں کہ میرا ذوق سخن زیادہ تر برادر محترم عبدالرشید راحل کے فیضان کا مرہون منت رہا اور جناب راحل کا ذوق سخن کس کا مرہون احسان رہا؟ ملاحظہ ہو:

''......راحل کو فارسی شعر و ادب سے خاص شغف تھا اور آپ کا زیادہ وقت شیخ عبدالقادر گرامی، شاعر خاص نظام دکن کی صحبت میں گزرتا تھا۔حفیظ صاحب کو بھی مولانا گرامی کی خدمت میں حاضر ہونے اور ان کی صحبت سے مستفید ہونے کے

مواقع ملتے رہے۔"(۲)

مولانا گرامی حلقۂ ارباب علم و ذوق کے لئے خصوصاً اقبال کے شیدائیوں میں ایک بلند مرتبہ شخصیت کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ مولانا گرامی اصلاً پنجابی تھے لیکن پنجابی سے زیادہ فارسی شاعری کے حوالے سے شہرت رکھتے ہیں۔ شیخ غلام قادری گرامی ۱۸۵۴ء اور بعض تذکرہ نویسوں کے نزدیک ۱۸۵۶ء میں جالندھر میں شیخ سکندر بخش کے گھر ککے زئی خاندان میں پیدا ہوئے۔ والد نیل کی رنگائی کے پیشے سے وابستہ تھے۔ قرآن پاک ختم کیا تو انہیں ایک مکتب میں داخل کروا دیا گیا۔ فارسی زبان و ادب سے دلچسپی کی بناء پر ان کے استاد خلیفہ ابراہیم نے انہیں اس کم عمری میں ملک الشعراء کا خطاب دیا۔ چودہ سال کی عمر میں لاہور تشریف لائے اور اورینٹل کالج سے فارسی میں منشی عالم اور منشی فاضل کے امتحانات پاس کیے۔ وکالت کے امتحان میں بھی کامیابی حاصل کی۔ مولانا محمد حسین آزاد جیسے انشاء پرداز اور بزرگ شاعر سید حسن بلگرامی کے نام خط میں ان کی علمی قابلیت کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"گرامی کو میں خوب جانتا ہوں پنجاب یونیورسٹی میں پڑھتا رہا ہے۔ وہاں سے نکل کر بھی کئی سال مجھ سے ملتا رہا ہے۔ بارہ برس کا مسلسل مشاق ہے اور جس رنگ میں یہ لکھتا ہے اس میں آج اول درجے کا شاعر ہے۔ اس کی طبیعت خیال بند ہے۔ جلال، اسیر، قاسم مشہدی، اور ظہوری وغیرہ اسی طرز میں کہتے تھے۔"(۳)

انہوں نے وکالت کے بجائے معلمی کا پیشہ اختیار کیا لیکن گرامی جیسا صاحب علم استاد طالب علموں میں تو پسندیدہ ہو سکتا ہے، انتظامیہ کے لئے اسے "برداشت" کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ امرتسر، کپور تھلہ اور لدھیانہ کے سرکاری مدرسوں میں فارسی کے مدرس رہے۔ ایک مرتبہ انسپکٹر آف سکولز نے ان کی جماعت کے معائنے کے بعد یہ رائے دی کہ استاد تو اچھا ہے، طالب علموں میں شعری ذوق پیدا کر رہا ہے لیکن نصاب کی طرف توجہ کم ہے۔ درس و تدریس سے دل کھٹا ہوا تو کسی مہربان کے کہنے میں آ کر پولیس کی نوکری بھی کی لیکن حفیظ جالندھری، چراغ حسن حسرت، فیض اور ضمیر جعفری وغیرہ جیسے تخلیق کار فوج سے طبعی مناسبت نہ ہونے کے باعث، جلدی ہی کنارہ کش ہوئے۔ گرامی بھی پولیس

کے گھے میں نہ چل سکے، کشائش روزگار سے تنگ آکر ایک روز داتا دربار گئے کہ یہ مرجع خلائق ہے تو یقیناً یہاں ذہنی پراگندگی سکون سے آشنا ہوگی۔ رات گئے تک وہاں بیٹھے رہے۔ ایک طویل منقبت کہی جس کی تضمین حضرت خواجہ معین الدین چشتی کا معروف شعر تھا:

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا ناقصاں را پیر کامل کاملاں را رہنما

ایک رات خواب میں حضرت داتا گنج بخشؒ کی جانب سے منقبت کی قبولیت کی نوید دی گئی اور تاکید کی گئی کہ حیدرآباد دکن کی فضا تمہارے لئے سازگار ہے پھر قرائن وشواہد بھی دکن کی طرف ہجرت کرنے پر آمادہ کرتے تھے۔ گرامی، قدر بلگرامی کی جگہ نظام دکن محبوب خان کی ریاست سے وابستہ ہوئے اپنی خلاقانہ طبیعت اور قادرالکلامی کے سبب شاعر خاص کا منصب عطا ہوا اور چند سال بعد ہی ملک الشعراء کا خطاب پایا۔ اس طرح آٹھ سال کی عمر میں اپنے استاد خلیفہ ابراہیم کی جانب سے ملنے والے اس خطاب کی توثیق ہوگئی۔ تمام زندگی وہیں گزاری اور ہر شعری امتحان میں کامیاب ٹھہرے کہ اکثر فی البدیہہ قصیدہ کی فرمائش ہوتی اور آپ اس پر پورا اترتے۔ ایک مرتبہ تو نظام دکن نے دو سیر سونا آپ کی تخلیقی صلاحیتوں کے اعتراف میں آپ کی نذر کیا۔

آپ میر عثمان علی خاں کے دور میں بھی دکن دربار سے وابستہ رہے، لیکن وطن سے ناطہ نہ توڑا۔ گھر کی یاد ستاتی تو جالندھر آجاتے۔ ان کے آنے پر اہل جالندھر کی خوشی اور فخر دیدنی ہوتا۔ مشاعرے منعقد کیے جاتے۔ ان کی پرلطف محفل ہر خاص وعام کے لئے دلکشی کا باعث ہوتی۔ محبوب علی خان، نظام دکن کی محبت کھینچ کر پھر دکن لے جاتی اور اہل جالندھر روز رخصت سے ہی ان کی واپسی کا انتظار شروع کر دیتے۔ نظام دکن کے انتقال کے بعد وطن واپس آگئے۔ جالندھر کے قریب ہی ایک چھوٹا سا خوبصورت شہر ہوشیار پور ہے۔ گرامی کی اہلیہ اقبال بیگم کا تعلق ہوشیار پور سے تھا، گرامی کی محبت نے ان کی شعری صلاحیتوں کو جلا بخشی، شاعری میں ترک تخلص کرتی تھیں، بزم گرامی کے مشاعروں میں ان کی بھیجی گئی غزل بھی پڑھی جاتی اور داد پاتی۔ اہل ہوشیار پور کی محبت نے گرامی کو کبھی تنہا نہ چھوڑا۔ ہوشیار پور میں بھی ایک حویلی تعمیر کی۔ اکثر اس حویلی میں قیام رہتا۔

حفیظ جالندھری نے ان کی شخصیت کا جو خاکہ کھینچا ہے وہ خاکہ نگاری کے سبھی لوازم پورے کرتا ہے۔ خاکہ نگاری کے فنی لوازم میں شوخی و شگفتگی بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ شائستگی اولین شرط ہے واضح ہو کہ حفیظ جالندھری نے گرامی کی پہلی جھلک پانچ سات برس کی عمر میں دیکھی اور ایک کم عمر بچہ اس شخصیت سے کس طرح متاثر ہوتا ہے اسے پیش نظر رکھیے اور یہ خاکہ اس پہلی جھلک کے کوئی نصف صدی بعد لکھا گیا۔ خاکہ نگار کی یادداشت، جزئیات کی طرف عمیق نظری اور برجستگی و صاف گوئی نے خاکے کو جان عطا کر دی ہے۔

''ایک دن اپنے دو ہمجولیوں کے ساتھ میرا گزر ایک محفل سے ہوا، جس کے درمیان ایک بلند و بالا بھاری بھرکم، یکم شیم معزز صورت شکل کا آدمی ''منہ زبانی'' کوئی نظم پڑھ رہا تھا۔ نظم کی زبان بعد میں معلوم ہوا کہ فارسی تھی۔ میرے لیے اجنبی اور ناقابلِ فہم تھی۔ نظم پڑھنے والے کا چہرہ بارعب تھا۔ گھنی اور بیضوی داڑھی جس میں ہلکی اور نامعلوم سی مانگ نکلی ہوئی تھی۔ سر پر ہلکے پیازی رنگ کی ململ کا بھاری اور گھیردار پگڑ بندھا تھا، ایک سادہ شاید ہلکے لسواری رنگ کی شیروانی بدن پر تھی، نیچے چست چوڑی دار سفید پاجامہ اور پیروں میں سیاہ پیٹنٹ چمڑے کا پمپ۔'' (۴)

محمد عبداللہ قریشی بھی ان کی خوش لباسی کو سراہتے ہیں، نظام دکن کے دربار سے وابستہ ہوئے تو حیدر آبادی انداز کی شیروانی اور آڑا پاجامہ پہنتے، جو ان کے بھرے بھرے بدن پر خوب کھلتا۔ کبھی عنابی اور کبھی پیازی رنگ میں رنگی ململ کی دس گز لمبی دستار باندھتے، ان کی داڑھی پر رنگ حنا خوب بجتا۔

اقبال اور گرامی کی دوستی کوئی کل کا قصہ نہ تھی کوئی بیس پچیس سال پرانی، یہ وہ زمانہ ہے جب انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں علامہ اقبال کا طوطی بولتا تھا۔ ان کی نظمیں شکوہ، جواب شکوہ ہوں یا فاطمہ بنت عبداللہ لاکھوں کے اس مجمع میں بالکل ان پڑھ لوگ بھی شامل ہوتے اور اکابرین ادب بھی۔ آپ کی نظموں کی کاپیاں ہاتھوں ہاتھ بک جاتیں اور لوگوں کے دلوں میں، ان کی زبانوں پر انہی اشعار کا ورد ہوتا۔ یہیں سے مولانا گرامی اور اقبال کی دوستی کی ابتدا ہوئی۔ دوسرا

سبب، ۱۹۰۱ء میں جاری ہونے والا شیخ عبدالقادر کا جریدہ ''مخزن'' بھی تھا اس رسالے میں اس دور کے سبھی جید تخلیق کار شریک ہوتے۔ مولانا شاہ دین ہمایوں، غلام بھیک نیرنگ، منشی احمد دین ،حسرت موہانی اور نادر کاکوروی جیسے نابغۂ روزگار اور نادرہ کار شعرا جلوہ افروز تھے۔ پہلے شمارے میں ہی اقبال کی نظم ''ابر کہسار'' شائع ہوئی اور اس کے بعد اقبال اور مخزن لازم وملزوم ہو گئے اور لاہور سے باہر کے ادبی حلقوں میں اقبال کی شہرت اور پسندیدگی میں مزید اضافہ ہوا۔ گرامی سے اقبال کی دوستی کی ابتدا ہوئی تو اس وقت تک اقبال صرف اردو میں ہی شعر کہتے تھے۔ صرف ایک نظم ہی فارسی میں کہی تھی۔ اس دوستی کے کوئی آٹھ برس بعد اقبال کا فارسی شاعری کی طرف رجحان ہوا، اقبال خود آگاہ و خود شناس شاعر تھے، وہ جانتے تھے کہ ان کی شاعری روایتی شاعری نہیں ہے۔ اقبال جان چکے تھے کہ صرف اردو میں ہی کہہ کر وہ اپنا مدعا پورا نہ کر سکتے تھے، وہ آفاقی و کلاسیکی شاعر تھے۔ ان کی شاعری وہ جوئے آب تھی جس کے آگے بند نہیں باندھے جاسکتے۔ اقبال کے نزدیک جغرافیائی حدود کوئی معنی نہ رکھتی تھیں۔ ان کے خون میں یہ بات رچی بسی تھی کہ ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے' تو ایسے میں انھیں احساس ہوا کہ اردو میں کہا گیا شعر محدودیت کی بنا پر اپنا اثر کھو دے گا۔ جب انھیں یقین ہو گیا کہ اردو شاعری ان کے عالم گیر پیغام کے لئے سازگار نہیں، بیشتر اسلامی ممالک عربی زبان سے وابستگی رکھتے ہیں یا فارسی سے۔ پھر مغربی مستشرقین بھی فارسی سے آگاہ تھے۔ یوں اقبال کے فکر ونظر اور دل ودماغ میں پیدا ہونے والے احساسات اور خیالات کو، ان کے نظریات اور فلسفۂ حیات کو ایک بہترین اسلوب کی ضرورت تھی، اسلوب کسی بھی تخلیق کار کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ شاعر یا ادیب کے شعور وادراک کو اس کے افکار و نظریات اور جذبہ واحساس کو اس کے الفاظ کے انتخاب اور تراکیب کے وضع واستعمال، اس کے تشبیہات واستعارات وعلائم کی تراش، انفرادیت عطا کرتی ہے اور اس بنا پر دوسروں سے الگ اور ممتاز نظر آتا ہے۔ اقبال علم بیان کی اہمیت سے آگاہ تھے اور جانتے تھے کہ اگر پیش کش میں کجی رہ جائے تو کتنا اعلیٰ مضمون ہی کیوں نہ ہو، غارت ہو جاتا ہے۔

ان حالات میں بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی لفظ پر، کسی ترکیب کے استعمال پر ذہن اٹک

جاتا کہ فارسی اقبال کی مادری زبان نہیں، اکتسابی زبان تھی، انھیں کسی ایسے فارسی داں کی تلاش تھی جو
ان کی کہی ہوئی بات کے فنی پہلوؤں پر توجہ دے سکے۔ مشورے کے لئے اردگرد نگاہ دوڑائی تو ایسے
میں انہیں وہی ایک شخص دکھائی دیا..... جس کی مادری زبان فارسی نہیں بلکہ انہی کی طرح پنجابی تھی،
دونوں میں اگر کوئی قدر مشترک تھی تو یہ کہ دونوں نے فارسی اساتذہ کے کلام کا بغور مطالعہ کر رکھا تھا۔
سینکڑوں فارسی اشعار ازبر تھے، بلند ذوقِ شعر رکھتے اور حسنِ فن پر توجہ کو اہم جانتے تھے، ورنہ دونوں
کا کلام دو مختلف اتجاؤں سے متعارف کراتا ہے۔ گرامی کے موضوعات ان کی زندگی کے آخری دور
تک روایتی رہے جبکہ اقبال کے ہاں اگر حسن و عشق کا تذکرہ بھی ہے تو پیرایہ انداز دگر ہے۔ نئی دنیا کے
متلاشی اقبال کے سامنے اقلیم سخن کا بیکراں آسمان بھی تھا اور وسیع و عریض سمندر بھی۔ اقبال کی فکر
حدود و قیود سے ماورا تھی۔ جس کا اعتراف گرامی نے انجمن حمایتِ اسلام کے جلسوں میں اور دیگر
مقامات پر برملا کیا۔

در دیدۂ معنی نگہاں حضرت اقبال   پیغامبری کرد و پیمبر نتواں گفت

الہام بود ہمہ کلامِ اقبال   شہباز معانی ست بدامِ اقبال

سر بر خط اُو نہد گرامی کہ قضا   زد سکۂ خسروی بنامِ اقبال

گرامی کو اقبال سے اور اقبال کو گرامی سے خاص تعلق تھا اور اس تعلق خاطر کی وجوہ میں
ایک بڑی وجہ گرامی کا صاحب علم اور صاحب ذوق ہونا تھا۔ ناقدین اس بات پر متفق ہیں کہ گرامی کی
تخلیقات کو ایران کے کسی بھی بڑے شاعر کے مقابلے میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ ''گرامی از دوستان یک
رنگ اقبال بود، اقبال پیوستہ در بارۂ شعر فارسی خود با گرامی مشورت ہائی وی را می پذیرفت۔'' (۵)
اقبال اور گرامی میں ایک قدر مشترک عشق رسول ﷺ کا ہونا بھی تھا۔ اقبال کی شاعری کا
مرکزی نقطہ آپ ﷺ کی ذات اقدس ہے۔ اقبال کی نعتیہ شاعری میں حضور پاک ﷺ کی ذات
با صفات اور ایک ادنیٰ عاشق و غلام کی حیثیت سے عشق رسول کے کئی زاویے نظر آتے ہیں۔ آپ کہتے

ہیں "ایک کامل الہام وحی کی غلامی قبول کرنے کے بعد کسی اور الہام وحی کی غلامی حرام ہے۔ بڑا اچھا سودا ہے کہ ایک غلامی سے باقی سب غلامیوں سے نجات مل جائے۔"

اقبال کی ناتمام خواہشات میں سب سے بڑی آرزو مکہ و مدینہ کی ان گلیوں کی زیارت بھی تھی کہ جہاں آپ ﷺ کے قدموں کے نشان ثبت ہیں۔ علی بخش سے یہ روداد سنیے تو ایک آہ سی اس کے سینے سے نکلتی ہے کہ اقبال کس کس طرح اسے بھی اپنے ساتھ دیارِ حبیبؐ لے جانے کے پروگرام بناتے رہے۔ زندگی نے وفا نہ کی اور علی بخش تنہا ہو آیا، کس دل سے گیا ہوگا اور کس دل سے وہاں رہا ہوگا، یہ وہی جانتا ہے۔ گرامی بھی عشق رسول ﷺ کی آگ سینے میں دہکائے پھرتے ہیں۔ حجاز پاک جانے کے لیے ان کی روح کس کس طرح تڑپتی ہے لیکن خوش نصیبی کہ گرامی یہاں بازی لے گئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا، جس نے خواب میں میری زیارت کی گویا اس نے زندگی میں مجھے دیکھا۔

"......ایسا ہی ایک خواب کئی برس پہلے جالندھر کے آخری ممتاز فارسی گو شاعر غلام قادر گرامی نے دیکھا اور پھر اسے نظم کر کے اپنے ایک شاگرد کو وصیت کی کہ یہ اشعار میرے لوحِ مزار پر کندہ کروا دیے جائیں۔ شاگرد اپنے استاد کے انتقال کے وقت شہر سے باہر تھا چنانچہ گرامی اپنی زوجہ کے خواب میں آئے اور ان اشعار کو کندہ کرانے کی تلقین کی:

بگیرم دامن آن سید لولاک ﷺ در محشر | کہ محشر بر نتابد تابِ حسن بے حجابش را
شبی در خانہ زی آں امام انبیا ﷺ آمد | قضا گیرد عنانش را قدر گیرد رکابش را
قضا گیرد قدر گیرد ازل گیرد ابد گیرد | رکابش را عنانش را عنانش را رکابش را
سواد فلک شد ماہ فلک آمد عناں گیرش | رکابش بوسہ برپا زد، فلک بوسد رکابش را
گرامی در قیامت آں نگاہ مغفرت خواہد | کہ در آغوش گیرد جرم ہائے بے حسابش را" (۲)

یہی بات مکاتیب گرامی بنام اقبال میں بہ انداز دگر ملتی ہے، مولف کے نزدیک گرامی نے وفات سے چند روز پہلے ایک رباعی اور نعت کے چھ اشعار لکھ کر وصیت کی کہ انہیں لحد میں ان کے

ساتھ رکھ دیا جائے۔ موت کا سانحہ ہوش اڑا دیتا ہے۔ کسی کو اس وصیت کا خیال نہ رہا، تدفین کے بعد سبھی رنجیدہ ہوئے کہ مولانا کی وصیت پر عمل نہ کیا جا سکا۔ ایک ماہ بعد بیگم گرامی نے خواب میں دیکھا جس میں گرامی انہیں تسلی دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ میری بخشش کی فکر نہ کرو، سردار محمد سے کہو کہ یہ اشعار دہلی سے کندہ کرا کے لوحِ مزار پر لگا دے۔ سردار محمد دہلی سے ہوشیار پور آئے اور سرخ پتھر پر یہ اشعار اور رباعی کندہ کروا کر قبر کے سرہانے لگا دی۔ یوں گرامی کی وصیت پوری ہوئی، رباعی یہ تھی:

خاور دمد از شام ہائیں تیرہ شبی　　کوثر چکد از لبم ہائیں تشنہ لبی

اے دوست ادب کہ در حریم دلِ ماست　　شاہنشہ انبیاء رسول عربی ﷺ

مکاتیب غالب بنام گرامی ہی میں آگے چل کر مولف لکھتے ہیں:

''راحل مرحوم ہی کی کہی ہوئی مندرجہ ذیل تاریخ گرامی کے لوحِ مزار پر کندہ کی گئی: ''مزارِ حضرت گرامیؒ'' (۱۹۲۷ء)'' (۷)

گرامی اولاد سے محروم رہے۔ ان کی شادی اور پھر دوسری شادی کے بھی کیا کیا نہ قصے مشہور ہوئے، اس وقت ان کا محل نہیں۔ فارسی دیوان اور رباعیات کا مجموعہ ان کی معنوی اولاد ہیں۔ گرامی نے اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کہا، لیکن فطری بے نیازی نے کبھی اپنے کلام کو سنبھال کر یکجا رکھنے نہ دیا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے چاہنے والوں نے جن میں ان کی بیوی اقبال بیگم، حضرت میاں علی محمد سجادہ نشین بستی نو ہوشیار پور، ان کے شاگرد حفیظ جالندھری اور مولوی عزیز الدین عظامی نمایاں ہیں، دیوان فارسی اور رباعیات کے دو الگ الگ مجموعے شائع کیے جو اب نایاب ہیں۔ طویل نظم کے لیے شعرا مثنوی کی ہیئت پسند کرتے ہیں، مولانا نے بھی دو نا تمام مثنویاں یادگار چھوڑی ہیں، ایک مولانا جلال الدین رومیؒ اور دوسری مولانا غنیمت کنجاہی کی مثنوی ''نیرنگِ عشق'' کے جواب میں ''خراباتِ جنوں'' کے عنوان سے لکھی۔ مثنوی مولانا غنیمت نولکشور پریس کانپور سے جولائی ۱۸۸۰ء میں شائع ہوئی، اس مثنوی نے اپنے عہد کی شعر و سخن کی فضا میں ہلچل پیدا کر دی۔ اس کے تتبع میں کئی شعرا نے مثنویاں کہنے کی کوشش کی۔ لیکن اس پایہ تک نہ پہنچ سکے۔ گرامی کی زندگی اگر وفا

گرامی تو غزل و رباعیات کے علاوہ فارسی مثنوی گوئی میں بھی وہ اپنی مثال آپ ٹھہرتے۔

ان کی ساری عمر ہوشیار پور، جالندھر، حیدرآباد اور لاہور کے درمیان گزری ایران کا بھی سفر نہ کیا لیکن فارسی زبان و ادب کا مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ فارسی شاعری کے اسرار و رموز اور صنائع و بدائع سے آگاہی نے انہیں ایک بلند و ارفع مقام عطا کیا تھا۔ خوش ذوق و خوش فکر شاعر تھے، جدید فارسی شعر سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ قدیم کلاسیکی شاعری کے کامل الفن اساتذہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کا رنگِ شعر عہدِ اکبر کے اساتذہ کا تھا۔ جس شخص کی قوت حافظہ کا اعتراف تمام اکابرین نے کیا ہو، جس کی قادر الکلامی، شعری محاسن، الفاظ و محاورات کے برتنے کا شعور، تراکیب کی تشکیل کا مجتہدانہ انداز باعث تقلید ہو ایسی شخصیت سے ست الوجودی اور کاہلی کی توقع بظاہر عبث ہے لیکن گرامی کی ذات سے بہت سے ایسے واقعات منسوب ہیں جن میں ان کی آرام پسند طبیعت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اقبال انہیں بڑے اصرار سے بلاتے اور ان کی خواہش ہوتی کہ بابا گرامی ان کے ہاں زیادہ سے زیادہ قیام کریں، لیکن انہیں ہوشیار پور سے لانا ایک کٹھن مرحلہ ہوا کرتا اور جب بیگم گرامی انہیں واپس بلانا چاہتیں تو جانا مشکل ہو جاتا۔ اقبال کو انہیں روکنے کے طریقے بھی بہت آتے تھے، کبھی کسی رباعی کا کوئی مصرع کبھی کوئی ترکیب وضع کرنے کی کاوش کا بہانہ بنا لیا جاتا۔

یادداشت خدا کا بہترین عطیہ، جس سے گرامی نے بہت فائدہ اٹھایا، اگر اچھا شعر سنتے تو وہ ان کی لوحِ حافظہ پر ہمیشہ کے لیے رقم ہو جاتا۔ فارسی اساتذہ کا کلام گویا حفظ تھا۔ ''گرامی شاعر توانای فارسی بود در حافظہ وی ہزار ہا اشعار خوب فارسی محفوظ بود۔'' (۸) ''ان کی ایک اور بڑی خصوصیت یہ تھی کہ حافظہ نہایت قوی تھا، فارسی کے ہزاروں اشعار ان کو ازبر تھے، اپنا کلام بھی سارے کا سارا ازبر تھا... اعلیٰ درجے کا شاعر ہونے کے علاوہ اعلیٰ پائے کے قدر شعر بھی تھے، جب کوئی اچھا شعر سنایا جاتا تو ان کو یاد ہو جاتا اور پھر کئی کئی دن تک اسے پڑھتے رہتے۔'' (۹)

اسد ملتانی بھی گرامی کو ان کی بہترین یادداشت، قادر الکلامی اور شعر پڑھنے کے بے ساختہ انداز کے سبب کبھی فراموش نہ کر پائے۔ محمد اسد ملتانی اقبال کے معترف تھے، اقبال کی عظمت و محبت سے انکار تو کسی کو بھی نہیں لیکن اسد ملتانی نے اقبال کے انداز میں غزل کہنے کی شعوری کوشش کی ہے،

وہ ایک شعر میں کہتے ہیں:

شعر میں حضرت اقبال کا پیرو ہونا   ہے اگر جرم تو بے شک اسدؔ اقبالی ہے

کالج میں منعقدہ انعامی مقابلے میں ان کی نظم کو اول انعام ملا، جس کا فیصلہ حضرت اقبال نے کیا تھا۔ ایک روز اسد ملتانی جرأت کر کے ان سے ملنے ان کے انارکلی والے گھر چلے گئے، وہاں ایک اور بزرگ بھی تشریف فرما تھے، فارسی زبان دانی کا تذکرہ ہوا تو اقبال کہنے لگے کہ لوگ حیران ہوتے ہیں کہ اقبال کو فارسی کیسے آ گئی جبکہ سکول کالج میں اس نے یہ زبان پڑھی ہی نہیں، وہ نہیں جانتے کہ میں نے یہ زبان سیکھنے کے لیے کتنی محنت کی اور کن اساتذہ سے فیض حاصل کیا، اسد ملتانی مزید لکھتے ہیں:

> ''فارسی زبان کے سلسلے میں مولانا گرامی کا ذکر آ گیا ان کے غیر معمولی حافظے کی تعریف بیان کرتے ہوئے بتایا کہ کسی کو اشعار یا غزلیں یا نظمیں یاد ہوں مگر مولانا کو مثنویاں تک مسلسل یاد ہیں، وہ اس وقت اسی کمرے کے ایک گوشے میں دراز تھے، فرمایا: ''لیجیے! ابھی ان کے حافظہ کا کرشمہ دیکھیے۔'' یہ کہہ کر مولانا کو آواز دی۔ وہ اٹھ بیٹھے۔ کہا کہ مولانا: حضرت نظامی نے وہ کیا فرمایا ہے: 'ز گرد بیاباں گرد'۔ بس اس مصرع کا سننا تھا کہ مولانا گرامی دونوں ہاتھوں کی شہادت کی انگلیاں اٹھا کر جھومنے لگے اور کہنے لگے ''اللہ اللہ۔ اللہ، للہ'' اس کے بعد ایک دو بار اس مصرع کو دہرایا اور پھر مثنوی وہیں سے شروع کر دی۔ مزے لے لے کر شعر پر شعر پڑھتے گئے۔ میں نے مولانا گرامی کو پہلی اور آخری بار جبھی دیکھا۔ ان کا منڈا ہوا سر، اٹھی ہوئی انگلیاں، نیم وجد کا عالم، جھوم جھوم کر زوردار اور پُر جذب آواز کے ساتھ شعر پڑھنا، یہ تمام منظر اب تک میرے حافظے پر نقش ہے۔ یہ سلسلہ دیر تک جاری رہا اور شاید بہت دیر تک جاری رہتا لیکن آخر حضرت علامہ نے نہایت حسن اسلوب سے موضوع بدل کر گفتگو کا رخ کسی اور طرف پھیر دیا۔'' (۱۰)

حفیظ جالندھری بھی گرامی کے شعر پڑھتے ہوئے جذب و وجد کے گواہ ہیں۔ جو کیفیت شعر پڑھ کر ان پر طاری ہوتی تھی، ان سے شعر سن کر سامع بھی اسی کیفیت میں مسحور ہو کر رہ جاتے:

"یہ بزرگ قدرے جھک کر کھڑا تھا "منہ زبانی" کچھ پڑھ رہا تھا نہ جانے وہ کیا کہہ رہا تھا کہ جس کو سن سن کر محفل کا ہر فرد جن میں لمبی لمبی داڑھیوں والے بوڑھے اور داڑھی منڈے جوان بھی تھے، ذبح کی ہوئی بٹیروں کی طرح تڑپ تڑپ جاتے تھے۔ پہلے وہ ایک مصرعہ پڑھتا پھر اسی کو دہرا دیتا، ساتھ ہی دوسرا مصرع اپنی آواز پر مزید زور دے کر پڑھتا، اس طرح کہ ہر لفظ پر اس کی آواز تاکید اور اصرار کرتی ہوئی معلوم ہوتی، دوسرے مصرع کو ختم کرتے ہوئے وہ اپنے بھاری پگڑ بندھے ہوئے سر کو پے بہ پے اس طرح حرکت دیتا جیسے کسی کو تاکید کے کلمات کہہ رہا ہو، ساتھ ہی اپنے داہنے ہاتھ کی تین انگلیاں مٹھی کی طرح بند کر کے انگشتِ شہادت اور انگوٹھے کو ملا کر اور پھیلا کر فرش کی جانب جھکتا اور خلا میں اس انداز سے جنبش دیتا جیسے اپنی بات پر وثوق سے اصرار کر رہا ہو۔" (۱۱)

یہ تحریر اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ مذکور شخصیت کو اپنی ذات پر، اپنے علم پر، زبان دانی پر اور اپنے شعر پڑھنے کے انداز پر پورا اعتبار اور اعتماد ہے، وہ جانتا ہے کہ اس کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کیا معنی رکھتے ہیں، ان کا تاثر اور تاثیر سننے والوں کے دلوں سے فراموش نہیں کی جا سکتی۔ الفاظ کی شعبدہ گری کیا ہوتی ہے، الفاظ ان کے ہاتھوں میں آ کر کس طرح زندگی پاتے ہیں، گرامی اس امر سے بخوبی آگاہ تھے۔

محبت ایں چنیں عاشق نوازی ایں چنیں باید   زدی، کشتی، شکستی، سوختی، انداختی، رفتی

"..... وہ پرانے مضامین نئے اسلوب سے نظم کرتے ہیں، کبھی محاورہ سے بدل لیتے ہیں، کبھی الفاظ کے اصطلاحی اور لغوی تضاد سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور کبھی الفاظ کی شکلیں بدل کر معانی کے اختلاف سے جدت پیدا کرتے ہیں، ان کے بیان میں

سادگی اور روانی ہے۔ کلام پختہ ہموار اور مترنم ہے، سوز و گداز بھی ہے اور صنعت گری بھی''(۱۲)

مولانا گرامی فارسی تشبیہات، استعارات، علائم، تلمیحات، ضرب الامثال، محاورات اور روزمرہ سے اس قدر آگاہ تھے کہ انجان شخص کے لیے یقین کرنا مشکل تھا کہ یہ شخص ایرانی تہذیب و تمدن اور انداز معاشرت سے بظاہر کوئی علاقہ نہیں رکھتا۔ گرامی نے بہت سے اساتذہ کی زمینوں میں غزلیں کہیں اور کامیاب رہے۔ اس بات کا اعتراف اس عہد کے اکابرین نے بہت کھلے دل کے ساتھ کیا ہے۔ عابد علی عابد لکھتے ہیں:

''علامہ اقبال نے سالک مرحوم کے قول کے مطابق، انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں ان کا تعارف کراتے ہوئے کہا تھا کہ اگر عرفی و نظیری کے بعد فارسی زبان کا کوئی شاعر ہے تو گرامی ہے۔ آج گرامی کو سن لو، کل فخر کرو گے کہ تم نے گرامی کو سنا.....''(۱۳)

علامہ اقبال کی نظر میں گرامی کا کارنامہ یہ غزل تھی۔

شب ہائے وصل و گوشۂ چشم عنایتے ما ئیم و زلفِ یار و مسلسل حکایتے
عصیانِ ما و رحمتِ پروردگارِ ما آں را نہایتے ست نہ ایں را نہایتے
تا چند امتحان تغافل تبسمے دیرینہ بندہ ایست گرامی رعایتے

علامہ اقبال نے اس غزل کے بیت الغزل ''عصیانِ ما و رحمتِ پروردگارِ ما.....'' کو بہت مقامات پر احباب کو لکھے گئے خطوط میں بھی اور بالمشافہ بھی، سراہا ہے۔ خان نیاز الدین خان کے نام ۱۴ اکتوبر ۱۹۱۹ء ایک خط میں تحریر کرتے ہیں:

''سبحان اللہ..... گرامی کے اس شعر پر ایک لاکھ دفعہ ''اللہ اکبر'' پڑھنا چاہیے۔ خواجہ حافظ تو ایک طرف، مجھے یقین ہے فارسی لٹریچر میں اس پایہ کا شعر کم نکلے گا۔ انسان کی بے نہایتی کا ثبوت دیا ہے۔ مگر اس انداز سے کہ موحد کی روح فدا ہو جائے۔ اس

میں کچھ شک نہیں کہ ایک معنی میں انسان بھی بے نہایت ہے اور یہی صداقت مسئلۂ وحدت الوجود ہے۔ شاعر نے اس حقیقت کو اس خوبی سے نمایاں کیا ہے کہ پڑھنے والے پر اسلامی حقائق کا انکشاف ہو جاتا ہے، یہی کمال شاعری ہے جو الہام کے پہلو بہ پہلو ہے۔" (۱۴)

گرامی کی زندگی کا وہ عرصہ جو انہوں نے نظام دکن کے ہاں شاعر خاص کی مسند پر گزارا نہایت آسودگی اور شان و شوکت سے لبریز تھا۔ نواب داغ دہلوی بھی وہیں موجود تھے، دونوں اساتذۂ فن میں گاڑھی چھنتی تھی۔ داغ کی شہرت ایک لا متناہی خواہشات رکھنے والے نشاط پرست و عیش پسند، رنگیں بیاں شاعر کی تھی، میرے ذہن میں بھی داغ کا یہی تصور تھا لیکن میں نے جب داغ کی اکیس اشعار پر مشتمل وہ حمد یہ غزل جو انہوں نے چالیس سال کی عمر میں سفر حج کے دوران کہی تھی، پڑھی تو میرے خیالات میں بھی زلزلہ سا آ گیا۔ ہم کسی بھی شخصیت کا ایک ہی پہلو کیوں مدِ نظر رکھتے ہیں۔ داغ کی حمد کے چند اشعار دیکھیے:

سبق ایسا پڑھا دیا تو نے ۔۔۔ دل سے سب کچھ بھلا دیا تو نے
لاکھ دینے کا ایک دینا ہے ۔۔۔ دلِ بے مدعا دیا تو نے
بے طلب جو ملا، ملا مجھ کو ۔۔۔ بے غرض جو دیا، دیا تو نے
مجھ گنہگار کو جو بخش دیا ۔۔۔ تو جہنم کو کیا دیا تو نے

آخر الذکر شعر سن کر کیا وہی کیفیت طاری نہیں ہوتی جو اقبال پر گرامی کا مذکورہ شعر سن کر ہوئی تھی۔ مولانا گرامی قلندرانہ طبیعت کے مالک تھے، بے نیازی ان کی ذات کا حصہ تھی۔ شہرت و ستائش سے بے پروا تھے۔

"مولانا گرامی کی غزلوں کی شہرت ہوئی تو لوگوں کو معلوم ہوا کہ جالندھر میں ایک ایسا نغمہ سرا ہے جو عرفی و نظیری، کلیم و طالب اور بیدل و غالب کی یاد تازہ کرتا ہے تو ہر طرف سے فرمائش ہونے لگی کہ وہ جلسوں میں اپنا کلام سنائیں لیکن گرامی نہایت

مستغنی المزاج اور درویش صفت شاعر تھے، جی میں آیا تو چلے گئے نہیں تو جلسے والے آس لگائے بیٹھے رہے۔"(۱۵)

حفیظ جالندھری مولانا گرامی کی شخصیت کا تذکرہ اپنے مخصوص انداز میں کرتے ہیں:

"میں نے اپنی زندگی میں لاکھوں نہیں تو ہزاروں شاعر دیکھے اور سینکڑوں سے ملاقات ہوئی، لیکن شعر سے ایسا انہماک کسی دوسرے شاعر میں مجھے نظر نہیں آیا۔ فنا فی اللہ لوگ شاید بہت سے ہوں لیکن فنا فی الشعر جسے کہنا چاہیے، وہ میری دانست میں گرامی ہی تھے۔ خلوت ہو یا جلوت، اٹھتے بیٹھتے وہ کسی مصرعے کی دھن میں رہتے تھے۔ بظاہر اپنے ملاقاتیوں کی باتوں کا جواب دیے جا رہے ہیں لیکن گم ہیں کسی مصرعے کے جوڑ توڑ میں...... جب شعر ہو جاتا ان کی آنکھیں روشن ہو جاتیں اور وہ اس شعر کو اپنے نزدیک بیٹھنے والے کو سنانے سے باز نہ رہتے لیکن ایک عجیب بات تھی، جو میں نے اب تک صرف انہی میں دیکھی۔ وہ اپنا شعر سنا کر داد طلب نہ ہوتے۔ شعر سنانے کے ساتھ ہی پھر کسی لفظ یا مصرعے میں گم ہو جاتے...... وہ شاعری کے لیے پیدا ہوئے تھے، زندگی بھر اسی میں محو رہے۔ اپنی تعریف اور تعارف سے بے نیاز تھے۔"(۱۶)

اردو شاعری سے بھی لگاؤ تھا۔ شعر کے فنی و معنوی محاسن فوری طور پر نظر میں آ جاتے۔ اگر ان کے فارسی کلام کے متعلق دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اسے کسی بھی فارسی شاعر کے کلام کے مقابلہ میں رکھا جا سکتا ہے تو اردو کلام بھی عظمت و انفرادیت میں اپنی مثال آپ ہے۔ یہ الگ بات کہ انھوں نے زبانِ شیریں فارسی ہی کا انتخاب کیا اور وہ پاک و ہند میں فارسی غزل گوئی کے سلسلے کی آخری کڑیوں میں سے ایک تھے۔ طویل بحر میں کہی گئی ان کی اس اردو غزل میں موسیقیت، غنائیت، نغمگی نے موضوع کے تاثر اور تاثیر میں اضافہ کیا ہے۔ ملک محمد باقر تسیم نے "شعرائے پنجاب" کے صفحہ نمبر ۳۲ پر گرامی کے اردو شعر درج کیے ہیں جو انھوں نے اقبال کی درج ذیل مطلع والی غزل سے متاثر ہو کر فی البدیہہ کہے تھے۔

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

گرامی کے اشعار میں اپنی ذات سے الہیات تک کے اس سفر میں حیات و ممات تک کے تمام مراحل، ان کی مذہب سے وابستگی اور انسان کا مجبورِ محض ہونا بھی کیفیات موجود ہیں۔

نہ وہ دل رہا نہ وہ آرزو، یہ کشش ہے کیا ترے ناز میں
اسے کون کہتا ہے بت شکن، وہ جو دل ہے زلفِ ایاز میں
مری زندگی مری موت ہے، مری موت ہے مری زندگی
مرا جسم ظلمتِ ہند میں مری روح خاکِ حجاز میں

مولانا گرامی کے فیضِ صحبت نے راحلؔ و حفیظؔ کے ذوقِ سخن کی آبیاری کی، لیکن زندگی نے کب کسی کا ساتھ دیا ہے۔ مولانا گرامی کی وفات شعری کائنات اور اس کے باسیوں کے لیے ایک بہت بڑا دکھ لے کر آئی۔ حفیظؔ نے بھی تاریخِ وفات کے قطعات کہے اور راحلؔ نے بھی:

"..........اور بھی کئی شاعروں نے تاریخیں کہیں لیکن حفیظؔ ہوشیار پوری کے بڑے بھائی مولوی عبدالرشید راحلؔ مرحوم کے یہ قطعاتِ تاریخ میں بہت مشہور ہوئے:

گرامی کہ در آخر عمر زیست ❊ بہ خاکِ طربناکِ ہوشیار پور
ہمہ خاک شد منزلش بعد مرگ ❊ بجو سالش از "خاکِ ہوشیار پور"

۱۳۴۵ھ

رفت مولانا گرامی از جہاں ❊ گرمیِ بزمِ سخن باقی نماند
راحلِ مغموم سالش گفت ہائے ❊ "آں قدح بشکست وآں ساقی نماند" (۱۷)

۱۳۳۴ فصلی

مولانا غلام قادر گرامی کی علمیت و لیاقت کے قائل اقبال بھی تھے اور گرامی کی محبت کے گھائل دیگر بے شمار اہل ذوق کے علاوہ راحل و حفیظ بھی تھے۔

''حقیقت یہ ہے کہ راحل صاحب کی خصوصی توجہ سے ہی آپ کا فطری ذوقِ شعر و ادب پروان چڑھا۔ راحل صاحب کو ادبیات سے خاص شغف تھا اور آپ کا زیادہ وقت مولانا گرامی کی قرابت و معیت میں گزرتا تھا چنانچہ حفیظ صاحب کو بھی مولانا گرامی کی خدمت میں حاضر ہونے اور مستفید ہونے کے مواقع ملتے رہے۔ جب ۲۲ مئی ۱۹۲۷ء کو مولانا گرامی کا انتقال ہوا تو آپ نے صرف پندرہ برس کی عمر میں فی البدیہہ یہ شعر کہا:

صبا بہ حضرتِ اقبال ایں پیام دہ　　　برفت جانِ گرامی و تو ہنوز خموش

یہی نہیں بلکہ آپ نے گرامی کی یاد میں پہلا فارسی میں مرثیہ لکھا اور یہ یادگار تاریخیں بھی کہیں:

صد حیف کہ آں شاعر نامی ز جہاں رفت　　　آں غیرتِ سعدی و نظامی ز جہاں رفت
چوں شیخ گرامی ز جہاں رفت بگفتم　　　تاریخ ہمیں ''شیخ گرامی ز جہاں رفت''

۱۹۲۷ء

رہا شد از قفسِ آب و گِل گرامی ما　　　مبارک اہل طلب را نشیمنِ فردوس
چو او برفت بگوشِ حفیظ ہاتف گفت　　　کہ ''رفتہ روحِ گرامیِ بہ گلشنِ فردوس''

۱۹۲۷ء

بیتاب تھے فردوس میں سعدی و نظامی　　　آیا ملکِ الموت کی صورت میں پیامی
پہنچا وہ فردوس پہ جب شاعر یکتا　　　رضواں نے کہا ان سے کہ ''حاضر ہیں گرامی'' (۱۸)

۱۳۴۵ھ

حفیظ خود مولانا گرامی سے اپنے تعلقات اور مذکورہ بالا تاریخ ہائے وفات گرامی کے متعلق ایک انٹرویو میں کہتے ہیں:

''میرا ذوقِ سخن زیادہ تر اپنے برادرِ محترم عبدالرشید راحل کے فیضان کا مرہون منت رہا۔ تاریخ گوئی کا شوق بھی انہی سے ہوا۔ ان کے ساتھ میں اکثر گرامی صاحب کی صحبتوں میں شریک ہوتا۔ ان دنوں گرامی صاحب کی صدارتوں میں طرحی مشاعرے ہوتے۔ جن کی وجہ سے مشقِ سخن جاری رہتی ہے۔ ۱۹۲۷ء میں گرامی صاحب کا انتقال ہوا تو میری عمر پندرہ برس کی تھی۔ میں نے فارسی میں تاریخ کہی:

کہ ''رفتہ روحِ گرامی بہ گلشن فردوس'' (۱۹)

۱۹۲۷ء

خواجہ عبدالرشید ''تذکرہ شعرائے پنجاب'' میں گرامی کی وفات کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ رقم کرتے ہیں:

''بعد از وفات نظام دکن میر محبوب علی خاں، میر عثمان علی خاں بہ جانشینی اور سید واز گرامی خواہش کرد کہ ہوشیار پور را ترک گفتہ وارد حیدر آباد دکن شود۔ مہاراجا سرکشن پرشاد ہم نامہ ای بہمیں موضوع بہ گرامی فرستاد از و خواہش کرد کہ فرمائش نظام عثمان را قبول کند۔ ولے گرامی بعلت مرض ذیابیطس معذرت خواست و بالآخر در سال ۱۹۲۷ء عرصہ وجود را ترک گفت۔ بموقع وفات خود رباعی زیر ورد زبانش بود۔''

می میرم و دیدہ اشکباری دارد   دل خوں شدہ جاں نفس شماری دارد
ای چارہ شناس کارہا مرہم نیست   این صید بسینہ زخم کاری دارد

حفیظ ہوشیار پوری ہنگام وفاتش پانزدہ سال داشت و تاریخ وفاتش

چنیں سرود:

صبا بہ حضرت اقبال این پیام دہ   برفت جان گرامی و تو ہنوز خموش" (۲۰)

علامہ اقبال کے خطوط کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جناب محمد عبداللہ قریشی نے مکاتیب اقبال بنام گرامی کی ترتیب و تسوید کی ذمہ داری نبھائی۔ گرامی کی وفات پر اُس وقت کے تمام ادبی جرائد اور اخبارات نے ان کی عظمت کا اعتراف کیا، مخزن اس عہد کا سب سے اہم ادبی جریدہ تھا، گرامی کا مخزن نمبر اس محبت کا آئینہ دار ہے جو ان کے معاصرین کے دلوں میں ان کے لیے موجود تھی۔ علامہ اقبال گرامی کے سانحہ ارتحال پر غم زدہ و رنجور حالت میں ہوشیار پور گئے اور اس موقع پر کہا گیا قطعہ ان کے غم و اندوہ کا آئینہ دار ہے اور ساتھ ہی گرامی کی فکر رسا، فلسفیانہ خیالات و صنعت گری کو خراج تحسین بھی اور دوستی کا اعتراف بھی.........

آہ مولانا گرامی از جہاں بربست رخت   آنکہ زد فکر بلندش آسماں را پشت پای

معنی مستور او در لفظ رنگینش نگر   حسن حوری بی حجاب اندر بہشت دلکشای

از نوای جاں فزای او بجم برا زندگی   جام جمشید از شراب ناب او گیتی نمای

یاد ایامی کہ با او گفتگو ہا داشتم   ای خوشا حرفی کہ گوید آشنا با آشنای

بر مزارش پست تر کن پردہ ہائی ساز را   تا نگردد خواب او آشفتہ از شور نوای" (۲۱)

"برصغیر پاک و ہند میں فارسی کلاسیکی شاعری کا آخری ترجمان گرامی تھا۔ اس کے بعد تو چراغ ہی گل ہو گیا۔"

آخر میں گرامی کا ایک شعر:

کتاب عقل ورق در ورق فرو خواندیم   تمام حیلہ فروشی و مدعا طلبی است

حوالہ جات

۱۔ لاہور میں اردو شاعری کی روایت، ڈاکٹر گوہر نوشاہی، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۱ء ص ۱۴۸

۲۔ نقوش شمارہ ۱۱۸، جولائی ۱۹۷۳ء ص ۱۲۲

۳۔ معاصرین اقبال کی نظر میں، محمد عبداللہ قریشی۔ ص ۱۸۷

۴۔ ماہ نو، چالیس سالہ مخزن ۱۹۸۷ء

۵۔ اقبال لاہوری و دیگر شعرای فارسی۔ ڈاکٹر محمد ریاض اسلام آباد، مرکز تحقیقات فارسی، ایران و پاکستان ۱۹۷۷ء، ص ۱۳۲

۶۔ سہ ماہی الاقربا، اسلام آباد، جولائی ستمبر ۲۰۰۸ء، ص ۲۳۱

۷۔ مکاتیب اقبال بنام گرامی ترتیب، محمد عبداللہ قریشی، کراچی، اقبال اکادمی، ۱۹۶۹ء، ص ۴۹

۸۔ اقبال لاہوری و دیگر شعرای فارسی۔ ڈاکٹر محمد ریاض اسلام آباد، مرکز تحقیقات فارسی، ایران و پاکستان ۱۹۷۷ء، ص ۱۳۳

۹۔ معاصرین اقبال کی نظر میں، محمد عبداللہ قریشی، لاہور، قومی ترقی ادب ۱۹۷۷ء، ص ۱۹۱

۱۰۔ معاصرین اقبال کی نظر میں، محمد عبداللہ قریشی، لاہور قومی ترقی ادب ۱۹۷۷ء، ص ۳۸۳

۱۱۔ ماہ نو، چالیس سالہ مخزن ۱۹۸۷ء

۱۲۔ مکاتیب اقبال بنام گرامی ترتیب، محمد عبداللہ قریشی، کراچی، اقبال اکادمی، ۱۹۶۹ء، ص ۶۳

۱۳۔ نقوش، شخصیات نمبر سید عابد علی عابد، ص ۱۰۶۴

۱۴۔ ماہ نو، اقبال نمبر، مکتوب اقبال بنام نیاز احمد خان، ص ۳۸۶

۱۵۔ نقوش، شخصیات نمبر سید عابد علی عابد، ص ۱۰۶۴

۱۶۔ ماہ نو، چالیس سالہ مخزن ۱۹۸۷ء

۱۷۔ مکاتیب اقبال بنام گرامی ترتیب، محمد عبداللہ قریشی، کراچی، اقبال اکادمی، ۱۹۶۹ء، ص ۴۹

۱۸۔ افکار، صہبا لکھنوی، فن اور فنکار، حفیظ نمبر، مارچ ۱۹۷۳ء، ص ۹۴۔۹۵

۱۹۔ ہفت روزہ چٹان، حفیظ سے مکالمہ، شیخ عقیل، ۱۹۳۲ء

۲۰۔ تذکرہ شعرائے پنجاب خواجہ عبدالرشید، کراچی، اقبال اکادمی ۱۹۶۷ء، ص ۳۰۹

۲۱۔ اقبال لاہوری و دیگر شعرای فارسی۔ ڈاکٹر محمد ریاض اسلام آباد، مرکز تحقیقات فارسی، ایران و پاکستان، ۱۹۷۷ء، ص ۱۳۳

۲۲۔ نقوش، شخصیات نمبر سید عابد علی عابد، ص ۱۰۶۴

ثاقبہ رحیم الدین

بچوں کا ادب اور اہل قلم ۔۔۔ ایک تجزیاتی مطالعہ

یوں تو زندگی میں عورت کے کئی روپ ہیں اور سب اپنی جگہ اہم اور مقدس ہیں مگر اس بات میں صداقت ہے کہ اس کا بنیادی، اصول اور بے بدل روپ ماں ہے۔ ماں اور ادب میں بڑا قریبی اور گہرا تعلق ہے۔ یہ تو وہ اٹل سچائی ہے جو نہ صرف زندگی کی ضامن ہے بلکہ اس کو مسلسل رواں دواں رکھتی ہے۔ ان تینوں کی روح اور قدر مشترک کا نام محبت ہے۔ انسانوں سے محبت ہی وہ اصل محرک ہے جو ادب کی تخلیق کا باعث ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ادب چاہے بڑوں کا ہو یا بچوں کا، صحیح زندگی اور بیش بہا خوشیاں بخشتا ہے۔ بچوں کا ادب دراصل پیار کی دنیا ہے جہاں ہر لحہ خوشیوں اور رحمتوں کی برسات رہتی ہے۔

بلاشبہ ہمارے بچوں کی تعلیم اور نصاب میں وسعت آتی جا رہی ہے اور ماضی کی نسبت بچوں کی معلومات اور تفریح کا میدان بڑا ہو گیا ہے۔ ہر طرف تیز ہوائیں اور ہنگامہ ہے۔ مگر نیکیوں کے نقطۂ نظر سے ہماری زمین بنجر اور بدصورت ہے اور فضا زہریلی ہے۔ بچوں کے اردگرد آسائشوں اور نسبتاً پہلے سے زیادہ بہتر معیار زندگی کی روشنیاں ہیں مگر نور کہیں نہیں ہے۔ اور یہ نور معصوم بچوں کو صحیح تعلیم و تربیت دے کر اور جاندار و صحت مند ادب مہیا کر کے پھیلایا جا سکتا ہے۔

اس بات میں صداقت ہے کہ درخت اپنے پھل پھول سے پہچانا جاتا ہے۔ اگر پھل پھول، پتیوں اور ٹہنیوں کو مسلسل برباد کیا جاتا رہے تو جڑیں اور تنا کب تک محفوظ رہ سکتے ہیں۔ یہی صورت حال ہمارے بچوں کی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد سے دوسری نسل بڑھ کر جوان ہو چکی ہے مگر گمان یہ ہوتا ہے کہ ہم بڑے شاید ابھی ذہنی بچپن کے دور سے زیادہ دور نہیں نکلے۔

بچے کی اٹھان میں بہت سے عوامل شامل ہوتے ہیں جیسے گھر، خاندان، اسکول، نصاب، سوسائٹی اور ادارے وغیرہ، اس ضمن میں کھلونوں، عام کتابوں اور کھیل کا ذکر بھی بے حد ضروری

ہے۔ کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر اور غمِ روزگار کے ہاتھوں بچپن کی کوئی رمق باقی نہیں رہتی البتہ بچپن کے نقوش انسان کے اندر ہزار ادوار تک چھائے رہتے ہیں۔ میرے خیال میں صرف مکتبی تعلیم خواہ کتنی ہی اچھی اور معیاری کیوں نہ ہو، صحیح معنوں میں بچے کو ذہنی اُجالا نہیں بخش سکتی۔ صرف مقررہ نصاب سے بچے کی شخصیت کو نشوونما نہیں مل سکتی اور اس نہ کے تخیل اور سوچ کو بلند کیا جا سکتا ہے۔ جس طرح سے بچے کا جسم صحت مند غذا سے پلتا بڑھتا ہے، اسی طرح ذہنی نشوونما کو ذہنی غذا کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ بچے کو شروع ہی سے گھر کے بعد ذہنی غذا معاشرے کے تعلیمی نظام کے مجموعی اثرات سے، مذہب اور کلچر سے نیز فنون اور ادب سے ملتی ہے۔ گرچہ فنونِ لطیفہ کے سارے شعبے موثر ہیں مگر ادب اپنی سادہ و ہمہ گیر اور آن جانی تاثیر کی بنا پر نہ صرف بچوں کی بلکہ قوموں کی تقدیریں بدل دیا کرتا ہے۔ بچوں کے ادیب یا شاعر کا بچوں سے رشتہ محض گہرے انسانی بندھن کی وجہ سے ہے۔ حقیقت میں بچوں کا ادیب قومی مستقبل اور فلاحِ انسانیت کی خاطر لکھتا ہے۔ دراصل بچوں کیلئے لکھنا، پھول جیسے بچوں سے بے لوث پیار کے اظہار کا حسین روپ ہے۔ وطن عزیز کی آبادی پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں بچوں کی پیدائش غیر متناسب ہے۔ ہم نے شاید رب کی عطا کردہ راحت کو آفت میں تبدیل کر دیا ہے۔ خوشحال اور تعلیم یافتہ گھروں میں بچے بہت کم ہیں اور غریب علم سے محروم لوگوں کے گھرانے بڑے ہیں۔ یہ غلط تصور عام ہے کہ دینِ اسلام خاندانی منصوبہ بندی کے خلاف ہے۔ اس کے علاوہ کم عمری کی شادی، زیادہ تعداد میں شادیاں، ذرائع روزگار اور تفریح کا کم ہونا بھی بڑے خاندانوں کو فروغ دے رہا ہے۔ بڑھتی ہوئی شرحِ اموات کی وجہ سے بھی بعض لوگ نفسیاتی خوف کا شکار ہیں اور بڑی فیملی کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہر سال ذہنی اور جسمانی لحاظ سے معذور بچوں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اس کی وجوہات ناقص غذا، موروثی بیماریاں، ذہنی تناؤ، غم اور منشیات کا استعمال ہے۔ ہمارے ہاں پرائمری اسکول میں اوسط کے حساب سے اسی فیصد بچے دوسری اور تیسری جماعت میں تعلیم چھوڑ دیتے ہیں۔ لڑکیاں خاص طور پر اسکول اور معاشرے میں غیر مساوی سلوک سے گزرتی ہیں۔ ملک بھر میں خواتین کی خواندگی کی شرح بے حد کم ہے۔ قدرتی اصول کے لحاظ سے عورت کے ممتا کے جذبات سے کوئی منکر نہیں مگر جہالت اس میں شعور اور صحت مند ذہنیت پیدا نہیں ہونے دیتی۔ ماؤں

کی جہالت، بچوں کی دنیا میں تاریکی پھیلا رہی ہے۔ ایک عام جائزے کے مطابق بچے محنت مزدوری کر کے مسلسل اپنے بڑوں کی کفالت کر رہے ہیں۔ مثلاً جنرل اسٹور میں کام کرنا، بوٹ پالش کرنا، اخبار، پھل اور سبزیاں فروخت کرنا، کارخانوں، ملوں اور فیکٹریوں میں سخت اور طویل ڈیوٹی دینا، قلی کا کام کرنا، سڑکوں اور نالیوں کی صفائی کرنا، گھریلو نوکر بننا، بھیک مانگنا، چوری کرنا، جیب کاٹنا اور بدترین لعنت نشہ کرنا۔ ہمارے بچوں کا المیہ تو یہ ہے کہ ان کو ادب پڑھنا نصیب ہی نہیں ہوتا لہٰذا ادب ان کی شخصیت و کردار کو کیسے جلا بخشے۔ اگر اہل قلم بچوں کا ادب تخلیق کرتے رہیں اور بچوں کی رسائی کتابوں تک نہ ہو تو انسانی فلاح کا تصور دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔ بچوں کی یہ صورت دیکھ کر رو لینے سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ مولیٰ کریم ہمیں صرف ایک ہی بار زندگی بخشتا ہے۔ میرے خیال میں تو اچھا احساس عمل کا پہلا زینہ ہوتا ہے۔ زندگی مختصر ہے اور بچوں کو بے غرضی کے ساتھ اچھے انسان بنانے کا کام بہت کٹھن اور صبر آزما ہے۔ اس نیکی کے سفر پر چلنے میں جلدی اور بہت جلدی کرنا ضروری ہے۔

بچوں کے ادب کی تخلیق، اس کے پھیلاؤ اور اثرات پر نگاہ ڈالنے سے ایمان بڑھ جاتا ہے کہ اعلیٰ ادب ہمیشہ طویل عرصے بعد اور چھپے انداز سے قوم کا محافظ و رہنما ہوتا ہے۔ ادب کبھی وقت کے ساتھ ساتھ اور کبھی وقت سے آگے قدم اٹھا کر چلتا اور راہ دکھاتا ہے۔ وقت کے شانہ بشانہ اور زندہ جاوید رہنے والا ادب بچوں کا ادب ہے۔

کسی قوم کی تاریخ، تہذیب و تمدن اور تعمیر کی کہانی پڑھنا ہو تو اس کے بچوں کا ادب منہ بولتی تصویر ہوا کرتا ہے۔ ہمارے ہاں آج کل اور خصوصاً پچھلے سترہ، اٹھارہ سالوں میں بچوں کیلئے بہت زیادہ کتابیں لکھی گئی ہیں، جن میں معلوماتی، تفریحی، سائنسی، جاسوسی، دینی اور سفر کی کہانیاں شامل ہیں۔ بچوں کے ادب کی اصناف میں اضافہ ہوا ہے۔ بچوں کے رسالے اخبارات کے صفحات اور ڈائجسٹ وغیرہ شائع ہو رہے ہیں۔ مثلاً آج کل رسالے مقبول ہیں۔ نونہال، بچوں کا رسالہ، نوٹ بوٹ، آنکھ مچولی، دوست پھول، بچوں کی دنیا، انکل سرگم، ننھے چراغ اور روشنی وغیرہ اس کے علاوہ کوئٹہ سے شائع ہونے والا پہلا پاکستانی اخبار ''بچوں کا اخبار'' اور اسلام آباد کے رسالے

نئے چراغ، دوست اور مستقبل بچوں کی دلچسپی کا مرکز ہیں۔ بچوں کی اردو کتابوں کا گیٹ اپ اور معیاری اشاعت بھی پچھلے دس پندرہ سالوں میں کہیں بہتر ہوئے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ آج کا بچہ ہم بڑوں کے بچپن سے مختلف اور کہیں آگے ہے۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ منطقی مزاج رکھنے والا بچہ ہے۔ اس کی ذرائع ابلاغ کی دنیا، رسائل، اخبارات، وڈیو کیسٹ، وی سی آر، کمپیوٹر اور کیلکو لیٹرز سے بھری پڑی ہے۔ میرا ایمان ہے کہ باوجود اس جدید اور ترقی پسند زمانے کے اس وقت بھی بچہ اپنی ازلی خصوصیات یعنی معصومیت اور سادگی کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ اسے مریخ پر رہنے والے ہیرو کی کہانی پسند ہے مگر وہ گیلی ریت پر گھروندے بنا کر بھی خوش ہوتا ہے۔ وہ اولمپک گیمز اور روبوٹ کی تفصیل جاننے میں محو ہے۔ مگر اب بھی جھولا جھولنا اور ''چھپن چھپائی'' کھیلنا اس کا محبوب مشغلہ ہے۔ وہ ''ڈاک ڈاک کس کی ڈاک'' بڑے مزے لے کر کھیلتا ہے۔ اُسے اے سی ٹھنڈے کمرے میں بیٹھ کر ہوم ورک کرنے کی عادت ہے مگر وہ بارش میں دوڑیں ضرور لگاتا ہے۔ مشکل یہ آن پڑی ہے کہ بچوں کے ادیب یا شاعر کو جدید ہواؤں اور ہمیشہ سے بچھی پرانی مٹی کے درمیانی راستے سے گزرنا ہوگا۔ واقعی یہ سچ ہے کہ بچوں کیلئے لکھنا بچوں کا کھیل نہیں۔ میرے خیال میں یہ صحیح ہے اور ہنری اسٹیل کومیگر کے الفاظ میں'' بچے خود تعین کرتے ہیں کہ ان کا ادب کیا ہے۔'' آزاد قوموں کے بچے ایسا ہی کرتے ہیں۔ یاد رکھنے کی بات اتنی ہے کہ بچوں کے سامنے ادب پیش کرنے کا فریضہ پہلے ہم بڑوں کا ہے۔

صدیوں پہلے تقریباً تمام تر ادیبوں نے انگریزی میں بچوں کیلئے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ۱۴۸۴ء میں Aesop's Fables کے نام سے کہانیاں شائع ہوئیں۔ سولہویں صدی کے آخر تک بچوں کے انگریزی ادب پر عوامی کہانیاں اور پراسرار قصے مسلط رہے۔ سترہویں صدی میں بچوں کے ادب میں وسعت آئی۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں ادب کے ترجمہ کا دور شروع ہوتا ہے۔ الف لیلیٰ کی کہانیاں ساری دنیا میں مقبول ہوئیں۔ مشرق کی چند منتخب کہانیاں مثلاً الہ دین کا چراغ، علی بابا، سند باد جہازی اور ہارون رشید بچوں میں بے پناہ پسندیدہ تھیں۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں، سائنسی ترقی اور علم نفسیات نے ساری دنیا کے بچوں کے ادب کو بہت متاثر کیا۔ بچوں کے انگریزی اور اردو

ادب کا آغاز عوامی کہانیاں Folk Tales کے پس منظر میں ہوتا ہے۔ بچوں کے ادب کی تاریخ لقمان کی حکایات، پنچ تانترا کے قصے اور الف لیلیٰ کی کہانیوں سے شروع ہوتی ہے۔ اسی طرح دنیا بھر میں، اپنی اپنی زبانوں میں بچوں کے شعری ادب کا آغاز اوریوں جھولنوں اور جھوٹوں سے ہوتا رہا۔ غرض، ماضی میں برصغیر ہندوپاک میں ایک روشنیوں کا کارواں تھا جو بچوں کا ادب تخلیق کرتا رہا۔ میرے ذہن میں چند نام ابھرتے ہیں مثلاً محمد حسین آزاد، اسماعیل میرٹھی، علامہ اقبال، ٹیگور، کرشن چندر، مرزا ادیب، ابن انشاء، حالی، امتیاز علی تاج، صوفی تبسم، ڈاکٹر ذاکر حسین، غلام عباس، الیاس مجیبی، اشرف صبوحی اور حمیدی بیگم وغیرہ۔ قیام پاکستان کے بعد سے، سب پاکستانی اور خصوصاً اہل قلم ٹوٹ پھوٹ، ہلچل اور بے اطمینانی کے دور سے گزر رہے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ قیام پاکستان کے بعد انسانی قدروں میں بڑی تبدیلی آئی ہے۔ نہ صرف حساس اہل قلم بلکہ بچے کی فطری جبلت، حافظے اور کلچر میں بھی واضح فرق پڑا ہے۔ ماضی کی طرح اب بچے غیر قوم کی غلامی تلے اور ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کے سائے میں پروان نہیں چڑھ رہے ہیں۔ وہ ایک آزاد قوم کے زیادہ تیز اور شریر بچے بن گئے ہیں۔ افسوس ہے کہ بچے آدھی صدی گزر جانے کے بعد بھی مجبور اور تربیتی دور میں گھرے ہوئے ہیں۔ ہمارے ہاں بچوں کیلئے کئی اصناف میں لکھا گیا ہے۔ مثلاً ناول، داستان، لطیفے، خاکے اور شاعری، سب ہی اصناف بچوں کی ذہنی بالیدگی کی ضرورت ہیں۔ بچوں کے ادیبوں نے ڈرامہ نسبتاً کم لکھا ہے اکثر ڈرامہ بطور ایک خوبی اور عنصر کے، بہت سی اصناف میں برت لیا جاتا ہے۔ مگر ڈرامہ بطور ڈرامے کے کم ہی نظر آتا ہے۔ البتہ مرزا ادیب اور دور جدید میں ابصار عبدالعلی کی کوششیں قابل تعریف ہیں۔ اس کے علاوہ قیام پاکستان سے قبل بچوں کا ادب محدود ہوتے ہوئے بھی چند موثر، علامتی اور مقبول کردار جنم دے چکا ہے جیسے شیخ چلی، حاجی بغلول، خوجی، چچا چھکن اور ٹوٹ بٹوٹ۔ اب مستقل علامتی کردار وجود نہیں پا رہے ہیں۔ صرف جدید ٹوٹ بٹوٹ اور انکل سرگم ہیں جن پر مزید توجہ اور محنت کی ضرورت ہے۔

یہ خوش آئند بات ہے کہ آج کل بچوں کیلئے سائنسی کہانیاں لکھنے کا رجحان پیدا ہوا ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ اس تیز رفتار دنیا میں بچے خود کو مکمل طور سے مکینیکل نہیں بنا سکتے مگر وہ اپنے

ادیب سے یہ چاہتے ہیں کہ سائنسی پہلو کہانی میں سمو دیا جائے۔ کہانی کی دلکش اور تازہ فضا بوجھل نہ ہو۔ آج کل بچوں کے ادب میں یہ نام نمایاں ہیں، حسین سحر، اقبال ارشد، رئیس فروغ، نظر زیدی، اشتیاق احمد، شریف کمال عثمانی، بچے پاکستان چلڈرنز اکیڈمی کی کتاب ''میں پاکستانی ہوں'' کو بہت پسند کر رہے ہیں۔

بچوں کا ادب لکھنے والوں کو اب سوچنا پڑے گا کہ بچوں کو جدید سائنسی دنیا سے آگاہی دلوانے کیلئے مغرب کی طرف دیکھنا چاہیے۔ یہ رجوع کرنے کا عمل تیز ہونا چاہیے۔ ہم ابھی تک اپنے بچوں کو ایجادوں کی دنیا سے بے خبر رکھ رہے ہیں یا پرانی باتیں سنا رہے ہیں۔ قدرتی بات ہے کہ اس ضمن میں بچوں کے ادیبوں کے ترجمے اور زبانیں سیکھنے کی طرف توجہ دینا ہوگی۔ دور حاضر میں ترجمہ علم و ادب کے پھیلاؤ اور نتائج کیلئے بڑی قوت بن چکا ہے۔ بچے عالمی ادب کی نئی نئی گونج بھی اسی ترجمے کی قوت سے سن سکتے ہیں۔ میری نظر سے بچوں کے روسی، جاپانی، انگریزی، چینی، ترکی، یونانی، عربی اور فارسی ادبی شہ پاروں کے اردو ترجمے گزرے ہیں۔ پچھلے بیس پچیس سالوں میں پاکستان میں یہ قابل قدر کام ہوا ہے۔ مگر ہمارے ملک کے بچوں کی آبادی کو دیکھتے ہوئے، کتابیں اور خاص کر معیاری کتابیں کم شائع ہو رہی ہیں۔ حال میں ڈاکٹر اسد اریب نے اپنی کتاب ''الف سے ی تک'' میں بچوں کے ادب کی تاریخ کو احسن طریقے سے بیان کیا ہے۔

یہ واقعی افسوس کی بات ہے کہ ہمارے بچوں کا سائنسی ادب اکثر و بیشتر طبعزاد نہیں۔ مثلاً سائنسی رسالے کا پہلا باضابطہ سلسلہ قاہرہ سے چھپا تھا۔ یہ امریکہ کی سائنسی رائٹر مس سورس برتھا پارکر کی تصنیف تھی جس کا مولانا صلاح الدین احمد نے اردو ترجمہ کیا تھا۔ کچھ اہم ایجادوں کے ترجمے مولانا عبدالمجید سالک نے کئے اور مولانا غلام رسول مہر نے موٹروں، طیاروں، ریڈیو، ٹیلی ویژن، راکٹ اور خلائی سفر کے موضوعات پر انگریزی سے ترجمے کئے۔ ڈاکٹر نذیر احمد کا سمندری زندگی کا ترجمہ اور مسعود احمد برکاتی کی طبعزاد کتاب ''صحت کی الف ب ت'' بچوں نے پسند کی۔ علی ناصر زیدی کا ''ہمدرد انسائیکلوپیڈیا'' اور اے حمید کی ''سائنسی مہمات'' بچوں میں مقبول رہیں۔ عظیم قدوائی سائنسی جرنلسٹ کی حیثیت سے نمایاں ہوئے ہیں۔ ۱۹۸۵ء سے ماہنامہ ''سائنس میگزین''، ''عملی

سائنس'' اور'' سائنس ڈائجسٹ'' بڑے موثر انداز سے شائع ہو رہے ہیں۔ اس کے علاوہ لاہور سے رسالے تعلیم و تربیت، کھلونا، بچوں کی دنیا، کبوتر اور بچوں کا ڈائجسٹ بچوں کی ذہنی دنیا میں اچھا کردار ادا کر رہے ہیں۔

ہم جوں جوں اکیسویں صدی میں آگے بڑھ رہے ہیں یہ حقیقت واضح ہوتی جا رہی ہے کہ پاکستان اور دنیائے اسلام کی بقاء اور روشن مستقبل اس پر قائم ہے کہ وہ کس حد تک اپنے تعلیمی نظام اور معاشرتی مزاج میں سائنسی عملداری کو قبول کرتے ہیں۔ بچوں کی دنیا میں ادب کی خالص صورت کے ساتھ ساتھ معیاری اور طبعزاد سائنسی کہانیوں کی بھی ضرورت کو محسوس کیا جا رہا ہے۔ آفتاب حسن ''ماہنامہ سائنس'' کے ذریعے یہ جدوجہد کرتے نظر آتے ہیں۔

بچوں کی کہانیاں لکھنے والوں کو فلسفیانہ راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ پیاگٹ کا پیش کردہ یہ نظریہ قابل قبول ہے کہ علم وفن کی ترقی قابل فخر بات سہی مگر اس نے بچے کو زبردستی ذہنی پختگی کی طرف دھکیل دیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جدید ماحول نے اس کی طبعی عمر کی قدرتی اور تصوراتی دنیا کو درہم برہم کر دیا۔ ترقی یافتہ ممالک کے اہل قلم نے اس نقصان کے اثرات کو محسوس کر لیا ہے۔ اس لئے بچوں کے یورپین ادب میں بہت سے شعبے عمر موسم اور جغرافیائی کیفیت کے حوالے سے بنائے گئے ہیں۔ یعنی گود کے بچے سے لے کر نوعمری یعنی اٹھارہ انیس سال تک کے لئے الگ الگ شعبوں اور موضوعات کے تحت لکھا جا رہا ہے۔

ایک مکتب فکر کا خیال ہے کہ موڈرن بچوں کیلئے جادو اور پریوں کی کہانیاں مناسب نہیں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جاسوسی کہانیاں اخلاق تباہ کر رہی ہیں۔ یہ شکوہ بھی عام ہے کہ مزاح پڑھنے سے زبان خراب ہو رہی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان باتوں کی روک تھام کی خاطر موجودہ کتابوں کو رد کر کے ادب میں خلاء تو پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ اہل قلم یہ فرض ادا کر سکتے ہیں کہ زیادہ تعداد میں اعلیٰ ادب مختلف اصناف میں تخلیق کر کے، مناسب قیمتوں پر مارکیٹ میں بھر دیں۔ ادبی دنیا میں پرانے درختوں کو مشکل سے کاٹنے میں قوت نہ صرف کی جائے بلکہ نئے تناور اور پھلدار درخت اتنی تعداد میں اگائے جائیں کہ خاردار اور زہریلی ہوا پھیلانے والے درخت خود بخود سوکھ کر گر جائیں۔ بچوں کے سامنے کتابوں کا وسیع

میدان ہو۔ اسی طرح قومی سطح پر بچوں کے ادب کے بورڈ کا قیام ادیبوں میں نئی لگن پیدا کر سکتا ہے۔ موجودہ صورت حال میں وقت کے ساتھ ساتھ مخلص ادیبوں کی کوشش سے تبدیلی آسکتی ہے۔

اس سلسلے میں ایک ضروری نکتہ یہ ہے کہ بچوں کے ادب پر تنقید سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ یہی اس کے جاندار ہونے کی علامت ہے۔ بچے وقت کے مطابق خود ناقد بنتے جاتے ہیں۔ آج کے بچے نصاب کی خشک کتابوں کے بعد تخیل کی پرواز اور لطف کیلئے جادو اور پریوں کی کہانیاں شوق سے پڑھتے ہیں۔ بچے کبھی کبھی خود کو کہانی کا ہیرو تصور کرتے ہیں اور اپنے آپ میں بغیر سکھائے کوئی سوئی ہوئی اچھائی کو جگا لیتے ہیں۔ جاسوسی کہانیوں کی بنیاد حیرت و تجسس ہے۔ ان میں سے تخریب اور خون خرابے کے عناصر کم ہو جائیں اور بہت فنکاری کے ساتھ بدی کے خلاف مہم اور سفر جاری رکھا جائے تو اچھے نتائج برآمد ہونگے۔

بچوں کے ادب کے سلسلے میں، یہ پہلو قابل غور ہے کہ نہ صرف پاکستان بلکہ ساری دنیا میں طبقاتی فرق موجود ہے۔ بچوں کیلئے طبقاتی ادب قطعی طور پر نہیں لکھا جا سکتا کیونکہ وہ ادب کے دائرے سے خارج ہو جائے گا۔ اعلیٰ اور اچھے ادب کی یہ نمایاں خوبی ہوتی ہے کہ وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مادی اور طبقاتی خلیجوں کو پاٹنے کا عمل جاری رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ بچوں کے ادب میں سائنٹفک اصطلاحیں انگریزی میں ہی قائم رکھی جائیں تاکہ دنیا کے بچوں میں ابتدا ہی سے ذہنی فاصلہ پیدا نہ ہو۔ یہ اصطلاحیں خود بخود غیر شعوری طور پر جذب ہوتی چلی جاتی ہیں۔ غرض کہ بچوں کے ادب کو سادگی، تجسس، حرکت، روشن خیالی اور نیکی کی قدروں کا مجموعہ ہونا چاہیے۔

مگر ضروری ہے کہ یہ سب کچھ ڈھکے چھپے انداز سے ہو اور کہانی کہانی رہے۔ شاید کچھ لوگوں کا خیال ہو کہ سہل زبان اور سادہ خیالات بیان کرنا کچھ بھی تو وقت طلب نہیں۔ بچوں کے ادب کی تخلیق بڑا بے لوث، ریاض طلب اور لگن کا کام ہے۔ یہ ایسی عبادت ہے جو صرف رب کے پیار میں اور اس کی رضا کے لئے کی جاتی ہے۔ میں نے ہمیشہ بچوں کے ادب کو پیار کی دنیا کہا ہے اور میرے خیال میں پیار اور محبت کا محور عورت کی ذات ہے۔ ماں، بچہ اور ادب میں بہت گہرا اور اٹوٹ رشتہ ہے۔ یہ تینوں مل جائیں تو پیار کی دنیا ہمیشہ بسی رہتی ہے۔

مسلم شمیم

تخلیقِ ادب کا وجدانی عمل۔۔۔داخلی و خارجی محرکات کی روشنی میں

میں کیوں لکھتا ہوں، یہ سوال میں نے جب بھی دہرایا، ایک مختصر جواب میرے باطن نے ہمیشہ یہی دیا کہ ادب میرے لئے پناہ گاہ مہیا کرتا ہے۔ شب و روز کلفتوں سے اس کی آغوش میں مجھے وقتی طور پر ہی، نجات حاصل ہوتی ہے۔ زندگی جن مسائل و مشکلات میں گھری رہتی ہے، ان مسائل و مشکلات پر قابو پانا تو اکثر ممکن نہیں ہوتا ان سے کچھ دیر کے لئے فرار اختیار کرنا میرے بس میں ہوتا ہے۔ سو میں ادب کے شجر سایہ دار تلے بیٹھ کر خود کو تازہ دم کر لیتا ہوں اور اس طرح مجھے توانائی اور مسائل و مشکلات سے نبرد آزما ہونے کی نئی قوت کا احساس ہونے لگتا ہے گویا ادب سے میں زندگی کے لئے بالیدگی حاصل کرتا ہوں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ بہتوں کی طرح میں بھی حادثاتی طور پر ایک ایسے پیشے (وکالت) سے وابستہ ہوں جس کے تقاضے اور ترجیحات میری طبیعت اور فطری رجحانات و میلانات سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ اپنی پیشہ وارانہ مصروفیتوں کے دوران شاید ہی کبھی یہ احساس ہوتا ہو کہ معاشرے کو کچھ دے رہا ہوں۔ یہ معاشرہ جس کا میں سرتاپا مقروض ہوں۔ یہ معاشرہ جہاں میں نے آنکھ کھولی، فکر و شعور کی منزلیں طے کیں، میری شخصیت کی تعمیر و تشکیل ہوئی، اس معاشرے کو میں نے کیا کچھ دیا۔ یہ سوچ کر مجھے احساس کرب ستانے لگتا ہے۔ یہ احساس مجھے ادب کی مہربان آغوش میں پناہ لینے پر مجبور کرتا ہے اور میں اس پناہ گاہ میں اپنے اس احساس کرب کا مداوا ڈھونڈنے کی اپنی سی سعی کرتا ہوں، یعنی میری تحریریں اور نگارشات اس احساس کرب کے اظہار کا وسیلہ ہوتی ہیں۔

شاعر خوابوں کی سوداگری کرتا ہے۔ خواب بننا، خواب دیکھنا اور خواب بانٹنا منصب شاعری میں شامل ہے۔ خوابوں کا سوداگر کیسے خواب پیش کرتا ہے۔ ان خوابوں کی قدر و قیمت کیا ہے؟ یہ سوالات خوابوں کے سوداگر کے منصب و مقام کا تعین کرتے ہیں، خوابوں کی قدر و قیمت، خوابوں کی پیش کش سے بھی وابستہ ہے۔ میں بھی خوابوں کا سوداگر ہوں۔ میں نے بھی کچھ خواب بنے

ہیں، خواب دیکھے ہیں۔ خوب تر زندگی کا خواب، حسین تر زندگی کا خواب، روشن تر مستقبل کا خواب اپنے لئے، سب کے لئے جنہیں میں نے اپنی نگارشات کے ذریعے دوسروں تک پہنچانے کی سعی کی ہے، انہیں دوسروں کو دکھانے کی کوشش کی ہے اور یہ میری سعی پیہم رہی ہے۔ میں نے جس معاشرے میں شعور کی آنکھیں کھولیں، مجھے وہ معاشرہ بدصورت اور بیمار نظر آیا جس میں طرح طرح کی بیماریاں اور بدصورتیاں تھیں، جن میں افلاس، ناداری و نابرابری، جبر و جہل، عصبیتیں اور نفرتیں سرفہرست تھیں اور اچھے انسانوں کے مابین ذات پات کی فصیلیں اور طبقاتی تقسیم قدم قدم پر ابن آدم کی بے توقیری کا احساس دلاتی تھیں۔ اور مرے دل میں یہ آرزو بیدار ہوتی کہ شرفِ بشر کا بول بالا ہو، رنگ و نسل و زبان کی بنیاد پر امتیاز و تفریق کا خاتمہ ہو، نفرتوں، تنگ نظریوں اور تعصبات کی جگہ محبت، وسیع النظری اور رواداری عام ہو، دنیا سب کے لئے جنتِ ارضی بن جائے جہاں جنگِ زرگری کے بجائے امن و صلح جوئی، خوش حالی، ترقی اور آزادی کا دور دورہ ہو اور روسو (Rousseau) کا یہ فقرہ:

"Man is born free, but every where he is in chains" اپنا مفہوم کھو دے۔ مجھے اپنا یہ خواب زندگی کی طرح عزیز ہے، لہٰذا آخری لحۂ حیات تک میں یہ خواب بانٹتا رہوں گا۔ میری شاعری کا اس خواب سے قریبی تعلق ہے۔ ''شاعری جزویست از پیغمبری'' مجھے شاعری کا یہ منصب عظیم بے حد عزیز ہے آغازِ تمدن سے معرکۂ خیر و شر، حق و باطل، ظلمت و نور، ظلم و عدل، جھوٹ اور سچ ایک دوسرے کے مد مقابل ہیں۔ ایک دوسرے سے نبرد آزما ہیں۔ بارہا خیر کو شر پر شر کو خیر پر بالادستی حاصل ہوئی ہے۔ یہ معرکہ جاری و ساری ہے اور ہمیشہ جاری و ساری رہے گا۔ اس معرکہ آرائی میں ضمیرِ بشر کی ترجمانی شاعری کا منصب رہا ہے۔ ضمیرِ بشر ہمیشہ سے خیر، حق، سچ، روشنی اور مظلومیت کے ساتھ رہا ہے۔ شر، باطل، تاریکی اور جھوٹ کے خلاف روحِ عصر کا ہم نوا و ہم آواز رہا ہے۔ روحِ عصر سے بیگانگی برتنے والی نگارشات و تخلیقات کی عمرِ طبعی بے حد مختصر رہی ہے۔ روحِ عصر کی ترجمانی کا فریضہ انجام دینے والی شاعری ہی زندہ جاوید شاعری کہلاتی ہے۔ عالمی ادب کی بہترین نگارشات اس نقطۂ نگاہ کی تائید میں پیش کی جاسکتی ہیں۔ خود اپنی تاریخ ادب میں وہی نگارشات و تخلیقات زندگی و دوام کی حامل قرار دی گئی ہیں جن میں ایک طرف روحِ عصر کی فنکارانہ

ترجمانی کی گئی ہے تو دوسری طرف شاعر کا خونِ جگر شامل تحریر رہا ہے۔

تاریخ انسانی کے تین اہم ترین انقلابات نے میرے افکار و تخیلات پر ہمیشہ اپنی مضبوط گرفت رکھی: انقلابِ اسلام، انقلابِ فرانس ۱۷۸۹ء اور انقلابِ اکتوبر ۱۹۱۷ء انقلابات کی تاریخی عمر اور عرصۂ حیات جو بھی ہو ان کے آدرش اور نصب العین مہرِ نیم روز کی طرح ہمیشہ تابندہ و درخشندہ رہیں گے۔ کیونکہ ان انقلابات کی روح عظمتِ آدم کی امین ہے۔ ان انقلابات کے آدرش کی پرچھائیاں میری شاعری میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ان حوالوں سے بیسویں صدی کے ہمارے اکابرینِ ادب میں سرسید، علامہ اقبال، مولانا حسرت موہانی، سجاد ظہیر اور فیض احمد فیض سے میں بہت متاثر ہوں اور میں نے ان کی تخلیقات اور تحریروں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔ ان سے اپنے ذہن و ضمیر کو منور کیا ہے۔ اور انہیں مینارۂ نور جانتا ہے۔ تاریخ ادب اردو کی دو بڑی تحریکیں جو دراصل ایسے ہی ارتقائی سلسلے کی کڑیاں ہیں یعنی علی گڑھ تحریک اور ترقی پسند تحریک، یہ دونوں تحریکیں ادب میں روشن خیالی، خرد افروزی اور سائنسی فکر کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ان تحریکوں سے بلاواسطہ اور بالواسطہ متاثرہ تحریریں میرے نزدیک انسانی شعور کی پیش رفت کے سفر کی زادِ راہ ہیں اور جنہوں نے ہمارے ادب کی تمام اصناف کو ہمہ گیر اور ہمہ جہت ترقی اور وسعت عطا کی ہے۔ ان تحریکوں نے رجعت پسندی کی نفی کی ہے۔ رجعت پسندی کی نفی کے بغیر معاشرے کی ترقی کا خواب نہیں دیکھا جا سکتا کیونکہ رجعت پسندی قانونِ ارتقا سے متصادم نظریۂ زندگی ہے جبکہ ترقی پسندی قانونِ ارتقا جو دراصل قانونِ فطرت کا دوسرا نام ہے، ہم آہنگی اور مطابقت رکھنے والا نظریۂ حیات ہے۔ قانونِ ارتقا ہمہ وقت تبدیلی اور تغیر کے ذریعے پیش رفت کے سفر کی رہنمائی کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ترقی پسندیت جدید اصطلاح تو ہو سکتی ہے، مگر یہ نظریہ اور سوچ آغازِ تمدن سے سرگرمِ عمل ہیں اور معاشرے کو آگے کی سمت لے جانے والے افکار و نظریات کے علم بردار ہیں اور معاشرے کو آگے کی سمت لے جانے والے ہر دور اور عہدِ تاریخ میں یہ فکر و فلسفہ موجود رہے ہیں۔ ترقی پسندیت لہٰذا جاری و ساری فکر اور لہر ہے۔ چنانچہ معاشرے کے سفرِ ارتقا میں ترقی پسندیت ہی روحِ عصر کی ترجمان و علم بردار رہے گی، اس طرح ترقی پسندیت کے outdated ہونے یا اس

کے زوال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خرد افروزی اور ترقی پسندیت کی تحریکیں معرکۂ خیر و شر میں خیر کی پاس داری کی تحریکیں ہیں۔ یہ تحریکیں مجھے صراطِ مستقیم پر چلتے رہنے کا اخلاقی جواز اور توانائی فراہم کرتی ہیں اور طمانیت کا سامان بہم کرتی ہیں۔ شعر گوئی میرا ذاتی فعل ان معنوں میں ہے کہ جو میرے دل پر گزرتی ہے، رقم کرتا ہوں، لیکن یہ واردات جو میرے قلب و جگر سے ہو کر شعروں کا روپ دھارتی ہیں، وہ بھی اسی معاشرے کی دین ہیں یعنی معروضی حالات کی پیداوار ہیں۔ فکر و احساس آسمان سے نہیں اترتے بلکہ گرد و پیش میں جنم لیتے ہیں جن میں شاعر رہتا ہے۔ لہٰذا شاعری ایک سماجی عمل ہے اسے خالص تجریدیت اور داخلیت سے موسوم و منسوب کرنا ادب کے تقاضوں اور اس کی مبادیات کی نفی کرنا ہے۔ میں ان سے متفق نہیں ہوں جو یہ کہتے ہیں کہ میں اپنے لیے لکھتا ہوں لہٰذا میں جانوں، میں سمجھوں۔ نامانوس علامتوں کے ذریعے اظہارِ محض پر زور دینے والے یہ حضرات ابلاغ کو کوئی اہمیت نہیں دیتے متن کا پوسٹ مارٹم کر کے معنی و مفہوم نکالنے کی تلقین کرتے ہیں، تخلیق اور صاحبِ تخلیق کو ٹھیک دوسرے سے جدا کر کے متن کے مطالعے کی دعوت دیتے ہیں، اس طرح گویا ادب کو dehumanise کرنے کا سبق دیتے ہیں۔ میرے نزدیک اس رویے اور فکر سے ادب کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے، ادب کا قاری سے رشتہ کمزور تر ہوا ہے۔ صنفِ افسانہ کو گزشتہ ربع صدی میں جس میں صورتِ حال کا سامنا ہوا، اس سے میری رائے کی تصدیق ہوتی ہے۔ شاعری جیسا کہ میں نے عرض کیا، ایک سماجی عمل ہے، سماجی ذمے داری ہے۔ ہمارے شعور و فکر اور جذبہ و احساس کی تربیت اسی معاشرے میں ہوتی ہے۔ خود ہماری شخصیت کی تعمیر و تشکیل اور ممکنہ تکمیل اسی معاشرہ کی مرہونِ منت ہے۔ فرد مہد سے لحد تک معاشرے کا محتاج اور اس کا جزو لاینفک ہے، لہٰذا معاشرے سے بے گانگی کا رویہ صریحاً غلط روی ہے۔ میری تخلیق و تحریر میں میری ذات کا عمل دخل ضرور ہے مگر معاشرے سے بے بہرہ اور منحرف ہو کر نہیں بلکہ اس کل کے جزو کی حیثیت سے اپنے لیے لکھنے کی بات اس حد تک کہہ سکتا ہوں کہ کس تحریر کی تخلیق سے مجھے طمانیت اور تسکین و اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ میں اپنے مافی الضمیر کو اپنی تخلیق کے ذریعے دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہوں اگر میں اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوا ہوں تو تخلیق قابلِ اعتنا ٹھہرے گی ورنہ نہیں۔ میں

ادبی تخلیق وتحریر کو چیستان، معما یا پہیلی بنانے کو نادرست جانتا ہوں۔ قاری کو اپنی تخلیق میں اپنی فکر و بساط کے مطابق معنی تلاش کرنے کی دعوت دینا بڑی عجیب سی بات ہے۔ آپ عمل تخلیق میں جس کرب سے گزرتے ہیں، اس سے بڑے کرب سے آپ قاری کو گزرنے کی دعوت دیتے ہیں، یہ کہاں کا انصاف ہے؟ میں تو یہ جانتا ہوں کہ ''بات جو دل سے نکلتی ہے، اثر رکھتی ہے۔'' ابلاغ کا معیار تو یہ ہونا چاہیے:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

میں جو بھی لکھتا ہوں، یہ چاہتا ہوں کہ وہ قاری تک موثر انداز میں پہنچے۔ یہاں عرض کرتا چلوں کہ کوئی تحریر جو فن کے معیار جمال پر پوری نہیں اترتی، وہ سرے سے ادبی تحریر کہلانے کی مستحق نہیں۔ محض کلام موزوں شاعری نہیں ہے۔ جو شاعری محاسن فن سے عاری ہوگی خصوصیت کے ساتھ رمز وایمایت، جلال وجمال، حیرت وانبساط، قدرت واعجاز اور تہہ داری سے محروم ادبی تخلیق میرے نزدیک روح شعر سے محروم قرار پائے گی۔ میری نگارشات اور تخلیقات کا ایک اہم محرک میرا زندگی سے پیار ہے، والہانہ عشق ہے۔ یہ زندگی جو ایک تسلسل ہے، ایک سلسلۂ دوام ہے، میں اس سلسلے کی ایک کڑی بن کر تا دیر زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ بقول حافظ:

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

جریدۂ عالم پر ایک نقش دیرپا بننے کی خواہش مجھے تخلیقی زندگی میں زیادہ سرگرم عمل رکھنے کا سبب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے ہمیشہ مثبت اقدارِ حیات کو اپنی نگارشات میں جگہ دی ہے۔ اپنے دکھ کا اظہار کرتے وقت بھی یاسیت اور قنوطیت سے اپنے دامن اظہار کو بچایا ہے۔ میری شعوری کوشش رہی ہے کہ زندگی کو منفی رویوں اور رجحانات سے محفوظ رکھوں اور اثباتیت کو فروغ دوں۔ میں نے اپنی تحریروں کے ذریعے ذہنی پراگندگی اور انفعالیت کے بجائے فکر وشعور کو جلا بخشنے کی اپنی سی کوشش کی ہے، زندگی سے مایوسی اور بے زاری کے رویوں کی جگہ زندگی سے پیار اور زندگی پر بھرپور اعتماد پیدا کرنے

والے افکار کی ترغیب دینے کی روش اپنائی ہے۔ میری شاعری میں یہ رویے میرے طرزِ احساس اور حسیت کی اساس ہیں۔

زندگی آمیز اور زندگی آموز تحریروں اور نگارشات کے تخلیق کار اپنی تحریروں کے حوالے سے زندہ رہتے ہیں اور صدیوں کی زندگی پاتے ہیں۔ میرے خیال میں ہر تخلیق کار کی آرزو اور تمنا یہی ہوتی ہے کہ وہ ایسا ادب تخلیق کرے جو زندہ ادب ہونے کا وصف رکھتا ہوتا کہ جریدۂ عالم پر نقش دیرپا ہونے کی ضمانت ثابت ہو۔

سالنامہ 'الاقربا' برائے سال ۲۰۰۹ء

سہ ماہی 'الاقربا' کا آئندہ شمارہ سالنامہ ہوگا۔ معزز قلمی معاونین سے التماس ہے کہ اپنی غیر مطبوعہ نگارشات نظم و نثر جلد از جلد ارسال فرما کر ممنون فرمائیں۔ (ادارہ)

طاہر نقوی

کہانی اور افسانہ ـ ایک تعارفی جائزہ

''لفظ کہانی'' آہستہ آہستہ لفظ ''افسانہ'' کی جگہ لے رہا ہے یہ دونوں اب خلط ملط ہوتے جا رہے ہیں ـ پتہ نہیں یہ شعوری کوشش ہے یا سب کچھ نا سمجھی میں ہو رہا ہے تاہم ان دونوں کا فرق اب بے معنی ہوتا جا رہا ہے ـ

کہانی میں بیانیہ حاوی رہتا ہے ـ افسانے میں بھی بیانیہ ہوتا ہے مگر وہ صرف ضرورت کے تحت ہوتا ہے ـ ایک فقرہ بھی اضافی ہوگا تو وہ افسانے کو مجروح کر دے گا ـ افسانے میں تفصیل سے گریز اس کا حسن ہے ـ اشاروں میں بہت کچھ کہہ دیا جاتا ہے ـ اجنبی دنیا کہانی کو کہانی بناتی ہے یہی اجنبی دنیا افسانے کے لئے ناپسندیدہ ہے ـ افسانہ ایسے ماحول کو قبول نہیں کرتا ـ کہانی میں معاشرے اور فرد کے درمیان فاصلہ رہتا ہے ـ افسانے میں ایسا نہیں اور اگر ایسا ہو تو افسانہ ختم ہو کر رہ جاتا ہے ـ یہ اُس کی موت ہے ـ کہانی میں ماورائیت نہ ہو تو وہ بے رس رہتی ہے افسانے کی تخلیق میں افسانہ نگار کا تجربہ اور مشاہدہ دونوں معاون بنتے ہیں ـ جبکہ کہانی مناسب قوتِ بیان، پراسراریت اور کرداروں پر انحصار کرتی ہے ـ

افسانہ معاشرے سے جنم لیتا ہے ـ اور اسی کا عکس ہوتا ہے ـ اس میں فرد سے ابھر کر اجتماعی شعور کی پرتیں پیدا ہوتی ہیں ـ یوں افسانہ اجتماعی شعور کو گرفت میں لاتا ہے تاہم افسانے میں تجربہ انفرادی ہوتا ہے ـ اس کا اثر پھیل کر اجتماعی بن جاتا ہے ـ

افسانے کی حیثیت اپنے فوری ماحول کے ردعمل کا نتیجہ ہوتی ہے ـ اس میں چھوٹی سے چھوٹی بات بڑی بن جاتی ہے ـ غیر اہم بات اہمیت اختیار کر جاتی ہے ـ کہانی میں کرداروں کی اجنبیت ہی دلچسپی کا باعث بنتی ہے ـ جبکہ افسانے میں یہ نقص ہے ـ جانے پہچانے کردار افسانے کو مضبوط بناتے ہیں ـ ہمارے اردگرد کے کردار ہوتے ہیں ـ جن سے ہم آئے دن ملتے جلتے ہیں ـ وہ ہمارے معاشرے کا حصہ ہوتے ہیں ـ یہ کردار کہانی میں داخل ہو جائیں تو کہانی کا فسوں ختم ہو کر رہ جاتا ہے ـ کردار کسی مصیبت میں

پھنس جائے تو اس کہانی میں تجسس پیدا ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر افسانہ اپنے کردار کی اذیت پر تیج پڑتا ہے۔
کہانی میں اہم سے اہم واقعہ یا کردار ذرا سی دیر میں کہیں گم ہو جاتا ہے۔ افسانے کا کردار اور بنیادی خیال ذہن پر چپک کر رہ جاتا ہے۔ یہ دونوں دیر تک یاد رہتے ہیں۔ کیونکہ افسانے کے کردار میں قاری اپنی زندگی دیکھتا کہانی میں ایسا نہیں۔ راوی بننے کے بجائے افسانے کے کردار خود سامنے آتے ہیں۔ افسانے میں ایک قوت ہوتی ہے جو کردار کو اپنی راہ سے بھٹکنے نہیں دیتی اس میں تہہ داری ہوتی ہے۔ لفظ کی گرفت فطری اور مضبوط ہوتی ہے۔ افسانے میں شارپ اینڈنگ اور ٹوئسٹ ہوتی ہے۔ اس سے افسانے میں فنی خوبی اور تخلیقی فن نظر آتا ہے۔ افسانے کا موضوع اپنے دور کے کچھ سوالوں کے جواب کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ یہ صلاحیت افسانے ہی میں ہوتی ہے۔ کہانی اس سے معذور ہے۔

کہانی میں لفظ اپنی معنویت چھوڑ دیتا ہے۔ افسانے میں کبھی کردار خیال پر غالب آ جاتا ہے اور کبھی خیال کردار پر۔ اس کے برعکس کہانی میں پلاٹ ہمیشہ کردار پر غالب رہتا ہے۔ جیسے جیسے پلاٹ واقعاتی طور پر آگے بڑھتا ہے، تمام کردار اُسی طرح عمل کرتے نظر آتے ہیں اور پلاٹ کے جبر میں رہتے ہیں۔ کہانی میں کردار کا کام بڑھ سکتا ہے۔ غیر فطری طور پر اچانک غائب بھی ہو سکتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ کہانی میں ایک آدمی کا شعور کام کرتا ہے، دوسرے اس کے محتاج بن کر رہ جاتے ہیں۔ چنانچہ کہانی کے کردار اجتماعیت سے کٹے ہوئے ہوتے ہیں اور اپنی چھوٹی سی محدود واردات میں گم رہتے ہیں۔ تاہم افسانے میں اگر کبھی ایسا کردار موجود بھی ہو تو وہ اسی محدود فضا سے اُکتا کر اجتماعی سطح پر آ جاتا ہے۔ افسانے میں انسان سے انسان، انسان سے معاشرے اور انسان کا خود اپنے آپ سے رشتہ بحال رہتا ہے۔ کہانی میں یہ رشتے پُراسرار ہوتے ہیں۔ کہانی میں جملے اور پیراگراف دم تڑا کر بھاگ رہے ہوتے ہیں۔ افسانے میں ایک فقرہ بھی کم کیا جائے تو وہ اپنی جگہ خالی چھوڑ دیتا ہے۔ اور وہاں خلاء رہ جاتا ہے۔ کہانی گائے کی طرح ہوتی ہے جس کی کھال کہانی کے کرداروں اور مواد کو اکٹھا رکھتی ہے۔ چنانچہ میرا اصرار ہے کہ افسانے کو افسانہ ہی کہا جائے۔ کہانی وہی ہوتی ہے جسے سونے سے پہلے بچے دادی یا نانی سے سنتے تھے۔ اور سنتے سنتے سو جایا کرتے تھے۔ بقول کسی کے افسانہ بالغوں کو جگانے کے لئے لکھا جاتا ہے۔

شاکر کنڈان

سرگودھا کی وجہ تسمیہ

(بحوالہ "وطن کے خدوخال" مطبوعہ 'الاقربا' جولائی، ستمبر ۲۰۰۸)

سرگودھا دو الفاظ کا مرکب ہے یعنی سر + گودھا۔ اس نام کے بارے میں اگرچہ کوئی مستند حوالہ نہیں لیکن حال کے مورخین نے اسے سر بمعنی تالاب اور گودھا کو ایک شخص سائیں گودھا کے نام سے منسوب کرتے ہوئے سرگودھا بنا دیا ہے۔ اور اس روایت پر قائم ہیں کہ موجودہ سول ہسپتال کی جگہ ایک تالاب ہوا کرتا تھا جس کے کنارے ایک ہندو سادھو "گودھا" نامی اپنی جھونپڑی میں رہتا تھا۔ جب یہ شہر ۱۹۰۳ء میں آباد ہوا تو مسٹر ینگ کے نام پر اس کا نام ینگ آباد رکھا گیا جو لوگوں کی زبان پر نہ آسکا اور لوگوں نے اپنی آسانی کے لئے اسے گودھا کا سر کہنا شروع کر دیا جو بعد میں سرگودھا بن گیا۔ اس روایت کو مزید پختہ کرنے کے لئے کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ "ہم نے گودھا کی قبر بھی یہاں دیکھی تھی جو کچھ عرصہ قبل تک موجود تھی:

"سرگودھا کا نام سائیں گودھا کے نام پر پڑا۔ پنجابی میں سر تالاب کو کہا جاتا ہے۔ سائیں گودھا کی کسی زمانے میں موجودہ سول ہسپتال کے احاطے میں ایک تالاب کے کنارے جھونپڑی ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ گودھا کا سر بعد میں سرگودھا بن گیا۔ امرتسر کے لفظ میں بھی "سر" کا لفظ انہیں معنوں میں رائج ہے۔ یعنی شہر کا تالاب" (۱)

ملک جاوید گھمبیر ا (مرحوم) سرگودھا کی تحقیق کا ایک بڑا نام ہے اور سب سے پہلے انہیں نے اس موضوع کو چھیڑا اور سرگودھا کی ادبی تاریخ لکھنے کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے پنجابی میں ایم اے کیا اور وہ اپنے مقالہ میں اسی روایت کو لے کر آگے چلے۔ وہ لکھتے ہیں:

''فرنگی سرکار نے تکیا نہ نمبردارتوں ساری زمین آٹھ آنے فی بیگھہ دے حساب نال
مُل لئی تے ایس پنڈ داناں کالونی افسر دے ناں تے ہیک آباد رکھیا گیا۔ پر ایہہ ناں
مشہور نہ ہوسکیا۔ ایتھے ہک فقیر رہندا سی۔ جیہدا ناں گودھا سائیں سی تے موجودہ
ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہاسپٹل دی تھاں اُتے ہک وڈا سا چھپڑی تے اوتھے ای اوس دا
ڈیرا سی۔ ایہہ ہک ہندو فقیر سی تے ایس دی جھگی وچوں ہر ویلے دھواں نکلدا رہندا
سی۔ سائیں ہر ویلے اپنی عبادت وچ مصروف رہندا سی۔ راہ ویندے مسافر ایس
کولی آرام کردے سن تے تسے پیاسے ایتھے جھٹ پا کے اگانہہ چلدے
رہندے۔ ''سر'' ہندی دا لفظ اے تے پرانی پنجابی وچ وی ورتیا گیا اے۔ جس
دے معنی تالاب یا چھپڑ دے نیں۔ ایہہ ہک لفظ اے دوجا لفظ ''گودھا'' اے۔
جنہاں دے رلن نال ایس شہر دا ناں بن گیا۔ کیوں جے گودھا فقیر چھپڑ دے کنڈے
اسے رہندا سی تے ایہہ چھپڑ اُس دی ملکیت سی تے مشہور سر گودھا دا سر ہو گیا، پر بعد
وچ ایہو ای لفظ سرگودھا بن گیا۔'' (۲)

صاحبزادہ عبدالرسول صاحب "THE HISTORY OF SARGODHA" میں
رقم طراز ہیں:

"The name Sargodha consists of two words, namely `Sar` and `Godha`. Sar means pond or pool and Godha was the name of a Hindo `Jogi`. As the tradition goes, there was a natural water pond on the place where, at present, portion of the Divisional Headquarter's Hospital and Municipal office stand. Godha had constructed a small hut for himself on the back of this pond and used to reside there." (۳)

صاحبزادہ عبدالرسول صاحب چونکہ تاریخ کے استاد ہیں اور تاریخی حوالے سے اُن کی کئی کتب منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ جو مستند سمجھی جاتی ہیں۔ اس لیے آپ کی درج بالا تحریر کو بھی اعتبار کا وہی درجہ دینا چاہیے۔ بلکہ آپ نے جو کچھ تحریری طور پر اس کتاب میں ہمیں دیا ہے وہ ایک بہت بڑا علمی اضافہ ہے۔ لیکن ڈاکٹر انوار احمد بگوی نے آپ کی ''روایات'' کے حوالے کو بنیاد بنا کر اس پر تنقید کی ہے اور کئی وجوہات کی بنا پر بہت سے پہلوؤں پر اختلاف کیا ہے۔ وہ اپنے ایک مضمون ''دی ہسٹری آف سرگودھا......ایک تنقیدی مطالعہ'' میں اسی وجہ تسمیہ کے ضمن میں قدرے سخت رویہ اختیار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سرگودھا نام کے معانی اور اسے برقرار رکھنے کی وجوہ پر روشنی ڈالنا ضروری تھا۔ ''پروفیسر صاحب آگے چل کر بارہا بطور سند اور حوالہ لکھتے ہیں: `According to the tradition, another tradition etc, مگر انہوں نے کئی اہم موقع پر کوئی رائے طے کرتے ہوئے اس ٹریڈیشن کی وضاحت اور اس کے ثبوت کا ذکر نہیں کیا کہ راوی کون ہے؟ روایت کا ثبوت کیا ہے؟ راوی کے حوالے کیا ہیں؟ اس ذریعے پر انحصار دیکھ کر گمان ہوتا ہے جیسے پروفیسر صاحب ہمارے ذاکرین کی مقبول دلیل 'آواز آئی' کے پیروکار ہیں اور ٹریڈیشن کو آخر مانتے ہیں۔ Etymology تو فنِ الفاظ کے معانی و مطالب کا ہے۔ اگر سر اور گودھا سنسکرت کے لفظ ہیں تو مستند لغات سے ان کی کھوج لگانا چاہیے تھی۔ سرگودھا یا شاہپور میں کہیں بھی کوئی تالاب سر کے ساتھ نہیں پکارا جاتا۔ زندہ اشخاص کے نام پر کوئی تالاب اس ترکیب سے کہاں منسوب ہوتے ہیں؟'' (۵)

اس ''تنقیدی مطالعہ'' پر پروفیسر صاحبزادہ احمد ندیم نے ایک مضمون ''ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں'' (۶) میں اگرچہ تفصیلی جواب دینے کی کوشش کی لیکن اس میں کہیں کہیں ذاتیات کا شائبہ بھی دکھائی دیتا ہے۔ مزید یہ کہ جس تشنگی کا احساس تھا وہ برقرار رہا۔ دیگر باتیں تو اپنی جگہ ''وجہ تسمیہ'' کا حل نہ نکل سکا۔

یہ بات آخرکار وہیں Tradition پر ہی جا رکتی ہے اور اسی ٹریڈیشن کی بنا پر بہت عرصہ پہلے جبکہ سرگودھا کو آباد ہوئے ۶۳ سال کا عرصہ گزرا تھا۔ جناب انور گوہدی نے ایک نظم تحریر کی تھی۔ جس کا عنوان ''سرگودھا'' ہے۔ اس نظم کے ۲۳ مصرعے ہیں۔ لیکن روایت کے حوالے سے جو مصرعے ہیں وہ ملاحظہ ہوں:

''چند خودرو جھاڑیوں کے درمیاں

سبز گوں پانی کا سر

سائیں گودھے کا یہ گھر

پھولتا پھلتا ہوا سرگودھا اک جنت نشاں

گہوارۂ امن واماں'' (۷)

یہ روایت کہاں تک ٹھیک ہے اور کہاں تک اس میں غلطی کا امکان ہے۔ اس میں حتمی بات کرنے کے باوجود حتمی بات اس لئے نہیں کہی جاسکتی کہ تحقیق میں نئے پہلو سامنے آتے رہتے ہیں اور نئے در کھلتے رہتے ہیں۔ تحقیق تو دراصل ایک ایسا سلسلہ ہے کہ ایک تہہ ہٹائی جائے تو اس کے نیچے ایک اور تہہ نکل آتی ہے۔ پرتوں پر پرتیں اور ان کو ہٹاتے ہوئے عمر گزر جاتی ہے۔ اس روایت کے بارے میں جو میرے خیالات ہیں۔ شیخ محمد حیات کے خیالات بھی وہی ہیں۔ میں ایک عرصے تک اس نہج پر سوچتا رہا اور جب شیخ محمد حیات کی تحریر میری نظر سے گزری تو میری سوچ میں قدرے ٹھہراؤ کے ساتھ سمت کی تبدیلی کا احساس بھی ہوا۔ آپ وجہ تسمیہ کے ساتھ ساتھ تاریخ پر بھی تذکرہ سرگودھا کے ریونیو ریکارڈ ۹۲-۱۸۹۲ء کے حوالے سے بات کو آگے بڑھاتے ہیں۔ لیکن یہاں مجھے اُن کی تحریر پر یہ شک گزرتا ہے کہ یہ ریونیو ریکارڈ انہوں نے خود نہیں دیکھا بلکہ جاوید گھنجیرا کی تحریر سے فائدہ اٹھایا ہے......... بہرحال شیخ محمد حیات لکھتے ہیں:

''انگریزوں کے عہد میں جو یہاں چڑ آباد تھا اس کا نام جلالی آباد تھا۔ یہ نام انگریز دور کے نمبردار دیوان علی ٹنگیانہ کے والد جلال خان ٹنگیانہ نے نیا گاؤں بسا رکھا تھا۔ انگریزوں نے ۱۸۸۸ء میں اس جگہ اپنی رہائش کے لئے کالونی بسانے کا فیصلہ

کیا۔ اس کی آبادکاری ۱۰ اپریل ۱۸۸۸ء کو شروع ہوئی اور ۳۰ دسمبر ۱۸۹۳ء کو مکمل ہو کر کالونی افسر کے نام پر ینگ آباد نام پایا۔ لیکن یہ نام ہندو آبادکاروں نے قبول نہ کیا۔ کیونکہ نام انگریزی میں تھا۔ نیز افسر کے تبادلے کی وجہ سے آنے والوں نے بھی اسے رکھنے میں دلچسپی نہ لی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو آبادی جس کا اپنا نمبردار گنیش داش تھا۔ نے اس جگہ کو ایک غیر معروف نام سرگودھا کہنا شروع کر دیا۔ اور یہی نام مشہور ہو گیا۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ تقسیم ملک کے وقت سرگودھا اور اس کے گرد و نواح کی ۹۰ فیصد آبادی ہندوؤں اور سکھوں پر مشتمل تھی۔ جب لوگ اس نئے نام کی تشریح پوچھتے تو یہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت بتاتے کہ یہاں کبھی کوئی گودھا نامی ایک ہندو فقیر ہوتا تھا۔ جس کا ڈیرہ موجودہ ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہسپتال والی جگہ پر ہوتا تھا۔ یہاں ایک چھپڑ تھا۔ جسے ہندی زبان میں سر کہتے ہیں۔ گودھا فقیر کی وجہ سے اسے سرگودھا کہا جانے لگا۔ نام کی یہ وجہ اصولی طور پر غلط معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ جہاں جہاں شہروں کے نام ہندی طرز پر تالاب کی وجہ سے موسوم ہوئے تو وہاں سر کا بطور لاحقہ کے استعمال ہوتا ہے نہ کہ سابقہ کے۔ مثلاً امرت سر، ساکیا سر، نانک سر، بابو سر، رام سر۔ اسی طرح اسے بھی گودھا سر کہنا چاہیے تھا۔"(۸)

لسانیات کے ریسرچ سکالر خالد اقبال کی بات بھی قابلِ غور ہے۔ وہ گودھا کو ایک گھی یا دینے والا کے معانی میں لیتے ہیں۔ گودھا کو انہوں نے ان مطالب میں لیا ہے "گو" بمعنی گائے اور دھا بمعنی دینے والا"(۹)

ممکن ہے ایسا بھی کسی صورت میں مفہوم نکالا جا سکتا ہو۔ لیکن دھا ہندی زبان میں الحاق کے ساتھ تو لفظ بناتا ہوا ملتا ہے۔ یہ خود کسی معنی میں تشکیل دیا گیا ہو میرے علم میں نہیں آیا۔ البتہ دھاتا پالنے والے کو کہتے ہیں۔ لیکن جو کردار گودھا کا رہا ہے وہ ان معنوں سے ۱۸۰ ڈگری مختلف ہے۔

اوپر جتنے بھی حوالے دیے گئے ہیں وہ سب ایک ہی روایت کا تسلسل تھے۔ میں ذاتی طور

پر اس سے قدرے مختلف نتیجے پر پہنچا ہوں۔ لیکن یہ بھی ایک روایت ہے اور اسے حتمی نہیں کہا جا سکتا ہے۔ نیز ''کہتے ہیں''، ''سنا ہے'' یا ''معلوم ہوا'' وغیرہ الفاظ کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچا سکتے۔ منزل پر پہنچنے کے لیے مستقل راستے کا تعین ضروری ہوتا ہے۔ کبھی ہو سکتا ہے کہ بھٹک کر بھی یا نامعقول راستے پر چلتے ہوئے بھی منزل سامنے آ جائے۔ لیکن یہ محض اتفاق ہی ہوتا ہے۔

سرگودھا سے جھنگ کو جاتے ہوئے چند ہی میل بعد چک نمبر ۹۲ آتا ہے جسے ۹۲ موڑ بھی کہتے ہیں۔ اس کے نزدیک ایک گاؤں ''گودھا'' یا ''گودھے والا'' آج بھی موجود ہے۔ اس گاؤں کا نام گودھا کے نام پر ہی رکھا گیا تھا۔ گودھا کا لفظ ہندی لغت میں میرے مطالعے میں نہیں آیا۔ البتہ اس سے ملتے جلتے کچھ الفاظ ایسے ہیں جو ممکن ہے اصل سمت لے جانے میں مدد ثابت ہوں۔ ایک لفظ ''یودھا'' یا ''جودھا'' استعمال ہوتا ہے۔ جس کے معنی دلیر اور بہادر کے ہیں۔ لفظ گئو دھن کے معنی گائے کے ہیں۔ ایک لفظ گودھورا ہے جس کے معنی ہیں گایوں کا اپنے مقام پر شام کو واپس آنے کا وقت (۱۰)۔ ممکن ہے یہ جگہ کوئی ایسی ہو جہاں شام کو گائیں جنگل میں چرنے کے بعد واپس آ جاتی ہوں اور اس نسبت سے اس جگہ کا نام گودھورا سے بدل کر گودھا رہ گیا ہو۔

یہ تو معنوی لحاظ سے بات تھی۔ جو روایت میں بیان کرنا چاہ رہا ہوں وہ یہ کہ: گودھا ایک قوم تھی اور یہ گاؤں اسی قوم کی نسبت سے معنون تھا۔ جو شخص ہمارے شہر سرگودھا کا سرنامہ بنا یہ اسی قوم سے تعلق رکھتا تھا اور اس کا نام لالو تھا۔ یوں اسے لالو گودھا کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ لالو ایک بدمعاش، رسہ گیر اور دادا گیر قسم کا شخص تھا۔ موجودہ سول ہسپتال کی جگہ پر ایک تالاب تھا۔ جہاں سے لوگ اپنے مویشیوں کو پانی پلاتے تھے۔ اور لالو اپنی بدمعاشی کے باعث جانوروں کو پانی پلوانے کے عوض بھتہ یا جگا ٹیکس وصول کیا کرتا تھا۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ اس مقام پر موجود بھی ہو۔ بس ایک جھونپڑی سی کانے اور سروٹ کی بنا رکھی تھی۔ جس میں آ کر وہ کبھی کبھی بیٹھ جایا کرتا۔ وگرنہ جب اسے پتہ چلتا کہ کوئی شخص اپنے جانوروں کو پانی پلا رہا ہے تو پہنچ جاتا اور بھتہ وصول کر لیتا۔ یہ پورا علاقہ غیر آباد جنگل تھا۔ جہاں درخت کم اور جھاڑیاں زیادہ تھیں اور دور دور آباد گاؤں سے لوگ اپنے جانور لے کر چرانے کے لئے یہاں آیا کرتے تھے۔ اس امکان کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنی دلیری اور

جرأت کی بنا پر جودھا یا یودھا کہلاتا ہو جو معمولی ردو بدل کے بعد گودھا بن گیا ہو۔ اس کی داداگیری کی تصدیق ارشد ملک کے اس حوالے سے بھی ہوتی ہے:

''۱۹۰۰ء کے لگ بھگ کی بات ہے۔ میرے بابا ملک عطا ساہیوال سے مویشی چرانے کے لئے کڑانہ کے پاس اس جنگل میں لائے۔ واپسی پر انہوں نے تالاب سے مویشیوں کو پانی پلایا۔ لالو نے ان سے پیسے مانگے تو انہوں نے پیسے دینے سے انکار کر دیا۔ جب وہ مویشی لے کر تھوڑی دور گئے اور گنتی کی تو ایک بچھڑا موجود نہ پا کر واپس لوٹ آئے۔ بابا عطا ہر وقت ایک بھاری سا عصا اپنے پاس رکھا کرتے تھے۔ دیکھا تو لالو نے بچھڑا وہاں باندھ رکھا ہے۔ بابا نے جب اس سے مانگا تو اس نے انکار کر دیا کہ پہلے پانی کے پیسے دو پھر لے جانا۔ بابا عطا کو غصہ آ گیا اور اسے اتنا پیٹا کہ لالو کو چھٹی کا دودھ یاد آ گیا۔'' (۱۱)

یہ تھا اس لالو گودھا کا کردار جسے ہندو آبادی کے خود ساختہ ''ٹائٹل'' پر کوئی سادھو لکھتا ہے، کوئی فقیر، کوئی سائیں۔ جس کے مذہب کے بارے میں بھی شک تھا۔ البتہ وہ کڑانہ بار کی گدی کا چیلا تھا جو اواگون کے قائل تھے۔ کڑانہ بار کی اس گدی کا ذکر مفتی غلام سرور لاہوری اپنی کتاب مخزن پنجاب (۱۲) (محررہ ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء) میں ''علاقہ کلیان'' کے تحت کرتے ہیں۔ جس میں میلے اور گدی نشین کی دولت وغیرہ کا بھی ذکر ہے۔ لیکن لالو کو چونکہ ہندو سادھو گردانا جاتا ہے اس لئے جو لوگ کہتے ہیں کہ اس کی قبر کچھ عرصہ پہلے تک موجود تھی۔ وہ اس کے بارے میں کیا مزید کچھ جانتے ہیں؟ یعنی .... کیا یہ ان کے علم میں ہے کہ اگر وہ ہندو تھا تو کس فرقے سے تعلق رکھتا تھا؟ کیا اس کے فرقے میں مردہ کو یا اس کی راکھ کو دفنانے کی رسم تھی؟ کیا ارتھی کو جلا کر پوتر کر دینے کے لئے دریا میں بہانے کی رسم تھی؟ یا شمشان سے راکھ کو لا کر برکت کیلئے گھر میں رکھنے کی رسم تھی..... پھر یہ بھی قابلِ غور پہلو ہے کہ وہ قبر جس پر غلاف وغیرہ چڑھائے جاتے تھے کیا واقعی گودھا کی تھی یا کسی اور کی؟

ایک اور عقدہ جو ہمارے پاس لاینحل رہ جاتا ہے وہ ہے ''سر'' کا۔ سر عموماً اس صورت میں بطور سابقہ استعمال ہوتا ہے۔ جو خطاب کے طور پر دیا گیا ہو اور یہاں ایسی کوئی بات نہیں جس سے

ثابت ہو کہ کسی گودھا نامی شخص کو Sir کا خطاب دیا گیا ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو ریکارڈ میں بھی موجود ہوتا اور چاردانگ عالم میں بھی چرچا ہوتا۔ اگر یہ سر تالاب کے معنی میں ہے تو پھر لاحقہ استعمال ہوتا۔ ہاں اگر کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ لفظ ''سار'' ہو جو مختصراً سر رہ گیا ہو۔ سار بھی ہندی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے اگرچہ کئی معانی ہیں لیکن ایک معنی اس کا قیمت، مول اور دولت بھی ہے (۱۳)۔ چونکہ لالو گودھا اس تالاب سے مویشیوں کو پانی پلانے کی قیمت وصول کرتا تھا اس لئے اسے سار گودھا کہا گیا ہو جو سرگودھا رہ گیا ہو۔

جس دور کی ہم بات کر رہے ہیں۔ اس وقت فارسی زبان بھی بولی جاتی تھی۔ عربی سمجھنے والے لوگ بھی موجود تھے۔ انگریزی تو اس علاقے میں تقریباً نئی نئی آئی تھی لیکن انگریز کچھ کچھ یہاں موجود تھے۔ لہٰذا ان زبانوں کے حوالے سے کئی اور نکتے بھی زیرِ بحث آسکتے ہیں۔ مثلاً فارسی زبان میں ''سر'' چوٹی، سردار یا چیف (۱۴) کے معنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح سار مانند کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور اسے کبھی کبھی سر کی ہیئت میں بھی لکھا جاتا ہے۔ مثلاً سبک سار سے سبک سر، نگوں سار سے نگوں سر (۱۵) وغیرہ۔ لیکن یہ سر بھی لاحقہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ البتہ سر بمعنی سردار یا چیف پر سوچا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے لالو گودھا قوم کا سردار ہو اور چونکہ فارسی زبان اس وقت مستعمل تھی اور یہاں ضلع شاہ پور (موجودہ سرگودھا) میں حضرت سید معروف سے لے کر فضل کریم گوندل تک بے شمار فارسی کے شعراء اور ادباء ہماری فارسی ادبی تاریخ کا حصہ تھے۔ پھر یہ لفظ ہمیشہ سابقہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے چاہے اس کا الحاق کسی بھی زبان کے لفظ سے ہو۔ اگر ہم لغات کا مطالعہ کریں تو بے شمار الفاظ اس ترکیب میں ملیں گے۔ جیسے سربلند، سرکردہ، سرباز۔ اگر کوئی یہ کہے کہ ہندی لفظ گودھا کے ساتھ فارسی لفظ سر کیسے آسکتا ہے تو اس الحاق کی بھی کئی مثالیں موجود ہیں مثلاً سردھرا، سردھنا، اور سرپھٹول وغیرہ۔

شیخ محمد حیات کے سرکنڈے والے سر کو اس لئے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ نہر لوئر جہلم نکلنے سے پہلے یہ سارا علاقہ بنجر اور ویران تھا۔ یہاں صرف جھاڑیاں اور سرکنڈے اُگے ہوئے تھے اور یہی وجہ تھی کہ اردگرد کے دیہاتوں سے لوگ مویشی چرانے یہاں لایا کرتے تھے۔ ممکن ہے

زمین دلو گودھا کی ہو اور سرکنڈے بھی اس کی ملکیت ہوں۔ کسی نے سرکو طنز کے طور پر گودھا سے پہلے جوڑ دیا ہو جو آخر سرگودھا بن گیا۔

ایک بات اور میرے ذہن میں اکثر کھٹکتی رہی کہ سر اور گودھا چونکہ دونوں ہی سنسکرت کے الفاظ ہیں۔ سر کے معنی تو لغت میں موجود ہیں لیکن گودھا کے معنی تلاش بسیار کے باوجود نہیں مل پا رہے تھے تو اس سلسلے میں میر پور خاص (سندھ) میں مقیم تاج قائم خانی سے جب رابطہ کیا تو انہوں نے سر کے دو معنی بتائے۔ ا۔ بڑا تالاب، ۲۔ پیر۔ جبکہ گودھا کے معانی انہوں نے جو بتائے وہ کسی صورت اس نام یعنی گودھا سے میل نہیں کھاتے۔ ہاں! اگر تالی کے تن والا تعلق جوڑیں تو بات بن سکتی ہے۔ انہوں نے بتایا: ''گودھا اُس بیل کو کہتے ہیں جو اچھی نسل کا اور جوان ہوتا ہے اور اُسے ہمارے ہاں اکثر کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ برصغیر میں اسے کہیں سے بھی نہیں روکا جاتا۔'' (۱۶)۔ اس بیل کو ہم پنجابی زبان میں ''ساہن'' کہتے ہیں۔ جسے عرف عام میں ''سرکاری سانڈ'' بھی کہا جاتا ہے۔

اوپر دی گئی تمام روایات اور مفروضوں سے ہٹ کر ایک آخری مفروضے پر بات کرنا بھی ضروری خیال کرتا ہوں۔ مجھے کئی بار انگریزوں سے ملنے کے مواقع بھی میسر آئے اور انہیں پڑھنے کا اتفاق بھی رہا۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ جو بات اُن کے ذہن میں اٹک گئی اس پر ڈٹ گئے اور کبھی یوں بھی ہوا کہ کسی شے کی نا موزونیت کے باعث اُسے تشبیہ کے نام سے موسوم کر دیا۔ یہاں میں ایک تاریخی حوالے سے بات کو آگے بڑھانا چاہوں گا۔

> ''۱۵ ستمبر ۱۹۱۶ء کو......... برطانیہ نے پہلی مرتبہ ٹینک کو آرمرڈ وہیکل کے طور پر جنگ میں استعمال کیا۔ کل ۴۹ ٹینک جنگ میں بھیجے گئے جن میں سے گیارہ محاذ جنگ پر پہنچے۔'' (۱۷)

ٹینک بنانے کا خیال ایک برطانوی لیفٹیننٹ کرنل جس کا تعلق انفنٹری سے تھا کے ذہن میں پہلی بار آیا۔ لڈل ہارٹ اس بارے میں لکھتا ہے:

"It was Lient-Colonel E.D. Swinton, who after conceiving the idea independently and pressing it

unsuccessfully in various quarters, eventually gained the backing of the commander-in-chief in the field of proposals that gave more precision to the project and were better fitted to the tactical requirements." (۱۸)

القصہ جب ٹینک بن گیا تو یہ صرف لوہے کا ایک متحرک مورچہ تھا۔ جس کا ابھی تک نام بھی تجویز نہیں ہوا تھا۔ اسے کرنل سوئٹن ایک بحری جہاز میں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جا رہا تھا تو اس سے پوچھا گیا کہ "یہ کیا ہے؟" وہ خاموش رہا۔ تو کسی شخص نے دوبارہ سوال کیا: "Is it a tank?" (کیا یہ پانی کا تالاب ہے؟) لیفٹیننٹ کرنل سوئٹن خوشی سے اچھل پڑا۔ اسے اپنے کام کا نام مل گیا۔ اس نے فوراً جواب دیا: "Yes, it is a tank."

بالکل اسی طرح جب سرگودھا کی بنیاد رکھ دی گئی اور کالونی آفیسر مسٹر ینگ کے نام پر اس کا نام ینگ آباد تجویز ہو چکا تو ادائیگی میں یہ عام لوگوں کی زبان سے بڑے عجیب تلفظ میں ادا ہو کر اپنی ہیئت تو کجا اپنی اصلیت بھی برقرار رکھنے میں ناکام رہا اور ایک گالی کے روپ میں زبان زد عام ہو گیا۔ ایک دن مسٹر ہیلی کے سامنے غالباً لالو گودھا الفاظ کہے۔ تو وہ بڑا حیران ہوا۔ اس نے نورالدین سے جو اس کا دوست اور ینگ آباد کا ڈپٹی انسپکٹر تھا۔ یہ لفظ پوچھا جو گودھا نے ادا کیا تھا تو اس نے حقیقت بتا دی۔ مسٹر ہیلی کو یہ بات بری لگی تو اس نے اس شخص کے بارے میں پوچھا کہ: Who is he? نورالدین نے مختصر جواب دیا۔ Sir, Godha. لارڈ ہیلی کے چہرے پر خوشی کے آثار نمایاں ہوئے اور اس نے اسی لیے حکم دیا۔ آئندہ یہ شہر ینگ آباد نہیں بلکہ "سرگودھا" کے نام سے پکارا جائے گا۔

بہرحال یہ روایات ہیں یا مفروضے۔ ابھی تک سب تحقیق طلب ہیں۔ ایک ہی روایت کو لے کر بیٹھ جانا اور اسے حرف آخر سمجھ لینا کہ گودھا کا تالاب یعنی سر تھا لہٰذا سرگودھا نام ہو گیا۔ درست نہیں۔ تمام روایات اور مفروضوں پر غور کرنا اور لسانیات کے حوالے سے اس نام کی جانچ پرکھ ابھی

باقی ہے۔ لیکن اس نام کی اہمیت کو یہاں کے باسیوں نے ہر مشکل وقت میں اجاگر کیا۔ اور مارشل اقوام کا ثبوت دیتے ہوئے اپنا آپ منوایا کہ یہ سرگودھا ہے اور شاید اسی وجہ سے فروری ۲۰۰۵ء میں ڈھاکہ (بنگلہ دیش) میں سرگودھینز کی ری یونین کی تقریب کے موقع پر بنگلہ دیشی نژاد امریکی شہرت حاصل کرنے والے سرگودھا کے ایک صاحب علم نے شرکاء کو مخاطب کرکے کہا تھا:

" I do not know U.S.A. I do not know Bangladesh. I do not know Pakistan. I only know P.A.F. Public School Sargodha that is the cradle of my life and love. I shall always make pilgrimage to my alma mater." (۱۹)

مآخذ

۱۔ ریاض احمد شاد، تعارف ضلع سرگودھا، مشمولہ سخن وران سرگودھا از محمود اسیر، ادارہ شاہین ادب بلاک نمبر ۲۱۔ سرگودھا ۱۹۸۳ء، ص ۳۶

۲۔ ملک جاوید کبیر، ایکل کڑا نہ بار دے، راوی پبلشرز اردو بازار لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۴۰

۳۔ محمد زمان کھوکھر ایڈووکیٹ، سیالکوٹ سے خیبر تک، یاسر اکیڈمی بالمقابل گل سیشن ہاؤس کچہری روڈ۔ گجرات، ۱۹۹۷ء، ص ۳۳۷

۴۔ Prof Sahibzada Muhammed Abdul Rasul, The Hisoty of Sargodha, 2006, P9

۵۔ ڈاکٹر صاحبزادہ ابرار احمد بگوی، دی ہسٹری آف سرگودھا.... ایک تنقیدی مطالعہ، مشمولہ، ماہنامہ شمس الاسلام، بھیرہ، اپریل ۲۰۰۷ء، ص ۱۲

۶۔ صاحبزادہ احمد ندیم، ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں، مشمولہ: سہ ماہی اسالیب۔ سرگودھا، اگست تا اکتوبر ۲۰۰۷ء، ص ۸

۷۔ پروفیسر ہارون الرشید تبسم، نوائے انور، بزم علم وفن پاکستان۔ سرگودھا، ۱۹۹۹ء

۸۔ شیخ محمد حیات، سرزمین سرگودھا، اولیں پبلشرز، ۳۸، اردو بازار لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۴۷

۹۔ خالد اقبال (سینئر پروڈیوسر ریڈیو پاکستان) سرگودھا، گفتگو ۲۳ فروری، ۲۰۰۸ء

۱۰۔ راجہ راجیسور راؤ اصغر، ہندی اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، اسلام آباد، بار دوم ۱۹۹۸ء، ص ۳۸۳

۱۱۔ ارشد ملک (محقق) سرگودھا، گفتگو ۱۵ فروری ۲۰۰۸ء

۱۲۔ مفتی غلام سرور قریشی لاہوری، تاریخ مخزن پنجاب، دوست ایسوسی ایٹس پبلشرز اردو بازار لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۳۱۹

۱۳۔ راجہ راجیسور راؤ اصغر، ہندی اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان پاکستان اسلام آباد، بار دوم ۱۹۹۸ء، ص ۳۷۴

۱۴۔ ڈاکٹر محمد عبد اللطیف، فرہنگ فارسی، کتابستان پبلشنگ لاہور، س ن، ص ۵۵۷

۱۵۔ ایضاً، ص ۵۳۸

۱۶۔ تاج قائم خانی، (میر پور خاص سندھ) ٹیلی فونک رابطہ، ۱۹ مارچ ۲۰۰۸ء

۱۷۔ اعظم شیخ، بیسویں صدی کا انسائیکلو پیڈیا، علم و عرفان پبلشرز لوئر مال لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۹۹

۱۸۔ Capt B.H. Liddell Hart, The Tanks, Vol-I, Cassell & Company Ltd, 35 Red Lion Square London W.C I, 1959, P-18

۱۹۔ ہفت روزہ ہلال، راولپنڈی، ۳۰ جون ۲۰۰۶ء، ص ۱۱

ہمارا قومی لباس اور قومی زبان اردو، ہمارے افتخار اور تشخص کے ضامن ہیں

ڈاکٹر شاہد اقبال کامران

اقبال اور اسلامی ثقافت کی روح

تجربہ، مشاہدہ اور اختراع کو معروضی طور پر علم کی بنیاد خیال کیا جاتا ہے لہٰذا کوئی بھی علم، یعنی مادی یا وجدانی علم تجربے کی شمولیت کے بغیر حقیقت کی یقینی بنیادوں تک نہیں پہنچ پاتا۔ اس پس منظر میں اقبال مابعد الطبیعیاتی علم کو بھی تجربے کے ذریعے ثابت کرنے کی سعی کرتے ہیں، اور ''تجربے'' کی معنوی وسعت کو روحانی تجربے تک پھیلاتے ہوئے اور روحانی تجربے کی واقعیت کو تسلیم کرتے ہوئے ان سے حاصل ہونے والے نتائج کو بھی علم کا ایک ماخذ قرار دیتے ہیں۔ اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اسی طور پر عقلی اور حسی تجربے کا شعور حقیقتِ مطلقہ کے علم کو اپنی گرفت میں لانے کا خواہش مند رہا ہے لیکن جب یہ شعور اپنی حدود میں رہتے ہوئے ایسا نہیں کر پاتا تو منطقی طور پر، فہم و ادراک میں نہ آنے والے علم کا انکار کر دیتا ہے، تجربی علم کے اس انکار سے آگے ''وجدان'' کی اقلیم شروع ہوتی ہے اقبال ''وجدان'' کے علم کو روحانی تجربے کی کسوٹی پر پرکھنے کے امکانات کو تسلیم کرتے ہوئے کوشش کرتے ہیں کہ مابعد الطبیعیات کو موجود اور ممکن علم کے مطابق سائنسی انداز میں واضح کیا جائے۔

کیا ''روحانی تجربہ'' محض ایک انداز نظر ہے یا امر واقعہ؟ اس سوال کا معروضی جواب سیدھا اور سادہ نہیں ہے۔ لیکن ایک راستہ ایسا ضرور ہے جس سے اس امر کا سراغ مل سکتا ہے کہ کسی مبینہ روحانی تجربے کی بنیاد پر کس قسم کا علم وجود میں آیا اور کس قسم کے احوال تشکیل پائے' یہ صرف فلسفے ہی کا موضوع نہیں ہے اس میں عمرانیات، تاریخ، معاشیات اور علم انسانیات کے مربوط مطالعات بھی آجاتے ہیں اور اقبال کے معروف خطبات Reconstruction of religious thought in

Islam (اردو ترجمہ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ' از سید نذیر نیازی) اسی قسم کے مطالعات کا مجموعہ ہے۔ ان سات خطبات میں یوں تو ہر خطبہ اپنے موضوع کی ندرت اور استدلال کے تنوع اور وسعت کے اعتبار سے اہم ہے' لیکن پانچواں خطبہ "The spirit of Muslim Culture" اسلامی ثقافت کی روح' اس اعتبار سے منفرد ہے کہ اقبال نے اس میں پیغمبر اسلامؐ کے روحانی تجربے کے نتائج اور ان سے پیدا ہونے والی علمی اور عمرانی تحریک کے اساسی محرکات کو موضوع بنایا ہے۔ اقبال بتاتے ہیں کہ پیغمبر اسلام کے روحانی تجربے نے جس ثقافت کو پیدا کیا' یعنی جس قسم کے علمی اور عملی رویے ترتیب دیئے ان کی بنیاد تجربے مشاہدے اور اختراع پر تھی۔ اسلامی ثقافت کے مظاہر انسان کو کائنات کی مرکزی اکائی بنا کر اعتماد کی بے پناہ دولت سے مالا مال کرتے ہوئے لا انتہا امکانات سے روشناس کراتے ہیں۔ اسلامی ثقافت کے داخلی محرکات اسے دنیا کی دوسری ثقافتوں سے ممتاز کرتے ہیں۔ یہ چند تصورات کا مجموعہ نہیں' بلکہ ہر لحظہ متغیر وقت کے ہم رکاب چلنے والی متحرک فکر کا نام ہیں۔ اسلامی ثقافت کے ان داخلی محرکات کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمارا ماخذ اقبال کے مجموعہ خطبات تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ میں شامل پانچواں خطبہ اسلامی ثقافت کی روح ہے۔ اقبال نے اس خطبے میں اسلامی ثقافت پر اثر انداز ہونے اور اس کی سمت متعین کرنے والے حسب ذیل محرکات پر بحث کی ہے۔

ا۔ **شعورِ نبوت:** کہ جس کا عملی زندگی میں مظاہرہ ہی اسلامی ثقافت کی روح ہے۔ اس ضمن میں اقبال نبی کی روحانی واردات اور ولی کی روحانی واردات کی ہیئت اور نتائج سے بحث کرتے ہوئے دونوں میں فرق واضح کرتے ہیں۔

۲۔ **عقیدہ ختم نبوت:** یہ انسانی عقل و شعور کی بلوغت کا اعلان ہے۔ اس لیے اسلامی رویوں پر اس عقیدے کے اثرات بڑے بنیادی اور دور رس ہیں۔ اس کے نمایاں پہلو دو ہیں۔ اول یہ کہ اب انسان کو ہدایت کے لیے کسی غیبی سرچشمے سے رہنمائی کی ضرورت نہیں' اب اسے اپنے شعور ذات کی تکمیل کے لیے اپنے وسائل سے کام لینا ہوگا۔ یہ وسائل حصول علم کے مختلف ذرائع ہیں جن

میں باطنی مشاہدہ، مطالعہ فطرت اور تاریخ بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ دوم یہ کہ اگرچہ باطنی واردات اور روحانی مشاہدات کا تجربہ اب بھی حاصل کیا جاسکتا ہے لیکن یہ اب کسی کے لئے بھی ممکن نہیں رہا کہ وہ کسی ایسی روحانی واردات کا دعویٰ کرے جس سے انکار کفر ہو۔ لہٰذا اب کسی بھی قسم کی باطنی واردات اور روحانی مشاہدات' ان کا مرتبہ کتنا ہی ارفع کیوں نہ ہو' آزادانہ تنقید سے نہیں بچ سکتے۔ اب کوئی شخص بھی اپنے باطنی مشاہدے اور روحانی کمالات کی بنا پر نبوت کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اقبال اس امر کی وضاحت یوں کرتے ہیں کہ اسلام جدید تفکر اور تجربے کی روشنی میں قدم رکھ چکا ہے اور کوئی ولی' پیغمبر اس کو قرون وسطیٰ کے تصوف کی تاریکی میں واپس نہیں لے جاسکتا۔(۱)

۳۔ سرچشمہ ہائے علم وحکمت اور ان کے ثقافتی رویوں پر اثرات

۴۔ یونانیت کی تردید: حیات و کائنات سے متعلق حرکی نظریات' ابن مسکویہ کا تصور ارتقاء' عراقی کا تصور زمان ومکاں اور ان کے اسلامی ثقافت پر اثرات۔

۵۔ قرآن حکیم کا تصور تاریخ: ابن خلدون کا نظریہ تاریخ (اشپنگلر کے اسلامی تحریک و تہذیب کے متعلق غلط تصورات) یہ وہ چیدہ چیدہ عوامل ہیں جو اسلامی ثقافت میں کارفرما اس حقیقی روح کی ہیئت وحرکت کے ادراک میں ہماری مدد کرتے ہیں جو پیغمبر اسلام ﷺ کے انسانیت ساز پیغام کی پیدا کردہ ہے۔ اب ہم اقبال کے خطبے کے حوالے سے ان داخلی محرکات کی وضاحت اور اسلامی ثقافت پر ان کے اثرات کا مطالعہ کرتے ہیں۔

۶۔ شعور نبوت: باطنی واردات ومشاہدات ایک نبی بھی حاصل کرتا ہے اور یہ تجربات اس میں ایک ارفع شعور کی تخلیق کرتے ہیں جب کہ ایک ولی بھی کچھ اسی قسم کے باطنی وروحانی تجربات میں سے گزر سکتا ہے۔ پھر وہ کون سی چیز ہے جو دونوں کے تجربات ومشاہدات کی اہمیت واثرات کو ایک دوسرے سے الگ اور ممتاز کرتی ہے؟ اقبال اپنے خطبے کا آغاز ہی اس سوال کے جواب سے کرتے ہیں۔ وہ ایک معروف صوفی بزرگ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کا ایک بیان رقم کر کے نبی اور ولی

کی استعداد کا بیان بڑے لطیف انداز میں کر جاتے ہیں۔ بیان یوں ہے کہ

''محمد ﷺ فلک الافلاک پر پہنچ کر واپس تشریف لے آئے' واللہ اگر میں وہاں تک پہنچتا تو ہرگز واپس نہ آتا۔''

اقبال کہتے ہیں کہ شیخ موصوف کے اس ایک جملے سے ہم اس فرق کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں جو شعور نبوت اور شعور ولایت میں پایا جاتا ہے۔ وہ وضاحت کرتے ہیں کہ ''صوفی نہیں چاہتا کہ واردات اتحاد میں اسے جو لذت و سکون حاصل ہوتا ہے اسے چھوڑ کر واپس آئے لیکن اگر آئے بھی' جیسا کہ اس کا آنا ضروری ہے تو اس نوع انسانی کے لیے کوئی خاص نتیجہ مرتب نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس' نبی کی بازآمد تخلیقی ہوتی ہے۔ وہ ان واردات سے واپس آتا ہے تو اس لیے کہ زمانے کی رو میں داخل ہو جائے اور پھر ان قوتوں کے غلبہ و تصرف سے جو عالم تاریخ کی صورت گر ہیں' مقاصد کی ایک نئی دنیا پیدا کرے۔ صوفی کے لیے تو لذت اتحاد ہی آخری چیز ہے لیکن انبیاء کے لیے اس کا مطلب ہے ان کی اپنی ذات کے اندر کچھ اس قسم کی نفسیاتی قوتوں کی بیداری جو دنیا کو زیر و زبر کر سکتی ہیں اور جن سے کام لیا جائے تو جہان انسانی دگرگوں ہو جاتا ہے۔ لہٰذا انبیاء کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ ان واردات کو ایک زندہ اور عالمگیر قوت میں بدل دیں'' (۲) اس وضاحت کے بعد کہ ولی روحانی واردات میں اس قدر گم ہو جاتا ہے کہ بس وہیں کا ہو رہنا چاہتا ہے لیکن اگر وہ ان کیفیات سے نکل بھی آئے تو اس کی یہ واپسی نبی نوع انسان کے لیے چنداں مفید اور انقلاب خیز نہ ہو گی۔ ولی کا تجربہ ذاتی رہتا ہے کیوں کہ اس کا منتہائے مقصود ہی روحانی تجربے یا مشاہدے کا حصول ہے اور بس۔ اس کے برعکس نبی کے لیے روحانی تجربہ و مشاہدہ بجائے خود مقصود نہیں' وہ اس تجربے سے حاصل ہونے والے شعور و قوت کو بنی نوع انسان کی حیات میں انقلاب لانے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اقبال وضاحت کرتے ہیں کہ ایک نبی کا اپنے روحانی واردات و مشاہدات سے روحانی طور پر واپس آنا اپنے اندر ایک زبردست تخلیقی قوت پنہاں رکھتا ہے۔ وہ اس زبردست تخلیقی قوت کو

بروئے کار لاتے ہوئے احوال زندگی میں تغیر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ نبی دراصل اپنے تجربات و مشاہدات روحانی کی جانچ کے لیے زمانے میں انقلاب لانا چاہتا ہے۔ وہ دوسروں کی زندگی میں تبدیلی لائے بغیر، تاریخ کو ایک نیا موڑ دیئے بغیر اپنے مقصد کی تکمیل کر ہی نہیں سکتا۔ یوں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نبی کا ذاتی تجربہ و مشاہدہ اس کے شعور کی وسعت سے اجتماعی نوعیت اختیار کر لیتا ہے۔ اقبال مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

''ایک اعتبار سے نبوت کی تعریف یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ یہ شعور ولایت کی وہ شکل ہے جس میں واردات اتحاد حدود سے تجاوز کر جاتیں اور ان قوتوں کی پھر سے رہنمائی یا از سر نو تشکیل کے وسائل ڈھونڈتی ہیں جو حیات اجتماعیہ کی صورت گر ہیں۔ گویا انبیاء کی ذات میں زندگی کا متناہی مرکز اپنے لامتناہی اعماق میں ڈوب جاتا ہے تو اس لیے کہ پھر سے ایک تازہ قوت اور زور سے ابھر سکے۔ وہ ماضی کو مٹاتا اور پھر سے زندگی کی نئی نئی راہیں اس پر منکشف کر دیتا ہے۔'' (۳)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم اپنی اجتماعی زندگی کے حوالے سے نبی کے مذہبی مشاہدات و واردات کے انقلاب آفریں اثرات کی قدر و قیمت کا اندازہ کس طور کر سکتے ہیں؟ اقبال بتاتے ہیں کہ اس کے لیے ہمیں انبیاء کے مذہبی مشاہدات و واردات کے زیر اثر تشکیل پانے والے انسانی سیرت و کردار اور تہذیب و تمدن کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ یعنی یہ دیکھنا چاہیے کہ اس نبی کے ماننے والوں میں زندگی سے متعلق کس قسم کے رویے پرورش پاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: ''انبیاء کے مذہبی مشاہدات اور واردات کی قدر و قیمت کا فیصلہ ہم یہ دیکھ کر بھی کر سکتے ہیں کہ ان کے زیر اثر کس قسم کے انسان پیدا ہوئے، علیٰ ہذا یہ کہ تہذیب و تمدن کی وہ کیا دنیا تھی جس کا ظہور ان کی دعوت سے ہوا'' (۴)

اسلامی ثقافت کی روح کا مطالعہ یا دوسرے لفظوں میں اسلامی ثقافت کے داخلی محرکات کی وضاحت سے مراد ہی یہ ہے کہ ان تصورات کا مطالعہ کیا جائے جو اسلامی ثقافت میں کارفرما ہیں۔ اس

کا طریقہ اقبال نے یہ اختیار کیا کہ ان تصورات کی تہہ تک پہنچنے کے لیے ان کے مطالعہ کی ابتدا وہاں سے کی جہاں سے یہ بطور ایک قوت عمل کے وجود پذیر ہوئے۔ اسی ضمن میں انہوں نے ان تصورات کے اصل ماخذ یعنی شعور نبوت سے آغاز کیا لیکن اس احتیاط کے پیش نظر کہ نبی کے روحانی مشاہدات و باطنی واردات کو ایک ولی کے روحانی مشاہدات اور باطنی واردات کے مماثل خیال نہ کر لیا جائے' انہوں نے ان دونوں کے مابین بنیادی فرق کو واضح کر دیا اور بتا دیا کہ اصل فرق واردات کا نہیں اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے شعور کا ہے اور اس قوت انقلاب کا جو اس شعور کے باطن سے وقوع پذیر ہو کر گرد و پیش کے احوال کی ترتیب و تہذیب نو کرنا چاہتی ہے۔ اس طرح نبی کا روحانی تجربہ اپنے اثرات کے اعتبار سے ولی کی ذات تک ہی محدود رہتا ہے اور بنی نوع انسان کے لیے اجتماعی اثرات کا حامل قرار نہیں پاتا۔ ایک طرح کی (یا ایک دوسرے سے ملتی جلتی) روحانی واردات کے دو ردعمل یا نتائج کیوں؟ جواب یہ ہے کہ نبی کا روحانی تجربہ اور باطنی مشاہدہ اس کے لیے بجائے خود منزل مقصود کی حیثیت نہیں رکھتا۔ بلکہ وہ اس منزل سے اسرار حیات پر غور و فکر کرتے ہوئے گزر جاتا ہے اور اپنے اس گزرے تجربے سے احوال ساز شعور کی دولت حاصل کر کے اپنے گرد و پیش کو (ان تجربات کی روشنی میں) بدل دینا چاہتا ہے۔ اب یہ دیکھیے کہ ایک ولی کے لیے اس کے روحانی مشاہدات ہی منتہائے مقصود ہیں۔ بہت سارے تو مقامات ہی میں کھو جاتے ہیں اور جو چند ایک اپنے تجربات و مشاہدات کو اپنی ذہنی و روحانی استعداد کے مطابق منطقی انجام تک پہنچا لیں وہ بقول اقبال اس واردات اتحاد کی لذت و سکون کی وجہ سے اسی میں رچ بس جانا چاہتے ہیں لیکن اگر وہ اس حال سے نکل بھی آئیں تو بھی ان کی واپسی اپنے حاصل شدہ شعور کے اعتبار سے تخلیقی نہ ہوگی۔ بفرض محال اگر کوئی ولی اپنی بازآمد کو تخلیقی شعور کے ساتھ منسوب کر کے کوئی دعویٰ کر بیٹھے تب اسے اس بات کو ذہن میں رکھنا ہوگا کہ اس کی واردات آزادانہ تنقید کی کسوٹی پر پرکھی جائے گی۔ اس کے دعوئی سے پہلے' بہت پہلے انسانی فہم و شعور کو ایسی کسی بھی واردات و مشاہدات کی کھل کر جانچ کرنے کا اختیار

مل چکا ہے اور یہ کہ اب ایسا دعویٰ انسانی فہم وشعور کو ترقی معکوس کی طرف راغب کر کے روحانی اور منطقی دونوں اعتبار سے انسانیت کے ارتقاء میں رکاوٹ کا باعث ہوگا۔ اس موضوع پر اقبال عقیدہ ختم نبوت کے تحت سیر حاصل بحث کرتے ہیں۔

۷۔ ختم نبوت: اسلامی ثقافت میں کارفرما تصورات ورجحانات کے اصل ماخذ شعور نبوت پر بحث کرنے کے بعد اقبال ختم نبوت کی طرف آتے ہیں کہ جس نے عقل استقرائی اور آزادانہ تنقید کے دروازے کھول کر اسلامی ثقافت کو اپنی ہیئت اور دائرہ زمان ومکاں میں بے حدود کر دیا۔ اقبال لکھتے ہیں۔ ''شعور نبوت کو گویا کفایت فکر اور انتخاب سے تعبیر کرنا چاہیے لیکن جہاں عقل نے آنکھ کھولی اور قوت تنقید بیدار ہوئی تو پھر زندگی کا مفاد اسی میں ہے کہ ارتقائے انسانی کے اولین مراحل میں ہماری نفسی توانائی کا اظہار جن ماورائے عقل طریقوں سے ہوا تھا ان کا ظہور اور نشوونما رک جائے۔''
(۵) ماورائے عقل طریقوں سے حاصل ہونے والی نفسی توانائی کے عوض انسان اپنے ماحول پر غالب آنے کے لیے کس چیز کی طرف رجوع کرے؟ اقبال اس کے جواب میں عقل استقرائی کی طرف متوجہ کر کے وضاحت کرتے ہیں کہ استقرائی عقل جو انسان کو اس کے ماحول پر غالب کرتی ہے بڑی مشکل اور محنت سے حاصل ہوتی ہے اور جب یہ ایک بار حاصل ہو جائے تو اس کو مستحکم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ علم کے دوسرے ذرائع کی ترقی روک دی جائے۔ بلاشبہ قدیم زمانے نے، جب کہ انسان ابھی تہذیب کے ابتدائی مرحلے میں تھا اور سنی سنائی باتوں پر ایمان لے آتا تھا، فلسفے کے بعض عظیم نظام پیدا کیے لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ قدیم دنیا کے یہ نظام ہائے فلسفہ مجرد فکر کا نتیجہ تھے جو مبہم مذہبی عقائد اور روایات کی ترتیب سے آگے نہیں بڑھ سکے اور ہمیں زندگی کے ٹھوس احوال پر گرفت مہیا کرنے سے قاصر رہے۔ اقبال لکھتے ہیں، ''اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یوں نظر آئے گا جیسے پیغمبر اسلام ﷺ کی ذات گرامی کی حیثیت دنیائے قدیم اور دنیائے جدید کے درمیان ایک واسطہ کی ہے۔ اپنے سرچشمہ وحی کے اعتبار سے آپ ﷺ کا تعلق دنیائے قدیم سے ہے لیکن اس کی روح کے

اعتبار سے دنیائے جدید سے۔ یہ آپ ہی کا وجود ہے کہ زندگی پر علم و حکمت کے وہ تازہ سرچشمے منکشف ہوئے جو اس کے آئندہ رخ کے عین مطابق تھے۔ لہٰذا اسلام کا ظہور ..... استقرائی عقل کا ظہور ہے۔ اسلام میں نبوت چوں کہ اپنے معراج کمال کو پہنچ گئی' لہٰذا اس کا خاتمہ ضروری ہو گیا۔ اسلام نے خوب سمجھ لیا تھا کہ انسان ہمیشہ سہاروں پر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اس کے شعور ذات کی تکمیل ہو گی تو یوں ہی کہ وہ خود اپنے وسائل سے کام لینا سیکھے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اگر دینی پیشوائی کو تسلیم نہیں کیا یا موروثی بادشاہت کو جائز نہیں رکھا یا بار بار عقل اور تجربے پر زور دیا یا عالم فطرت اور عالم تاریخ کو علم انسانی کا سرچشمہ ٹھہرایا تو اس لیے کہ ان سب کے اندر یہی نکتہ مضمر ہے کیوں کہ یہ سب تصور خاتمیت ہی کے مختلف پہلو ہیں۔''(۲) اس اقتباس سے یہ نکات سامنے آتے ہیں:

(الف) آنحضورﷺ کی ذات نے نوع انسان کو عقلی نابالغی کے دور سے نکال کر عقلی بلوغت کے دور میں داخل کیا۔

(ب) آپﷺ کی ذات کو اپنی صفات کے اعتبار سے قدیم و جدید کا حسین سنگم قرار دیا جا سکتا ہے۔ آپﷺ اپنے سرچشمہ وحی کے اعتبار سے دنیائے قدیم اور اس کی روح کے اعتبار سے' بالفاظ دیگر اپنے شعور کی تخلیقی قوت اور عملی جہت کے اعتبار سے دنیائے جدید سے تعلق رکھتے ہیں۔

(ج) آپﷺ کی ذات پر ماورائے فہم و ادراک سرچشمہ علم و حکمت کے خاتمے سے نوع انسان علم و حکمت کے ایسے تازہ سرچشموں سے واقف ہوا جن کا تعلق اس کی آئندہ زندگی سے تھا۔ اس طرح اس نے علم و حکمت کے حصول کے لیے اپنی ہی عقل و فہم پر انحصار کرنا سیکھا۔ اسی لیے اقبال اسلام کے ظہور کو عقل استقرائی کا ظہور قرار دیتے ہیں۔

(د) علم و حکمت کے حصول کے لیے عقل اور تجربے پر زور دیتے ہوئے انسان کو مشاہدہ فطرت اور مطالعہ تاریخ کی طرف متوجہ کیا گیا۔ مشاہدہ فطرت کی طرف اس لیے کہ اب وہ وقت آ

گیا تھا کہ انسان مظاہر فطرت پر سے الوہیت کا لبادہ اتار پھینکے اور عقل کی مدد سے ان کی ماہیت کا ادراک حاصل کرتے ہوئے انہیں تسخیر کرے۔ جب کہ تاریخ کو انسانی علم کا سرچشمہ اس لیے قرار دیا گیا کہ یہ انسان کو خود اپنے ہی انفرادی و اجتماعی تجربات سے استفادہ کرنے اور اپنے گزرے کل کا دیانت دارانہ تجزیہ کرتے ہوئے نہ صرف اپنے حال کو بہتر بنانے کے قابل کرے بلکہ آنے والے کل کے لیے بھی ایک بہتر لائحہ عمل تیار کرنے کی اہلیت عطا کرے۔ یوں انسانی شعور کی طرح مظاہر فطرت اور تاریخ کو بھی ارتقاء کے تسلسل یا حرکت کی وحدت میں پرو کر انسان کے لیے لامتناہی امکانات کا سامان فراہم کر دیا۔ صرف اسی بات نے انسان کی ساری نفسیات کو تبدیل کر کے رکھ دیا۔ اس کا اثر زندگی کے ہر نظریے، ہر تصور پر پڑا اور یوں یہ چیز اسلامی ثقافت کے لیے ایک ایسا متحرک عامل ثابت ہوئی کہ جس نے اس ثقافت کے لیے توسیع و ارتقاء کے ان گنت امکانات کا تسلسل رواں کر دیا۔

عقل، تجربے، مشاہدے اور تجزیے پر بار بار زور دینے کا مطلب یہ نہیں کہ اب انسانی زندگی میں صرف عقل ہی کا عمل دخل ہوگا اور جذبات کے لیے زندگی میں کوئی جگہ باقی نہیں رہی۔ اقبال کہتے ہیں ''تصور خاتمیت سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ زندگی میں اب صرف عقل ہی کا عمل دخل ہے، جذبات کے لیے اس میں کوئی جگہ نہیں۔ یہ بات نہ کبھی ہوسکتی ہے اور نہ ہونی چاہئے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ واردات باطن کی کوئی بھی شکل ہو ہمیں بہرحال حق پہنچتا ہے کہ عقل اور فکر سے کام لیتے ہوئے اس پر آزادی کے ساتھ تنقید کریں اس لیے کہ اگر ہم نے ختم نبوت کو مان لیا تو گویا عقیدۃً یہ بھی مان لیا کہ اب کسی شخص کو اس دعوے کا حق نہیں پہنچتا کہ اس کے علم کا تعلق چوں کہ کسی مافوق الفطرت سرچشمے سے ہے، لہٰذا ہمیں اس کی اطاعت لازم آتی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو خاتمیت کا تصور ایک طرح کی نفسیاتی قوت ہے، جس سے اس قسم کے دعوؤں کا قلع قمع ہو جاتا ہے اور

جس سے مقصود یہ ہے کہ انسان کی باطنی واردات اور احوال کی دنیا میں بھی علم کے نئے نئے راستے کھل جائیں۔ بعینہ جس طرح اسلامی کلمہ طیبہ (لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ) کے جزو اول نے انسان کے اندر یہ نظر پیدا کی کہ عالم خارج کے متعلق اپنے محسوسات و مدرکات کا مطالعہ نگاہ تنقید سے کرے اور قوائے فطرت کو الوہیت کا رنگ دینے سے باز رہے' جیسا کہ قدیم تہذیبوں کا دستور تھا۔ لہٰذا مسلمانوں کو چاہیے کہ صوفیانہ واردات کو خواہ ان کی حیثیت کیسی ہی غیر معمولی اور غیر طبعی کیوں نہ ہو ایسا ہی فطری اور طبعی سمجھیں' جیسے اپنی دوسری واردات اور اس لیے ان کا مطالعہ بھی تنقید و تحقیق کی نگاہوں سے کریں'' (۷) عقیدہ ختم نبوت کی یہ جہت' یعنی اب کسی شخص کو اس دعوے کا حق نہیں پہنچتا کہ فوق النظر سرچشمہ علم کو بنیاد بنا کر لوگوں کی اطاعت طلب کرے اور انکار کرنے والے کو کافر قرار دے' اسلامی ثقافت کو جدید سے جدید تر انسان کی ثقافت بناتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ زندگی کے معاملات سے متعلق انسانوں کا اجتماعی طرز فکر و عمل ان کا ثقافتی رویہ کہلاتا ہے اور اس کے نتائج ان کی ثقافت، جدید انسان کے لیے تجربے، آزادانہ تنقید اور مشاہدے کے حق سے دستبردار ہونا ممکن ہی نہیں' یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ علم و حکمت کے نامعلوم ذرائع (جو ابھی پردہ امکان میں ہیں) کی طرف بڑھنے کی بجائے پھر اپنے ارتقاء کی ابتدائی منازل کا رخ کرے؟ یاد رکھنا چاہیے کہ کوئی بھی انسان جوان ہونے کے بعد اپنے بچپن کی طرف نہیں لوٹ سکتا۔ اقبال ایک اور جگہ دو ٹوک الفاظ میں کہتے ہیں کہ اسلام جدید تفکر اور تجربے کی روشنی میں قدم رکھ چکا ہے اور کوئی ولی پیغمبر اس کو قرون وسطیٰ کے تصوف کی تاریکی کی طرف واپس نہیں لے جاسکتا (۸)

عقیدہ ختم نبوت کی تہذیبی قدر و قیمت یہ ہے کہ آنحضورﷺ نے اپنے پیروؤں کو آزادی کا راستہ دکھا دیا' یعنی یہ کہ اب کسی اور انسانی ہستی کے آگے روحانی حیثیت سے سر نیاز خم نہ کیا جائے۔ اقبال اس بات کو دینیاتی نقطۂ نظر سے یوں بیان کرتے ہیں کہ وہ اجتماعی اور سیاسی تنظیم جسے اسلام کہتے ہیں مکمل اور ابدی ہے اور پیغمبر اعظم و آخر حضرت محمدﷺ کے بعد کسی ایسے الہام کا امکان ہی نہیں جس

سے انکار کفر کو مستلزم ہو اور یہ کہ جو شخص ایسے الہام کا دعویٰ کرتا ہے وہ اسلام سے غداری کرتا ہے (۹)

۸۔ سرچشمہ ہائے علم و حکمت: مشاہدات باطن اور ان کی نبوت جیسے مضبوط ادارے کی حیثیت سے تہذیبی قدر و قیمت کا جائزہ لینے کے بعد اب ہم اسلام کے تصور علم کی تہذیبی قدر و قیمت کا تجزیہ کر سکتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ سامنے رکھنی چاہیے کہ ختم نبوت کے عقیدے سے انسان کو حریت ذہنی اور آزادی کا منشور عطا کرتے ہوئے اس کی عقل کو ہر قسم کے ذہنی اور روحانی استحصال سے نجات دلا دی۔ اب اس کی ذہنی سرگرمیوں کو دو کلیدی سرچشمہ ہائے علم و حکمت کی طرف متوجہ کیا جا رہا ہے۔ علم و حکمت کے یہ دو سرے سرچشمے مشاہدۂ فطرت اور مطالعہ تاریخ ہیں۔ اقبال خطبے میں لکھتے ہیں کہ

> ''مشاہدات باطن صرف ایک ذریعہ ہیں علم انسانی کا۔ قرآن پاک کے نزدیک اس کے دو سرچشمے اور ہیں۔ ایک عالم فطرت' دوسرا عالم تاریخ۔ جن سے استفادہ کرنے میں عالم اسلام کی بہترین روح کا اظہار ہوا۔ قرآن پاک کے نزدیک یہ شمس و قمر یہ سایوں کا امتداد یہ اختلاف' حاصل کلام یہ کہ یہ سارا عالم فطرت جیسا کہ بذریعہ حواس ہمیں اس کا ادراک ہوتا ہے' حقیقت مطلقہ کی آیات ہیں اور اس لیے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ ان میں غور و فکر سے کام لے۔ یہ نہیں کہ بہروں اور اندھوں کی طرح ان سے اعراض کرے کیوں کہ جو کوئی اس زندگی میں اندھوں کی طرح ان آیات سے اپنی آنکھیں بند رکھتا ہے وہ آگے چل کر بھی اندھا ہی رہے گا۔ (۱۰)

اقبال توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ قرآن پاک کی ہدایت اور راہنمائی کے مطابق انسان مشاہدہ فطرت اور مطالعہ تاریخ کی طرف متوجہ ہوا اور اس طرح جملہ جدید سائنسی علوم کی بنیاد رکھی گئی۔ ان علوم کے زیر اثر انسان جو کبھی مظاہر فطرت سے سہما رہتا تھا اب انہیں تسخیر کرنے میں مصروف ہو گیا۔ تاریخ سے متعلق بھی اس کا زاویہ نگاہ یکسر تبدیل ہو گیا۔ اب وہ تاریخ کو اجتماعی انسانی تجربات کے تسلسل کی حیثیت سے دیکھنے لگا اور یوں وہ تاریخی عمل کو ایک مسلسل اور مربوط تجربہ خیال

کرتے ہوئے اس کے نتائج سے مستفید ہونے لگا (اسی زاویہ نگاہ نے تاریخ کو ایک تخلیقی حرکت کے طور پر سمجھنے کا رجحان پیدا کیا جس کا مطالعہ ہم ابن خلدون کے ضمن میں کریں گے) اس طرح یہ کہنا بالکل درست ہے کہ اسلامی ثقافت میں کارفرما جملہ تصورات اپنے رویوں کے اعتبار سے تجرباتی' مشاہداتی' تنقیدی اور تخلیقی ہیں۔ صرف اسی بات کو ذہن میں رکھ کر اسلامی ثقافت کی روح کی تفہیم حاصل کی جا سکتی ہے۔

۹۔ یونانیت کی تردید' حیات وکائنات سے متعلق حرکی نظریات: اور جب مسلمانوں نے قرآن پاک کے متعین کردہ علمی رویے کے مطابق ان ذرائع علوم وحکمت (یعنی مشاہدہ فطرت اور مطالعہ تاریخ) سے کام لے کر فکر ونظر کے نئے دروا کیے تو ان کی روشن فکری کا راستہ یونان کے تصورات علم وحکمت سے ٹکرایا۔ اقبال لکھتے ہیں کہ "محسوس اور ٹھوس حقائق پر بار بار توجہ دینے کی اس دعوت کے ساتھ ساتھ جس کی قرآن مجید نے تعلیم دی' جب مسلمان رفتہ رفتہ اسی حقیقت کو پا گئے کہ کائنات میں روانی اور حرکت ہے' وہ لامتناہی ہے اور اضافہ پذیر۔ تو انجام کار یونانی فلسفہ کی مخالفت پر' جس کا اپنی حیات ذہنی کی ابتدا میں انہوں نے بڑے ذوق وشوق سے مطالعہ کیا تھا' اتر آئے۔ شروع شروع میں انہیں اس امر کا احساس نہیں ہوا کہ قرآن مجید کی روح فلسفہ یونان کے منافی ہے اور اس لیے حکمت یونان پر اعتقاد کرتے ہوئے انہوں نے قرآن پاک کا مطالعہ بھی فکر یونان ہی کی روشنی میں کیا لیکن قرآن مجید کا زور چوں کہ محسوس اور ٹھوس حقائق پر ہے اور حکمت یونان کا حقائق کی بجائے نظریات پر' لہٰذا ظاہر ہے یہ کوششیں ایک نہ ایک دن ضرور ناکام رہتیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور یہ اسی کوشش کی ناکامی تھی جس کے بعد اسلامی تہذیب وثقافت کی حقیقی روح برسر کار آئی" (۱۱)

یونانی علم محض نظری تھا' اس کا حقائق سے کوئی تعلق نہ تھا' بس منطق سے دماغی ورزش کرنے کا نام علم تھا۔ اسی اسلوب علم نے زندگی کے ہر پہلو سے متعلق ان کی غلط راہنمائی کی اور یوں وہ اسلوب علم ایک ناقص ثقافت کا باعث بنا۔ قرآن کریم نے علم کا بالکل مختلف تصور پیش کیا۔ قرآن

مجید کا واضح رجحان محسوس اور ٹھوس حقائق کی طرف ہے اس لیے قرآنی اسلوب تعلیم زندگی کی موجود و محسوس حقیقتوں کا براہ راست مشاہدہ کرنے انھیں تجربے کی کسوٹی پر پرکھنے اور پھر آزادانہ نتائج اخذ کرنے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تمام تر جدید علوم کی بنیاد اسی اسلوب علم پر قائم ہے۔ چنانچہ یہ کہنا بالکل بے جا نہ ہوگا کہ اسلام ہی جدید علوم وفنون کا سرچشمہ ہے۔ بایں ہمہ تجربے اور مشاہدے کے ذریعے علم حاصل کرنے کے اسلوب نے اسلامی ثقافت کو وہ ثروت اور رہنمائی عطا کی جو دراصل اسی کا خاصا ہے۔ اقبال اس بات کی سختی سے تردید کرتے ہیں کہ اسلامی تہذیب وثقافت کی ہیئت اور وضع قطع یونانی فلسفے نے متعین کی۔ اقبال کہتے ہیں کہ اسلامی ثقافت میں کارفرما روح ہی اپنے مزاج' اپنے طریق کار اور اپنی ہیئت کے اعتبار سے یونانی فلسفے سے متصادم ہے۔ یونانیوں کے محض نظری علوم نے انسانی فکر کی ترقی کو روک رکھا تھا۔ یہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے محسوس اور ٹھوس حقائق کی طرف توجہ کرتے ہوئے انھیں علوم کی بنیاد بنایا اور یوں انسانی فکر علم وحکمت کے نئے میدانوں میں سرگرم ہوئی۔ اقبال اپنے خطبے میں ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ جدید سائنس، جس کی بنیاد تجربے اور مشاہدے پر استوار ہے' کے بانی مسلمان ہیں۔ اس ضمن میں وہ ایک برطانوی ماہر بشریات رابرٹ بریفالٹ کی کتاب تشکیل انسانیت کے حوالے سے اس کے اس اعتراف کا ذکر کرتے ہیں جس کے مطابق وہ تسلیم کرتا ہے کہ جدید سائنس یعنی کے تجربی طریقے کی ابتدا کا فخر راجر بیکن یا اس کے ہم نام فرانسس بیکن کو حاصل نہیں بلکہ اس اسلوب علم کے بانی مسلمان تھے۔ اقبال نے اسی مصنف کی متذکرہ کتاب سے چند اقتباسات بطور حوالہ پیش کیے ہیں۔ میں صرف ایک اقتباس نقل کرنے پر اکتفا کروں گا۔ بریفالٹ اپنی تصنیف تشکیل انسانیت میں لکھتا ہے کہ "سب سے بڑی خدمت جو عربی تہذیب وثقافت نے جدید دنیا کی ہے وہ سائنس ہے' گو اس کے ثمرات بہت آگے چل کر ظاہر ہوئے۔ یہ عفریت اپنی پوری شان اور قوت سے نمودار ہوا تو اس وقت جب اسلامی اندلس تاریکی کے پردوں میں چھپ چکا تھا لیکن یہ صرف سائنس ہی نہیں جس سے یورپ کے اندر زندگی کی

ایک نئی لہر دوڑ گئی' اسلامی تہذیب و تمدن کے اور بھی متعدد اور گونا گوں اثرات ہیں جن سے یورپ میں پہلے پہل زندگی نے آب و تاب حاصل کی۔'' (۱۲)

اس موضوع پر اقبال نے اپنے خطبے میں ایک طویل بحث پیش کی ہے۔ یہ ساری بحث علوم جدیدہ پر اسلام کے احسانات کی تفصیل پر مشتمل ہے۔ اس طویل بحث کی جزئیات سے بچنے کے لیے میں یہاں اقبال کی ایک تقریر سے اقتباس رقم کرتا ہوں جو موضوع زیر بحث کا حاطہ کرے گا۔ اقبال کہتے ہیں: ''میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اسلام مغربی تہذیب و تمدن کے تمام عمدہ اصولوں کا سرچشمہ ہے۔ چودھویں صدی عیسوی میں جب سے یورپ کی ترقی کا آغاز ہوا' یورپ میں علم کا چرچا مسلمانوں ہی کی یونیورسٹیوں سے ہوا تھا۔ ان یونیورسٹیوں میں مختلف ممالک یورپ کے طلبہ آ کر تعلیم حاصل کرتے اور پھر اپنے اپنے حلقوں میں علوم و فنون کی اشاعت کرتے تھے۔ کسی یورپین کا یہ کہنا کہ اسلام اور علوم یکجا نہیں ہو سکتے' سراسر ناواقفیت پر مبنی ہے اور مجھے تعجب ہے کہ علوم اسلام اور تاریخ اسلام کے موجود ہونے کے باوجود یہ کیوں کر کوئی کہہ سکتا ہے کہ علوم اور اسلام ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ بیکن' ڈی کارٹ اور مل یورپ کے سب سے بڑے فلاسفر مانے جاتے ہیں جن کے فلسفے کی بنیاد تجربے اور مشاہدے پر ہے لیکن حالت یہ ہے کہ ڈی کارٹ کا میتھیڈ (اصول) امام غزالی کی احیاء العلوم میں موجود ہے اور ان دونوں میں اس قدر مطابقت ہے کہ ایک انگریز مورخ نے لکھا ہے کہ اگر ڈی کارٹ عربی جانتا ہوتا تو ہم ضرور اعتراف کرتے کہ ڈی کارٹ سرقہ کا مرتکب ہوا ہے۔ راجر بیکن خود ایک اسلامی یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ تھا۔ جان سٹورٹ مل نے منطق کی شکل اول پر جو اعتراض کیا ہے بعینہ وہی اعتراض امام فخرالدین رازی نے بھی کیا تھا اور مل کے فلسفے کے تمام بنیادی اصول شیخ بوعلی سینا کی مشہور کتاب شفا میں موجود ہیں۔ غرض یہ کہ تمام وہ اصول جن پر علوم جدیدہ کی بنیاد ہے مسلمانوں کے فیض کا نتیجہ ہیں' بلکہ میرا دعویٰ ہے کہ نہ صرف علوم جدیدہ کے لحاظ سے بلکہ انسان کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس پر اسلام نے بے اعتبار روح پر اثر نہ ڈالا ہو'' (۱۳) اقبال باور کراتے ہیں کہ

مسلمانوں نے یونانی منطق کی تردید میں ٹھوس اور محسوس حقائق پر استوار علم کا اسلوب پیش کیا جس کا طریقہ نظری مباحث کی بجائے مشاہدات پر تھا۔ یہ واضح تغیر اسلامی ثقافت میں کارفرما اسی توانا روح کا کارنامہ ہے جو ہمارے پیارے نبی ﷺ کے شعور نبوت کی زبردست تخلیقی قوت نے پیدا کی تھی۔ اس روح نے علوم کی ہیئت بدل کر رکھ دی۔ ان کے مقاصد تبدیل کر دیے اور یوں عقل و شعور کی ساکت و جامد گاڑی کو اس طور رواں دواں کیا کہ وہ کہیں رکنے کا نام ہی نہیں لے سکتی۔ اقبال اس بحث کے تسلسل میں کائنات اور زندگی کے متعلق ان حرکی نظریات کا ذکر بھی کرتے ہیں جو اس کی روح کی کارفرمائی کا لازمی نتیجہ تھے۔ اس ضمن میں اقبال ارتقاء سے متعلق ابن مسکویہ کے نظریات اور زمان و مکاں کے بارے میں عراقی کے تصورات کا بطور خاص خلاصہ پیش کرتے ہیں۔ ارتقاء سے متعلق نظریات کے ضمن میں اقبال کہتے ہیں کہ سب سے پہلے عرب مفکر جاحظ نے ارتقائے حیوانی پر نقل مکانی اور آب و ہوا کے اثرات ملاحظہ کیے۔ جاحظ اپنی تصنیف کتاب الحیوان میں ارتقائے انواع، نقل مکانی، آب و ہوا کے اثرات اور یہاں تک کہ جانوروں کی نفسیات کو بھی زیر بحث لاتا ہے۔ یہ وہ مسائل ہیں جو انیسویں صدی میں علوم جدیدہ کا موضوع بنے۔ ابن مسکویہ نے جاحظ کے نظریہ ارتقائے حیوانی کو باقاعدہ اور مرتب شکل دی اور پھر الہیات پر اپنی تصنیف ''الفوز الاصغر'' میں اس سے کام لے کر انسانی ارتقاء کی نوعیت بیان کی۔ اقبال اپنے اس خطبے میں ابن مسکویہ کے نظریہ ارتقاء کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ ابن مسکویہ کے نظریہ کے مطابق ارتقاء کا سلسلہ جمادات سے لے کر حیوانات اور انسانوں تک مختلف لیکن مربوط طریقوں سے جاری رہتا ہے۔ اس کی وضاحت وہ یوں کرتا ہے کہ نباتات ایک نقطہ انتہا تک پہنچ کر (وہ انگور اور کھجور کی مثال دیتا ہے) حیوانی زندگی سے متصل ہو جاتی ہیں۔ نباتات کا یہی نقطہ انتہا حیوانی زندگی کا نقطہ آغاز ہے پھر حیوانی زندگی کا ارتقاء چوپایوں میں گھوڑے اور پرندوں میں عقاب کی حتمی شکل اختیار کرتے ہوئے بالآخر بندر پر آ کر رک جاتا ہے اور یوں حیوانی زندگی انسانی زندگی سے متصل ہو جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بندر با اعتبار ارتقاء

انسان سے صرف ایک ہی درجہ پیچھے ہیں (۱۴) اور پھر عضویاتی تبدیلیوں' قوت تمیز اور روحانیت میں ترقی کی بدولت انسان وحشت کی زندگی ختم کر کے تہذیب وتمدن کی دنیا میں قدم رکھتا ہے۔ ابن مسکویہ کے اس تصور ارتقاء میں جو روح کام کر رہی ہے' ابن مسکویہ اس کی وضاحت یوں کرتا ہے" ہر ہستی کے اندر ایک شوق ہے جو اسے مجبور کرتا ہے کہ اپنے کمال کی طرف حرکت کرے۔ یہی حرکت خیر و فضیلت ہے۔ انسان کا کمال چوں کہ انسانیت میں ہے جو حیوانات میں موجود نہیں' لہٰذا انسان کی فضیلت اسی میں ہے کہ اس مرتبے کو حاصل کرے" (۱۵)

اس کے بعد اقبال فخر الدین عراقی کے تصور مکاں کی تفصیل پیش کرتے ہیں۔ اس تفصیل سے اقبال کا مقصد صرف یہ واضح کرنا ہے کہ عصر حاضر کے مفکرین نے ریاضیات اور طبعیات کے جدید انکشافات کی بنا پر مسئلہ زمان و مکاں سے متعلق جس انداز میں بحث کی ہے' ایک روشن خیال مسلمان صوفی نے ریاضیات اور طبعیات سے ناواقف ہونے کے باوجود محض اپنے باطنی مشاہدات کی ترجمانی کرتے ہوئے کس طرح نظریہ مکاں کا ایک حرکی تصور پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے افکار کی اہمیت اپنی جگہ لیکن اصل بات ان میں پنہاں رُوح کی کارفرمائی کے رخ کی ہے جو دیگر میدان ہائے علم وفکر کی طرح یہاں بھی ارتقائے مسلسل اور حرکت کی طرف رہنمائی کرتی نظر آتی ہے۔ عراقی کا تصور مکاں مختصراً یوں ہے کہ وہ مکان کی تین قسمیں بیان کرتا ہے:

اول۔ مادی اشیاء کا مکان

دوم: غیر مادی اشیاء کا مکان

سوم: ذات الٰہیہ کا مکان

پھر مادی اشیاء کا مکان بھی تین حصوں میں تقسیم ہے۔ ایک بڑے اور کثیف اجسام کا مکان ہے جو جگہ گھیرتے ہیں اور جن میں حرکت کے لیے وقت اور قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ دوسرے لطیف اشیاء کا مکان مثلاً ہوا اور آواز کا' یہ اجسام بھی ایک دوسرے سے مزاحم تو ہوتے ہیں لیکن ان کی

شرائط مزاحمت کثیف اجسام سے قطعاً مختلف ہیں مثلاً آواز ہوا میں سے ہوکر گزرتی ہے دراصل یہ ہوا کی لہروں میں مخصوص ارتعاش سے ہی تو پیدا ہوتی ہے۔ پھر ان کے وقت میں اور کثیف اجسام کے وقت میں بڑا فرق ہے۔ کثیف اجسام کے وقت کے مقابلے میں آواز کی لہروں کی وقت کی کوئی حقیقت ہی نہیں۔ تیسرے نور یا روشنی کا مکان ہے۔ یہ اپنی لطافت اور اپنے وقت کے اعتبار سے پہلی دونوں قسم کی اشیاء سے بڑھ کر ہے اور اس کی شرائط بھی مختلف اور لطیف تر ہیں۔ مادی اشیاء کے مکان پر بحث کرنے کے بعد عراقی غیر مادی اجسام (مثلاً فرشتوں وغیرہ) کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہر چند کہ ان کی حرکت بھی وقت کی پابند ہے لیکن ان کی شرائط حرکت دیگر سے مختلف ہیں' یعنی یہ غیر مادی اجسام سنگ وخشت میں سے گزر سکتے ہیں۔ عراقی کے تصور کے مطابق حرکت نقص کی علامت ہے اس اعتبار سے وہ کہتا ہے کہ یہ صرف روح ہے جو اس نقص سے ماورا اور یوں مکان سے آزاد ہے اسے ہم متحرک کہیں گے نہ ساکن۔ پھر عراقی ذات الٰہیہ کے مکان کی طرف آتا ہے جو ہر قسم کی شرائط سے آزاد ہے' دراصل ابن مسکویہ اور عراقی کے تصورات سے بحث کرکے اقبال ہمیں اس فکری رویے کی طرف متوجہ کر رہے ہیں جو اسلام کے تصورات علم وحکمت کا پیدا کردہ ہے اور جس نے اسلامی ثقافت کے باطن کو پوری شدت سے متحرک کر رکھا ہے۔ اقبال ان مباحث کا مقصد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "بہرحال اسلامی فکر نے جو راستہ اختیار کیا ہے اس کی انتہا جس پہلو اور جس رنگ میں بھی دیکھیے کائنات کے حرکی تصور پر ہوتی ہے" (۱۶)

حیات وکائنات کے حرکی تصورات ہی کے ضمن میں اقبال' ابن خلدون کے نظریہ تاریخ کی مثال پیش کرتے ہیں۔ ابن خلدون تاریخی عمل کو ایک تخلیقی تحریک تصور کرتا ہے نہ کہ ایسا عمل جو پہلے سے متعین کیا جا چکا ہو۔ اقبال کہتے ہیں کہ موجودہ دور میں برگساں نے اس نظریے کو زیادہ صحت اور عمدہ مثالوں کے ساتھ پیش کیا (۱۷) تاریخ کا عمل ایک تخلیقی تحریک کیوں کر قرار پایا؟ اس بات کی وضاحت کے لیے اقبال قرآن پاک کے نظریہ تاریخ سے بحث کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن پاک نے تاریخ

کو علم کا ایک سرچشمہ قرار دیا تو اس سے مراد صرف یہ تھی کہ تاریخی واقعات کے مطالعے سے سبق حاصل کیا جائے' بلکہ قرآن مجید نے تاریخی تنقید کا ایک بنیادی اصول قائم کیا۔ یہ اصول اس طرح پرورش پاتا ہے کہ چوں کہ تاریخ واقعات کے تسلسل کا نام ہے' ان واقعات سے حاصل ہونے والے تجربات پر کسی تصور یا نقطۂ نظر کی بنیاد رکھنے سے پہلے یہ یقین ہونا ضروری ہے کہ یہ واقعات اپنی صحت کے اعتبار سے درست ہیں۔ تاریخی واقعات کی صحت اور عدم صحت کے سوال نے تاریخی عمل سے متعلق ہمیں محتاط رویہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ تاریخی واقعات کی صحت کا دارومدار بالآخر ان کے راویوں پر ہوتا ہے' لہٰذا تاریخی تنقید کے اصول میں ان راویوں کی سیرت و کردار کا مکمل مطالعہ شامل ہوا تا کہ ان کی بیان کردہ شہادت کے وزن کا اندازہ لگایا جا سکے۔ اقبال کہتے ہیں کہ اسی تنقیدی اصول کا اطلاق جب روایات حدیث پر ہوا تو پھر رفتہ رفتہ تاریخی تنقید کے قوانین مرتب ہوتے چلے گئے۔ قرآن پاک کا بار بار حقائق کی طرف متوجہ کرنا اور اس کے ساتھ ہی اس امر کی ضرورت کہ آنحضورﷺ کے جملہ ارشادات پوری صحت کے ساتھ مرتب ہوں تا کہ آئندہ نسلوں کو اکتساب فیض کے دوامی سرچشمے مل جائیں۔ یہ وہ عوامل ہیں جو ان اصولوں کی تہ میں کارفرما ہوئے۔

قرآن پاک نے انسان کو محسوس اور ٹھوس حقائق کی طرف متوجہ کرتے ہوئے مشاہدہ فطرت اور مطالعہ تاریخ کو سرچشمہ علم قرار دیا۔ اس سے انسانی عمل و شعور کے لیے آزادانہ تنقید و تحقیق کے راستے کھل گئے اور علم و عمل کو مربوط کرنے کا رجحان فروغ پذیر ہوا۔ تصور علم میں یہی وہ بنیادی تبدیلی ہے جو اسلام نے پیدا کی۔ اقبال کہتے ہیں کہ اس فکری طرز عمل نے جو قرآن پاک نے مسلمانوں میں رائج کیا' مسلمان مفکرین کو زندگی اور زمانے کی ماہیت کے بارے میں بعض اساسی تصورات کا نہایت صحیح اور قرین حقیقت ادراک عطا کیا۔ حیات و کائنات سے متعلق ان اہم ترین تصورات میں سے دو کا اقبال ذکر کرتے ہیں۔ ایک وحدت انسانی کا عملی تصور یعنی زندگی کے حقائق کو ایک مربوط سلسلے کے طور پر مطالعہ کرنا۔ اقبال کہتے ہیں کہ اسلامی فکر میں وحدت انسانی کے خیال نے

نہ تو کسی فلسفیانہ تصور کی سی حیثیت اختیار کی اور نہ ہی کسی شاعرانہ خواب کی' بلکہ وحدت انسانی کے اس تصور نے ہمارے فکری رویوں میں ایک زندہ اور قائم عنصر کی حیثیت سے رواں دواں رہتے ہوئے غیر محسوس طریقے سے اپنا عمل جاری رکھا۔ اسلامی ثقافت کے داخلی عوامل میں وحدت انسانی کو ایک وحدت خیال کرنے کا تصور ہے۔ یہ ایک فعال تصور ہے جو اس کی مادیت کو کسی بھی نسل اور خطے سے وابستہ ہونے کے الزام سے محفوظ رکھتے ہوئے اسے عالمگیریت عطا کرتا ہے اور یوں اس کی عمل کاری زمان و مکاں کی پابندیوں سے آزاد ہونے لگتی ہے۔

زندگی اور زمانے سے متعلق دوسرا اساسی تصور جو اسلامی فکر میں پختہ تر ہوا' وہ زمانے کو ایک حقیقت تسلیم کرنے کا تھا۔ یعنی یہ کہ زمانہ خواب و خیال نہیں' ایک زندہ حقیقت ہے اور مسلسل و مستقل حرکت پذیر بھی۔ اس چیز نے ابن خلدون کو تاریخ کا اعلیٰ تر شعور عطا کیا اور اس نے تاریخی عمل کو ایک آزادانہ تخلیقی تحریک قرار دیتے ہوئے ان تمام قدیم تصورات کی دھجیاں اڑا دیں جو تاریخی عمل کو طے شدہ سرگرمی کی عمل کاری قرار دے کر تمام تر امکانات کو دبا کر رکھتے تھے۔

خطبہ کے آخر میں اقبال مغربی مستشرق اشپنگلر کی اسلام کی مبادیات اور اسلامی تہذیب و ثقافت سے متعلق ان غلط فہمیوں کا ذکر کرتے ہیں جن کا اظہار اس نے اپنی تصنیف زوال مغرب میں کیا ہے۔ اقبال بتاتے ہیں کہ اشپنگلر نہ تو اسلام کی ایک مذہبی تحریک کے طور پر ماہیت کو سمجھ سکا اور نہ ہی اس نے ان عملی سرگرمیوں علیٰ ہذا فکری رویوں کو سمجھنے کی کوشش کی کہ تہذیب و تمدن کی دنیا میں جن کا آغاز اسلام کی بدولت ہوا۔ اشپنگلر نے جو بنیادی غلطی کی وہ اسلام کو بھی مجوسی مجموعہ مذاہب میں سے ایک خیال کرنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اسلامی تہذیب و ثقافت کو بھی مجوسی تہذیب قرار دیتا ہے۔ اس کا اصل مسئلہ وہی ہے جو کسی بھی متعصب مغربی مفکر کا ہو سکتا ہے یعنی یہ ثابت کر دیا جائے کہ مغربی تہذیب کا یونانیت سے مخالفت کا رویہ خود اس کی اپنی فطانت اور فکری بغاوت کا نتیجہ ہے۔ اشپنگلر بھی اسلامی تہذیب کو مجوسی قرار دے کر گویا اس بات کو نظر انداز کرنے کی ذہانت آمیز کوشش کر رہا ہے کہ

یونانیت کے خلاف اصل فکری بغاوت تو اسلام نے کی تھی اور اسلامی فکر کے حوالے سے یہ یونانیت مخالف رویہ مغرب میں رائج ہوا۔ اقبال لکھتے ہیں کہ:

''..... عصر حاضر کی روش اگر یونانیت کے منافی ہے تو اس کی ابتدا دراصل اس بغاوت سے ہوئی جو عالم اسلام نے فکر یونان کے خلاف کی مگر اشپنگلر اس بات کو کیسے تسلیم کرسکتا ہے؟ کیوں کہ اگر ثابت ہو جائے کہ تہذیب جدید کی مخالف یونانیت کی روح سچ مچ ان اثرات کا نتیجہ ہے جو اس نے اپنی پیش رو (یعنی اسلامی) تہذیب سے قبول کیے تو تہذیبوں کی باہمدگر آزادی اور جداگانہ نشوونما کے متعلق اشپنگلر کا دعویٰ یک قلم باطل ہو جائے گا۔ میری رائے میں اشپنگلر کا یہی اضطراب کہ وہ اپنے اس دعویٰ کو کسی نہ کسی طرح صحیح ثابت کر سکے' اس امر کا باعث ہوا کہ بحیثیت ایک ثقافتی تحریک اس نے اسلام کو بڑی ہی غلط اور فاسد نگاہوں سے دیکھا'' (۱۸)

ہاں' اقبال یہ ضرور تسلیم کرتے ہیں کہ ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب مجوسی افکار نے اسلام کی روح پر یلغار کی تھی۔ اس سے اسلامی فکر پر جمود کی کیفیت بھی طاری ہو گئی لیکن اس بنا پر اسلام کی حقیقی تحریک کی ماہیت کو بھی غلط اور مجوسی قرار دے کر بالائے طاق رکھنے کا رجحان سوائے تعصب بے جا اور انکار حقیقت کے کچھ نہیں۔ اقبال لکھتے ہیں کہ''..... اگرچہ اس امر سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اسلام پر بھی مجوسیت کا ایک غلاف ضرور چڑھ گیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ ان خطبات میں میری برابر یہ کوشش رہی ہے کہ مجوسیت کے ان غلافوں کو ہٹا کر جنہوں نے گویا اسلام کی حقیقی روح پر پردہ ڈال رکھا ہے اور اشپنگلر کی گمرہی اور غلط روی کا باعث ہوئے' ہم اس کا صاف ستھرا چہرہ دیکھ سکیں۔'' اشپنگلر کی یہ لاعلمی یا جاہلانہ تعصب جو بھی کہیں' مغرب کی عمومی نفسیات کی اچھی طرح غمازی کرتا ہے۔'' اقبال اس ناواقفیت یا تجاہل عارفانہ کے جملہ نفسی و علمی محرکات سے بحث کرتے ہوئے ان حقائق کی نشان دہی کرتے ہیں جن کی دانستہ یا غیر دانستہ عدم تفہیم اشپنگلر' علیٰ ہذا مغرب کے تعصب یا غلط فہمی کا باعث بنے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اشپنگلر نہ تو اسلام کا تصور خدا سمجھ سکا اور نہ ہی اسلام کے اصول

خاتمیت کی تہذیبی قدر و قیمت کا اندازہ کر سکا۔(۱۹)

کتابیات

۱۔ پنڈت نہرو کے جواب میں' حرف اقبال' مرتبہ لطیف احمد خان شیروانی (اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی' اشاعت اول اگست ۱۹۸۴ء) ص ۱۳۵

۲۔ اقبال' اسلامی ثقافت کی روح' تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ' مترجم نذیر نیازی (لاہور: بزم اقبال' طبع دوم ۱۹۸۳ء) ص ۸۹۔۱۸۸

۳۔ اسلامی ثقافت کی روح' تشکیل جدید' ص ۱۹۰

۴۔ اسلامی ثقافت کی روح' تشکیل جدید' ص ۹۰۔۱۸۹

۵۔ اسلامی ثقافت کی روح' تشکیل جدید' ص ۹۲۔۱۹۱

۶۔ اسلامی ثقافت کی روح' تشکیل جدید' ص ۱۹۴

۷۔ اسلامی ثقافت کی روح' تشکیل جدید' ص ۹۵۔۱۹۴

۸۔ پنڈت نہرو کے جواب میں' حرف اقبال' ص ۱۳۵

۹۔ پنڈت نہرو کے جواب میں' حرف اقبال' ص ۱۲۷

۱۰۔ اسلامی ثقافت کی روح' تشکیل جدید' ص ۹۷۔۱۹۶

۱۱۔ اسلامی ثقافت کی روح' تشکیل جدید' ص ۱۹۷

۱۲۔ اسلامی ثقافت کی روح' تشکیل جدید' ص ۲۰۰

۱۳۔ یہ تقریر اقبال نے ۱۹۱۱ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس دہلی میں خواجہ کمال الدین کے لیکچر بعنوان اسلام اور علوم جدیدہ' کی صدارت کرتے ہوئے اختتامی کلمات کے طور پر ارشاد فرمائی تھی۔ مقالات اقبال' مرتبہ عبدالواحد (لاہور: آئینہ ادب' بار دوم ۱۹۸۸ء) ص ۸۱۔۲۸۰

۱۴۔ اسلامی ثقافت کی روح' تشکیل جدید' ص ۲۰۷

۱۵۔ متعلقات خطبات اقبال، مرتبہ سید عبداللہ، ڈاکٹر (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، طبع اول ۱۹۷۷ء) ص ۹۳

۱۶۔ اسلامی ثقافت کی روح، تشکیل جدید، ص ۱۲۔ ۲۱۱

۱۷۔ حرف اقبال، ص ۱۱۱

۱۸۔ اسلامی ثقافت کی روح، تشکیل جدید، ص ۲۱۹

۱۹۔ اسلامی ثقافت کی روح، تشکیل جدید، ص ۲۲۱

قلمی معاونین سے التماس

ہماری بہترین کوشش کے باوجود "الاقرباء" کی سطور میں حرفی و لفظی اغلاط کہیں کہیں رہ جاتی ہیں، جس کے لئے ہم معذرت خواہ ہیں۔ تاہم ان اغلاط کے اسباب میں ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہاتھ سے لکھے ہوئے مسودات پڑھنے میں اکثر دشواری پیش آتی ہے۔ ہم از حد ممنون ہوں گے اگر ہمارے فاضل قلمی معاونین اپنے مسودات ٹائپ شدہ صورت میں ارسال فرمائیں۔ (ادارہ)

پروفیسر خیال آفاقی

کلامِ اقبال کی شعری لفظیات۔۔۔ تشبیہ و استعارہ کا جہانِ معانی

استعارہ دراصل شاعری کی زبان ہے، شاعر خود سے کلام کرے یا دوسروں سے ہمکلام ہو، دونوں صورتوں میں تخاطب کے لئے اسے اشارے، کنائے اور استعارے ہی استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ اس کے بغیر اظہار مقصد ممکن ہی نہیں۔ تاہم یہ شاعر کے اپنے مذاق اور انداز فکر پر منحصر ہے کہ وہ کیا طرز بیان اختیار کرتا ہے اور کب، کہاں اور کس بات کے لئے کس استعارے کو کلام میں لاتا ہے۔ مثلاً شراب و شباب جو شاعری کے مشہور روایتی استعارے ہیں کہ ان میں سے اول الذکر کے لئے حافظ و خیام اپنی ایک مخصوص شناخت رکھتے ہیں جبکہ شباب کا ذکر خیر کئے بغیر تو شاعری کا تصور ہی ممکن نہیں ہے۔ دراصل شاعری شعور کی چیز ہے، اس کو شعر سے مشتق بھی کہا جاتا ہے، شعر عربی زبان میں بال کو کہتے ہیں جو اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ شاعری بال سے زیادہ باریک بات کا اظہار ہے، گویا شعر وہی کہلانے کا حقدار ہے جس میں باریکی، نازک خیالی اور فکر انگیزی پائی جاتی ہو، ایسی بات جس میں گفتگو کی عمومیت کی بجائے لفظوں کو ایک خاص ڈھب اور ڈھنگ سے ترتیب دے کر نہایت دلکش انداز اور لطیف اشاروں کنایوں میں استعمال کیا گیا ہو۔ چنانچہ کسی بھی شعر کا معیار اس کی مقصدیت اور اثر انگیزی کے پیمانے پر پرکھا جاتا ہے کہ وہ اپنے سامع کو کس قدر متاثر کر سکا ہے۔

ہر زبان کے اپنے اصول اور اسالیب ہوتے ہیں، اردو شاعری اپنے صنائع بدائع کے لحاظ سے خاصی سرمایہ دار واقع ہوئی ہے۔ گو اس ضمن میں اس پر زیادہ تر اثرات فارسی کے ہیں، بیشتر تراکیب، استعارے اور کنائے جوں کے توں فارسی سے اردو میں ڈھال لئے گئے ہیں یا پھر ان میں تھوڑی بہت ترمیم اور رد و بدل کر کے اردو کا حصہ بنا لیا گیا ہے۔ اردو کے قدیم شعرا بشمول اساتذہ کرام کا اکثر کلام ان چیزوں سے بھرا پڑا ہے۔ پھر ۱۸۵۷ء کے المیے کے بعد اور خصوصاً سرسید کی تحریک نے جدیدیت کے جو اثرات مرتب کئے اس نے نظم و نثر، ادب کے دونوں ہی شعبوں کو بے حد متاثر کیا۔ اس انقلابی صورت حال میں استعارے، کنائے اور تشبیہات کے خدوخال ہی کچھ سے کچھ

ہو گئے۔ ادب کے افق پر ابھرتے ہوئے اس نئے منظر نامہ نے ہی حالی کو مقدمہ شعرو شاعری لکھنے پر مجبور کیا۔ گو سرسید کی تحریک کے ردعمل میں بھی کچھ آوازیں بلند ہوئیں۔ ان میں سب سے زیادہ شدید مدلل اور توانا للکار اکبرالٰہ آبادی کی تھی جس کی بازگشت نے تو استعاروں کا ایک جہان ہی آباد کر ڈالا۔ اسی تناظر میں ایک اور آواز بانگ درا کی صورت ابھری، ڈاکٹر شیخ محمد اقبال نے اکبرالٰہ آبادی کے ''اصلاحی مشن'' یا ''قومی شاعری'' کو ایک نیا رنگ و آہنگ دے ڈالا۔ اقبال نے نہ صرف برصغیر کے مسلمانوں بلکہ پوری ملت اسلامیہ کے مقدمہ کو عالمی تناظر میں نہایت سنجیدگی کے ساتھ وقت کی عدالت میں پیش کیا اور یوں ایک اونگھتی اور غیر فعال قوم کو اپنی آواز جرس نما سے چونکا کر اٹھا دیا۔ ان کی پکار نے خصوصاً نوجوانوں میں بیداری کی ایک لہر دوڑا دی، اس خودفراموش گروہ کو خود آشنا و خدا شناس بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اقبالؒ کے فکر و فلسفہ کی سحرانگیزی کا یہ عالم تھا کہ آج کے سے ذرائع ابلاغ نہ ہونے کے باوجود، اقبال کا ترانہ بانگ درا کی صورت برصغیر کے دور افتادہ گوشوں تک پھیل گیا۔ پھر یہ بازگشت پورے عالم اسلام میں سنی جانے لگی، یہاں تک کہ مغرب نے بھی اس آواز کو سنا کہ:

اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو لاہور سے تا خاک بخارا و سمرقند

جہان شاعری کے کسی بھی باب اللسان میں داخل ہو کر خردبینی جائزہ لیجئے، تب بھی اقبال کی مثل کوئی دوسرا شاعر نظر نہیں آتا جس کے سوز و ساز نے لاکھوں انسانوں کی روح کو تڑپانے اور قلب کو گرمانے کا سامان کیا ہو۔ شاید اس لئے بھی کہ وہ محض ایک روایتی شاعر نہ تھے، وہ پہلے شاعر ہیں جس نے شعر کی نزاکت کو خودی ایسا بار گراں اٹھانے کا حوصلہ بخشا، لیکن سوچنا یہ ہے کہ وہ کیا سبب تھا جس نے اقبال کو نہایت مختصر عرصہ میں ملت اسلامیہ کی آنکھ کا تارا بنا دیا۔ اس کے جواب میں سب سے اول تو ان کے اخلاص کو پیش کیا جا سکتا ہے جو ان کی تمام تر شاعری میں اول تا آخر واضح طور پر نظر آتا ہے۔ دوم وہ تڑپ جو پوری امت کے لئے ان کے دل میں موجزن تھی، سوم قرآن فہمی اور سیرت رسولؐ کا گہرا مطالعہ اور اپنی تاریخ سے آگاہی، چہارم ان امراض کا مکمل ادراک جنہوں نے

جسد ملت کو قریب المرگ پہنچا دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی تیزی سے بدلتے ہوئے عالمی حالات سے باخبری اور اقوام عالم کے مزاج سے واقفیت، نیز پوری دنیا میں سیاسی، سماجی، معاشی اور اقتصادی صورت حال پر نظر، ان سب عوامل سے بالاتر چیز جو اقبال کی شخصیت میں عطر کی طرح بسی ہوئی تھی، وہ تھا عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ اقبالؒ کے ذہن و فکر میں یہ حقیقت راسخ تھی کہ آنحضورؐ کی ذات مقدس اور تعلیمات مبارکہ عالم انسانیت کے لئے واحد اور حتمی نمونہ ہیں۔ وہ اس بات پر پورا یقین اور ایمان رکھتے تھے کہ آپؐ باعتبار انسان اور رہنمائے بنی آدم، ایک مکمل اور اکمل شخصیت کے حامل ہیں اور آپؐ بجا طور پر سرور عالم اور لیڈر آف دی ورلڈ (Leader of the world) کہلانے کے حقدار ہیں۔ چنانچہ آج بھی ان کے نزدیک، اس بگڑتی ہوئی دنیا اور مسخ ہوتی ہوئی انسانیت کے خدوخال کو سنوارنا ہے تو رسول آخر و اعظم کے اسوۂ حسنہ کو مشعل راہ بنانا ہوگا۔ امن عالم کے قیام کے لئے، رحمت عالم کی سنت پر عمل کرنا اور اسی محبت اور اخوت کو عام کرنا ہوگا جو آپؐ نے پہلی اسلامی ریاست کے قیام کے شروع میں ہی ''مواخاۃ'' کے طریق کو عملی شکل دینا ضروری خیال فرمایا تھا، اور فتح مکہ کے موقع پر، عام معافی کا اعلان کر کے، فتوحات عالم کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا تھا اور اس منظر نامہ کو ہی بدل کر رکھ دیا تھا جو ایسے مواقع پر اپنی تباہ کاریاں دکھاتا آیا تھا۔ اقبال اپنے سینے میں عشق رسول کی شمع فروزاں کئے ہوئے تھے، لیکن صرف عقیدت کی حد تک نہیں بلکہ اس کا نور ان کے عمل سے عیاں تھا، انہوں نے اپنے ممدوح کی ذات کا عکس اپنے اندر منتقل کر کے خود کو ان مردان کامل کا مقلد بنانے کی خواہش ہی نہیں عملاً کوشش بھی کی، ان خدادوست اور عاشقان رسول کا پیروکار جو مکتب رسالت کی ٹکسال میں ڈھل ڈھل کر نکلتے رہے تھے۔ اقبال کی شاعری کا مرد مومن اسی مکتب سے فارغ التحصیل تھا۔ اقبال نے قوم کے نوجوانوں کو دعوت عام دی کہ وہ آئیں اور ان کی انجمن میں شریک ہو کر خود کو اس مرد مومن کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کریں جو محض ان کا ''آئیڈیل'' ہی نہیں۔ ایک زندہ اور روشن حقیقت ہے اور اس حقیقت کی ایک دو نہیں ہزاروں شمعیں دور رسالت سے لے کر قرون وسطیٰ تک رخشندہ و تابندہ نظر آتی ہیں۔ اقبالؒ اپنی اس تمنا کو دعا میں ڈھالتے رہے۔

جوانوں کو مری آہ سحر دے پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے مرا نور بصیرت عام کر دے

اقبال کے نزدیک ایک مسلمان اور مرد مومن میں بڑا فرق ہے۔ اس نے ایک عام مسلمان کے عناصر ترکیبی اور مرد مومن کی شان امتیازی کو الگ الگ اور بغیر کسی ابہام کے واضح اور دوٹوک انداز میں بیان کر دیا۔

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

اس کے ساتھ ہی مومن کا تعارف اس کی ضد کے حوالے سے کرایا کہ:

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

اقبال کے نزدیک شاعری اپنے فکر و فلسفہ کے اظہار کا ایک ذریعہ تھا اور اسی حوالے سے آخر دم تک وہ شاعری کو بطور ایک آلہ استعمال کرتے رہے۔ وہ نہ صرف اپنے دور اور زمانے کے نبض شناس تھے بلکہ ان کی فکرِ رسا روشنی کی طرح سفر کرتی ہوئی مستقبل کا منظر نامہ پیش کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالؒ گذرے ہوئے کل سے زیادہ آج اور گذرتے ہوئے آج سے زیادہ آنے والے کل کا شاعر ہے۔ یہ دعویٰ ایک ایسے شخص کا نہیں جو اقبالؒ سے جذباتی وابستگی اور والہانہ عقیدت رکھتا ہے، بلکہ اس حقیقت کا برملا اظہار ہے جو افکار اقبال کے اندر اسی طرح موجود ہے جس طرح ایک زندہ اور صحت مند جسم کے اندر روح اور جان اپنا وجود رکھتی ہے۔ اقبالؒ کی چشم وجدان اپنے بعد آنے والے صدیوں پر محیط زمانے کا بخوبی مشاہدہ کر چکی ہے، ان کی فکر رسا ان کی ممکنات کو چھو چکی ہے جو ابھی پردۂ شہود پر منتقل بھی نہیں ہو پائے ہیں'

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے

شروع میں ہم نے جو بات چھیڑی تھی وہ یہ کہ شاعری استعارے کی زبان میں بات کرتی ہے، اور یہی استعارے اور کنائے شاعری کو حسین اور لطیف تر بنانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ تو آیئے دیکھتے ہیں اقبال نے بطور شاعر ان چیزوں کو کس طرح برتا اور ان سے کیا اور کیسے کام لیا۔ اس ضمن میں سب سے اول تو اپنے ذہنوں میں یہ بات تازہ کرنی ہوگی کہ اقبال نے اردو میں جس قدر شاعری کی ہے وہ اپنے موضوع کے اعتبار سے بھی متنوع ہے اور اپنی ڈکشن کے لحاظ سے بھی منفرد ہے۔ نیز اقبال کی شاعری میں جو تراکیب ہم دیکھتے ہیں، ان میں اکثریت کا تعلق خود اقبال کی اپنی اختراع سے ہے۔ ان سے پہلے شعر و ادب میں اس نوع کی تراکیب کی کوئی مثال دیکھنے میں نہیں آتی۔ یہی دعویٰ ان استعاروں کے لئے بھی کیا جا سکتا ہے جو اقبالیات کی شناخت اور کلام اقبال کی روح ہیں۔ ان کے پہلے ہی شعری مجموعہ کا عنوان ملاحظہ کیجئے، ''بانگِ درا''، کیا یہ تراکیب ندرت کاری کی مثال نہیں؟ ''بال جبریل'' اور ''زبور عجم'' تو آپ اپنا اعلان ہیں کہ جہان شاعری میں ہماری حیثیت نادر و منفرد ہے۔ 'بانگِ درا' کی پہلی ہی نظم ''ہمالہ'' میں، ہمالہ کے لیے ''فصیل کشور ہندوستاں'' کی ترکیب کا استعمال، صاف اشارہ کرتا ہے کہ اقبال آغاز میں ہی بہ لحاظ تراکیب لفظی اختراع پسندی کی طرف مائل تھے، ہمالہ کی تعریف میں فرماتے ہیں:

ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لئے تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لئے

یہ شعر بظاہر ہندوستان میں واقع ایک پہاڑ کی تعریف میں کہا گیا ہے، لیکن اقبال اس کی قصیدہ گوئی کے لئے جو الفاظ منتخب کرتے ہیں وہ خالص اسلامی تہذیب و تاریخ سے مستعار لئے گئے ہیں۔ جلوہ، کلیم، طور سینا، تجلی اور چشم بینا، یہ سارے الفاظ علامت ہیں اس بات کی کہ اقبال کے لا شعور میں شاعری کے حوالے سے مستقبل کا نقشہ تھا اور تھا جیسا کہ بعد میں انہوں نے، بحیثیت شاعر اسلام پوری دنیا کے سامنے پیش کیا۔ ہمالہ کی بلند چوٹی کے لئے، فلک کو ''مطلع اول'' اور خود ہمالہ کو ''دیوان'' قرار دینا، اقبالؒ کی اپنی ڈکشن کا کمال ہے۔ پہاڑ کی چوٹی پر جمی برف کا منظر اقبال کی طرح دار طبیعت کو مجبور کر رہی ہے کہ وہ اسے ''دستار فضیلت'' سے تشبیہ دیں کہ اس سے بہتر کوئی اور

تمثیل ہو بھی نہیں سکتی تھی۔

برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر   خندہ زن ہے جو کلاہِ مہرِ عالمتاب پر

اقبالؒ کے متنوع اور اختراع پسند مزاج کا سحر اس شعر میں ملاحظہ کیجئے:

چشمۂ دامن ترا آئینۂ سیال ہے   دامنِ موجِ ہوا جس کے لئے رومال ہے

چشمے کے صاف و شفاف پانی کو "آئینۂ سیال" اور اس پر سے گذرتی ہوئی نرم ہوا کو "رومال" سے تشبیہ، اقبال کے اعلیٰ مصورانہ ذوق کی آئینہ دار ہے۔ پوری نظم میں کوئی ایک دو نہیں، شروع تا آخر حسین اور بے مثیل تشبیہات و تراکیب نگینوں کی طرح آویزاں دکھائی دیتی ہیں۔ مثلاً

چوٹیاں تیری ثریا سے ہیں سرگرمِ سخن   وادیوں میں ہیں تری کالی گھٹائیں خیمہ زن

ابر کے ہاتھوں میں رہوارِ ہوا کے واسطے   تازیانہ دے دیا برقِ سرِ کہسار نے

علاوہ ازیں، "محمل بے زنجیر" زبانِ برگ، غازۂ رنگِ تکلف وغیرہ تراکیب اپنی جگہ الگ مزہ رکھتی ہیں۔ نظم "گلِ رنگیں" میں استعمال ہونے والی تراکیب کی رنگینیاں ملاحظہ کیجئے۔ شناسائے خراشِ عقدۂ مشکل، برگِ ریاضِ طور، زخمیِ شمشیرِ ذوقِ جستجو، چراغِ خانۂ حکمت، توسنِ ادراک، یہ تمام تراکیب اقبال کو اردو شاعری کی روایتی "لفاظی" سے واضح طور پر الگ اور شعر گویانِ اردو میں نمایاں اور ممتاز ٹھہراتی ہیں۔ "عہدِ طفلی" ایک معصوم سی نظم ہے، لیکن نفسِ اقبال، یہاں بھی اپنی انفرادیت قائم کئے بغیر نہ رہ سکی۔ وسعتِ آغوشِ مادر، حرفِ بے مطلب، شورشِ زنجیرِ در وغیرہ۔ "مرزا غالب" اپنے عنوان کے اعتبار سے ہی ایک رسمی اور روایتی نظم کا تاثر پیش کرتی ہے۔ لیکن نہیں، اقبالؒ نے اس عقیدت مندانہ قصیدہ گوئی کو بھی اپنے طرز اور مخصوص لب و لہجہ کے ذریعہ منفرد بنا دیا ہے۔ مثال میں نظم کا صرف ایک یہی مصرع کافی ہے جو ضرب المثل بن چکا ہے۔

گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے

نظم "آفتابِ صبح" کی کرنیں ملاحظہ کیجئے: درگوشِ عروسِ صبح، داغِ مدا وشب، زنجیرِ تعلق، سرائشک آباد، بستۂ رنگِ خصوصیت۔ نظم "ماہِ نو" کا مطلع ہی اقبال کی تنوع مزاجی اور شعری نادرہ کاری کا حسین نمونہ ہے:

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقابِ نیل ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آبِ نیل

غروبِ آفتاب کے منظر کے لئے خورشید کی کشتی کا ٹوٹ کر دریائے نیل میں غرق ہو جانا، ایک نادر تشبیہ ہے اور اس شکستہ جہاز کے ایک ٹکڑے کو جو ڈوبنے سے بچ گیا ہے ماہِ نو کا نام دینا، ایک ایسا مصورانہ کمال ہے جیسے کوئی صورت گر، تصویرِ کائنات کو نئے سرے سے پینٹ (Paint) کرنے لگا ہو۔ اسی نظم کے حوالے سے فاضل مصور کی یہ خوبصورت تصویر بھی دیکھتے چلئے:

چرخ نے بالی چرالی ہے عروسِ شام کی نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیمِ خام کی

اقبال خارج سے بھی زیادہ باطن کی مصوری کا فن جانتے ہیں، وہ اپنے اندرونی ماحول اور فضا کی تصویریں بنانے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ "تصویرِ درد" ان کی ایسی ہی شاہکار نظم ہے، جس میں اقبال کی مصورانہ فطرت نے سادگی و پرکاری کا حسین امتزاج پیش کیا ہے۔ "منت کشِ تابِ شنیدن" کی ترکیب سے طلوع ہوتی ہے۔ فرنگی راج کا پورا دورِ استبداد کھینچ کر آنکھوں میں آجاتا ہے، پوری نظم میں شروع تا آخر کنائے اور استعارے اس طرح استعمال ہوئے ہیں گویا طنز کے نشتروں کے ذریعہ ٹھیک ٹھیک جگہ عملِ جراحت انجام دیا جا رہا ہے۔ رمز کے پردے میں "تصویرِ درد" اقبال کی ایسی اثر انگیز نظم ہے جس کو استعماری قوت کے خلاف ایک "ایف آئی آر" بھی کہا جا سکتا ہے۔ "لالے، نرگس، گل، قمری، طوطی، عندلیب، یہ عام استعارے نہیں بلکہ اپنے خصوصی حالات و تناظر کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔

ٹپک اے شمع آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے

''جگنو'' اقبال کی ان نظموں میں سے ہے جس کی نادر تشبیہات شعری ادب میں بطور سند پیش کی جاسکتی ہیں۔ جگنو کا پھولوں کی انجمن میں مثل شمع فروزاں ہونا، اڑتا ہوا ستارا، مہتاب کی کرن میں جان پڑ جانا، شب کی سلطنت میں دن کا سفیر، مہتاب کی قبا کا تکمہ، ایک اڑنے والے کیڑے کے لئے، اس سے زیادہ حسین تشبیہات اور کیا پیش کی جاسکتی ہیں۔ اسی نظم میں اقبال کی مصورانہ فنی صلاحیتوں کی بلندی کا ایک اور منظر بھی ملاحظہ کیجئے:

رنگیں کیا دلہن کو بانکی دلہن کی صورت　　پہنا کے لال جوڑا شبنم کی آرسی دی

نظم ''گورستان شاہی'' کا پہلا ہی مصرع ملاحظہ ہو جو اقبالؒ کو قدیم و جدید شعراء سے اپنے نطق اور انداز سخن سب سے منفرد اور ممتاز بناتا نظر آتا ہے:

آسماں بادل کا پہنے خرقۂ دیرینہ ہے

کشت عمر کا حاصل، خس آتش سوار، بستیِ اقوام تو، عشق کے ہنگاموں کی اڑتی ہوئی تصویر، یہ سب تراکیب شعری کرافٹنگ میں اقبال کو ایک عظیم فنکار ثابت کرتی ہیں۔ ''بزم انجم'' نظم کا اولین شعر کیا خوبصورت منظر دکھا رہا ہے۔

سورج نے جاتے جاتے شام سیہ قبا کو　　طشت افق سے لے کر لالے کے پھول مارے

دوسرا شعر بھی دیکھئے:

پہنا دیا شفق نے سونے کا سارا زیور　　قدرت نے اپنے گہنے چاند کے سب اتارے

تمام نظم خوبصورت تراکیب اور حسین استعاروں سے مزین ہے اور لگتا یوں ہے جیسے شاعر کے اندر حسن اور ذوق جمالیات کے چشمے زمزمہ خوانی کر رہے ہیں۔ ''شمع اور شاعر'' اپنے عنوان کے لحاظ سے ہی منفرد ہے، پوری نظم میں اقبال کے مخصوص انداز بیان کی بازگشت اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہے، تراکیب میں اقبالؒ کی امتیازی شان دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ شمع منزل ویران خویش، پروردۂ

آغوشِ موج، پیاندہ برداز خمستانِ حجاز، طلسم ماہ سیمایانِ ہند، وغیرہ۔ اقبال کی ترکیب سازی کے کچھ اور شاہکار بھی مشاہدہ کیجیے۔ درائے کاروانِ خفتہ پا (نظم مسلم)۔ باندھتے ہیں پھول بھی گلشن میں "احرامِ حیات" (نویدِ صبح)۔ غبار آلودۂ رنگ و نسب (طلوعِ اسلام)، پرندوں کی دنیا کا درویش (شاہین)، قبر کا اگلا ہوا مردہ (گلہ)، واشدِ پیرکِ افرنگ (جمعیت اقوام)، نشترِ تحقیق (آوازِ غیب) ندرت اور تنوع سے بھرپور تراکیب نے اقبال کی نظموں کو غزل کا سا آہنگ بخش دیا ہے۔ اور ان کی غزلوں نے تو غزل کی تعریف اور تاریخ ہی بدل کر رکھ دی۔ غزل میں استعمال ہونے والی ان تراکیب پر بھی ایک نظر ڈالیے جن کے موجد بھی اقبال خود ہیں: بت کدۂ صفات، گیسوئے تابدار، خیمۂ گل، عروجِ آدمِ خاکی، اسرارِ سلطانی، آدابِ فرزندی، سوز و سازِ رومی، پیچ و تابِ رازی، مردانِ حر کی تکبیریں، اللہ کے نشتر، خدا کی بستی، چوبِ کلیم، میراثِ خلیل، مقتبسِ شہرِ قاردن ہے لغت ہائے حجازی کا، مجذوبِ فرنگی، جلوۂ دانشِ فرنگ، درویشِ بے گلیم، نگاہِ فقر، آدابِ خودآگاہی، عشقِ بے چارہ، آہِ نیم شبی، نالۂ شب گیر، مریدِ ہندی، وغیرہ۔۔۔ یہ سب نگینے اقبال کے اپنے تراشیدہ ہیں۔

اقبالؒ نے ملتِ اسلامیہ کو جو کچھ دیا وہ انھیں عشقِ رسولؐ سے عطا کردہ تھا اور یہ فیضانِ رسولِ عربیؐ ہی تو ہے کہ اقبال نے اپنی فکرِ حجازی کا ذریعہ، جہاں دلِ مسلم کو ایک ولولۂ تازہ بخشا وہیں عشقِ رسولؐ کو ایک نئے اسلوب اور نئے عنوان کے ساتھ امت سے متعارف کرایا۔ وہ نیا عنوان کیا ہے؟ "وفائے محمدؐ" ہے، جس کو اقبال نے ربِ اکبر کی طرف سے اعلان کی صورت ادا کروایا۔

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں　　یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

سیدہ نغمہ زیدی

اقبالؒ کا فلسفۂ بے خودی

علامہ محمد اقبالؒ نے جہاں اپنے عالمگیر فلسفۂ خودی کو موضوع کلام بنایا ہے وہاں اس فلسفے کی تکمیل ''رموز بے خودی'' لکھ کے کی۔ کیونکہ صرف انفرادیت ہی انسانیت کا منتہائے کمال اور آخری نصب العین نہیں بلکہ تکمیل انفرادیت دراصل تمہید ہے تعمیر اجتماعیت کی۔ اسرار و رموز میں انفرادیت کو خودی سے اور اجتماعیت کو بے خودی سے تعبیر کیا ہے۔ اقبال نے زمانہ انحطاط میں ملت اسلامیہ کو مثنوی ''اسرار خودی'' کے ذریعے پیغام عمل دیا اور 'رموز بے خودی' میں مژدۂ حیات سنا کر قوم کے تن مردہ میں جان ڈال دی۔ یہ دونوں مثنویاں ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ ایک دوسرے کا تکملہ ہیں۔ ''اسرار خودی'' میں جہاں افراد کے لئے خودی اور خودداری ذریعۂ استواری ہے۔ وہیں افراد کا اپنی ہستی، ہستی قومی میں محو کر دینا اور اپنی انفرادی زندگی کے جزو کو قومی زندگی کے کل میں شامل کر دینا قومی ترقی کے لئے لازم ہے اور اسی کو بے خودی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ گویا یہ وہ بے خودی ہے جو خودی اور خودشناسی کے بعد پیدا ہوتی ہے اور جو قوم اور فرد دونوں کے لئے عین نفع ہے۔ اس مثنوی میں یہ مضمون کس خوبی سے ادا ہوا ہے۔

تو خودی از بے خودی نشناختی ۔۔۔ خویش را اندر گماں انداختی
جوہر نوریست اندر خاک تو ۔۔۔ یک شعاعش جلوۂ ادراک تو

خوگر پیکار پیہم دیدمش ۔۔۔ ہم خودی ہم زندگی نامیدمش
چوں ز خلوت خویش را بیروں کشد ۔۔۔ پائے در ہنگامۂ جلوت نہد

''رموز بے خودی'' کے دیباچے میں اقبال نے بتایا ہے کہ کوئی قوم اس وقت تک اپنی

زندگی میں استحکام پیدا نہیں کرسکتی جب تک کہ وہ اپنی تاریخ کو محفوظ نہ کرے۔ فرماتے ہیں:

''جس طرح حیات افراد میں جلب منفعت، دفع مضرت، تعین عمل و ذوق حیات عالیہ، احساس نفس کی تدریجی نشوونما، اس کے تسلسل، توسیع اور استحکام سے وابستہ ہے۔ اسی طرح ملل و اقوام کی حیات کا راز بھی اس احساس یا بالفاظ دیگر ''قومی انا'' کی حفاظت ترتیب اور استحکام میں مضمر ہے۔ اور حیات ملیہ کا انتہائی کمال یہ ہے کہ افراد کسی آئین مسلم کی پابندی سے اپنے ذاتی جذبات کی حدود مقرر کریں تاکہ انفرادی اعمال کا تباین و تناقض مٹ کر تمام قوم کے لئے ایک قلب مشترک پیدا ہو جائے۔''

جرمن فلسفی شٹرنر اور نطشے نے فرد کو مطلق العنان بنانے کی تلقین کی۔ تاکہ جماعت کے حدود و قیود اور اوامر و نواہی اس کی شخصیت کے بے روک ارتقاء میں خلل انداز نہ ہوں۔ اسی طرح ہیگل جیسے فلاسفہ نے جماعت اور مملکت کی معبود بنا دیا اور فرد کی انفرادیت وہاں ایک بے حقیقت سا مظہر بن کر رہ گئی۔

اقبال کا ''نظریۂ ربط فرد و ملت'' اسلامی زاویۂ نگاہ سے اخذ کردہ ہے کیونکہ اسلام اعتدال اور توازن کا نام ہے۔ فرد و قوم ایک دوسرے کا آئینہ ہیں۔ فرد کی جماعت سے ربط کے بغیر کوئی حیثیت نہیں۔ لیکن جماعت کا یہ ہمہ گیر رابطہ انسان کی انفرادی خودی کو سوخت نہیں کرتا بلکہ اس کی پرورش کرتا ہے۔ چنانچہ رموزِ بے خودی میں فرماتے ہیں:

فرد را ربط جماعت رحمت است — جوہر او را کمال از ملت است

تا توانی با جماعت یار باش — رونق ہنگامۂ احرار باش

یعنی تو نے خودی اور بے خودی کے باہمی ربط کو نہیں پہچانا۔ اس لئے وہم و گماں میں مبتلا ہو گیا۔ اور ان کو باہم متضاد سمجھنے لگا تیری ذات کے اندر ایک جوہر نور ہے۔ اس نفس واحدہ میں دوئی نہیں۔ گویا انفرادی خودی اور اجتماعی خودی ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں۔ اور فرد اپنی خودی کے

ارتقا اور استحکام کے بعد ملت کا ایک بیش قیمت سرمایہ بنتا ہے۔ ملت اپنے آئین وقوانین کو فرد پر لاگو کر کے اس کی خودی کو تعمیری اور تخلیقی حدود کا پابند رکھتی ہے۔

فرد تا اندر جماعت گم شود قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

فرد تنہا از مقاصد غافل است قوتش آشفتگی را مائل است

چون اسیر حلقۂ آئیں شود آہوئے رم خوئے او مشکیں شود

یعنی: فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

اقبال 'پیام مشرق' کے دیباچے میں رقم طراز ہیں:

''اقوام مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہئے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی۔ جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون ہے کہ جس کو قرآن نے ''اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ '' کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے۔ زندگی کے فردی اور اجتماعی پہلو پر حاوی ہے۔ اور میں نے اپنے فارسی کلام میں اسی صداقت کو مدنظر رکھنے کی کوشش کی ہے۔''

اقبال کا نصب العین یہ تھا کہ افراد اور قوم کی نگاہ کو جغرافیائی حدود سے بالاتر کر کے ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید و تولید کی جائے۔ اور انسانیت کی تکمیل کا معیار کسی خاص ملت کو بنائے۔ اقبال کے نزدیک ملت بیضائے اسلام ہی اس معیار پر پوری اترتی ہے۔ کیونکہ اسلام میں فرد اور ملت کا رشتہ رنگ، نسل یا وطن کے روابط کی بنیاد پر استوار نہیں ہوتا۔ بلکہ توحید و رسالت کا وسیع و ہمہ گیر عقیدہ اس کی بنیاد بنتا ہے۔ ''رموز بے خودی'' میں اقبال نے ''ارکان اساسی ملۂ اسلامیہ'' کے عنوان کے تحت توحید، رسالت اور اخوت جیسے موضوعات کی تشریح کی ہے۔

در جہانِ کیف و کم گردید عقل پے بہ منزل برد از توحید عقل

ورنہ این بے چارہ را منزل کجاست | کشتی ادراک را ساحل کجاست

کلمہ توحید ہی ملت بیضا کے تن کی جان ہے۔ یہی عقیدہ ملت کا شیرازہ بند ہے، اسی توحید نے اسود واحمر کی تمیز مٹائی اور بلال حبشیؓ، فاروقؓ وابوذرؓ کا ہمسر ہو گیا۔ خدا پر راسخ عقیدہ رکھنے والے خوف اور نفسیاتی پیچیدگیوں سے بری ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کو خدا نے اور اس کے رسولؐ نے ''لاتحزن'' کی تعلیم دی ہے۔ اور نصب العین'' لا خوف علیهم و لا هم يحزنون '' قرار دیا ہے کیونکہ خدا سے ڈرنے والا کسی اور چیز سے نہیں ڈرتا انسان کو ہر قسم کے خوف اور حوادث سے نجات دلوا سکتا ہے۔

عشق را آتش زن اندیشہ کن | روبہ حق باش و شیری پیشہ کن
خوف حق عنوان ایمان است و بس | خوف غیر از شرک پنہان است و بس

جس طرح عقیدہ توحید وحدت آفریں ہے۔ اسی طرح رسالت کا بھی یہی مقصد ہے کہ ہزارہا انسان ایک عدل عام اور رحمت عامہ کی سلک میں منسلک ہو جائیں۔

از رسالت در جہاں تکوین ما | از رسالت دین ما آئین ما
از رسالت صد ہزار ما یک است | جزو ما از جزو ما لاینفک است

رسالت کی بدولت لاتعداد انسان ہم نوا اور ہم مدعا ہو جاتے ہیں۔ رسالت کا خاتمہ حضرت محمد ﷺ پر ہوا امت مسلمہ بھی خاتم الامم ہے۔ اس کے علاوہ جو امتیں قائم ہوں گی۔ وہ آئین فطرت کے خلاف ہوں گی۔ ان میں سے کسی کو بقا حاصل نہیں ہو سکتی حق کے مقابلے میں باطل کی عمر نہایت قلیل ہوتی ہے۔

لانبی بعدی ز احسان خدا ست | پردۂ ناموس دین مصطفیٰ است
قوم را سرمایۂ قوت ازو | حفظ سر وحدت ملت ازو

دل ز غیر اللہ مسلماں می کند   نعرۂ لا قوم بعدی می زند

اس عقیدے کی نسبت پروفیسر نکلسن نے یہ اعتراض کیا کہ تمام بنی نوع انسان مسلمان نہیں۔ مسلمانوں کی باہمی اخوت رنگ و نسل، وطن سے بالاتر سہی۔ لیکن دنیا کی کثیر آبادی تو ان سے باہر ہے۔ اس لیے اسلامی اخوت عالمگیر تو نہ ہوئی لیکن اقبال نے اس کے جواب میں اپنا پختہ یقین ظاہر کیا۔ کہ میرے نزدیک امتِ محمدیہ کا خاص مشن بھی ہے کہ وہ عالمگیر اخوت کے اصول کو عملی جامہ پہنائے۔ چنانچہ 'رموزِ بے خودی' میں ''در معنی ایں کہ مقصود رسالت محمدیہ تشکیل و تاسیس حریت و مساوات بنی نوع آدم است''۔ کے عنوان کے تحت اقبال نے یہ وضاحت کی ہے کہ اسلام کا پیغام تمام نوعِ انسانی کے لئے آزادی اور برابری کا پیغام ہے۔ اسلام نے ''کل مومن اخوۃ'' کہا۔ اسی نے تمام نوعِ انسانی کی وحدت کی حقیقت کا بھی انکشاف کیا کہ تمام انسان، مرد و زن، گورے کالے، امیر و غریب ایک نفس واحد کے اعضاء ہیں۔ آپ نے تاریخ اسلام سے مساوات کی کچھ مثالیں بھی پیش کیں ہیں۔ جن میں سلطان مراد اور معمار کا قصہ خوبصورت پیرایہ میں بیان کیا ہے:

عبد مسلم کمتر از احرار نیست   خون شہ رنگیں تر از معمار نیست

حریت کی مثال میں اقبال نے ام الشہدا حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے جگر گداز واقعے کو نظم کیا ہے۔ اسلام نے شہنشاہی اور سلطانی کا خاتمہ کر کے انسانوں کی حریت کو محفوظ کیا تھا۔ کیوں کہ مطلق العنان سلطانی جو عادل و ظالم، عاقل و احمق کو ورثے میں ملتی رہی ہے۔ ہر قسم کے استبداد کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ حضرت امام حسینؓ نے استبداد کی سیاست کے خلاف حق کا علم بلند کیا اور حریت کی حفاظت میں اپنی اور اہل و عیال کی جانیں قربان کر دیں۔ دنیا ہمیشہ خیر و شر کی قوتوں کا میدان کارزار رہی ہے۔ موسیٰ و فرعون اور حسین و یزید دو مخالف قوتوں کے نمائندے ہیں۔ خلافت کو سلطنت بنا دینا گویا موسیٰ کے خلاف فرعون کی حمایت کے مترادف تھا۔ حریت کا علم بردار اٹھا اور قیامت تک کے لئے ظلم کا خاتمہ کر دیا۔

برزمین کربلا بارید و رفت لالہ در ویرانہ ہا کارید و رفت
تا قیامت قطع استبداد کرد موج خون او چمن ایجاد کرد
ماسوا اللہ مسلماں بندہ نیست پیش فرعونے سرش افگندہ نیست

علامہ اقبال نے اپنی شاعری کے آغاز میں وطنیت کے ترانے الاپے مگر جلد ہی وطن پرستی کے اس بت کو توڑ ڈالا اور وحدت ملت کے افکار کو پیش کیا۔ 'رموز بے خودی' میں بھی اس مضمون کو پیش کیا ہے۔ انہوں نے ملت اسلامیہ کو ابدی قرار دیا ہے۔ کیونکہ اس کے اصول فطرت کے اصول ہیں۔ تمام بنی نوع انسان کی وحدت کی تعلیم قرآن میں موجود ہے کہ سب انسان ایک نفس واحدہ سے سرزد ہوئے ہیں۔ گویا عالم نوع انسان ایک جسم ہے اور مختلف افراد اس کے اعضاء ہیں۔ اقبال کی نظر میں اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح کا ہی داعی نہیں بلکہ عالم بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے۔ جو انسان کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔ مغرب کی قومیت پروری اور وطن پرستی نے جغرافیائی حدود کے اِدھر اور اُدھر رہنے والوں کو ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنا دیا۔ اقبال اب مجلسِ اقوام بنا کر اس مہلک بیماری کا علاج کرنا چاہتے ہیں۔

آں چناں قطع اخوت کردہ اند بر وطن تعمیر ملت کردہ اند
مردمی اندر جہاں افسانہ شد آدمی از آدمی بیگانہ شد
حافظ رمز اخوت مادراں قوت قرآن و ملت مادراں

اقبال دنیا بھر کی عورتوں کو دختر رسولؐ حضرت بی بی فاطمۃ الزہراؓ کی شخصیت اور کردار کو کامل قرار دیتے ہوئے ان کی پیروی کی دعوت دیتے ہیں۔ خاص طور پر مسلمان عورتوں کے لئے اسوۂ کاملہ حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی ذات گرامی ہے۔ عیسوی دنیا حضرت مریم طاہرہ وصدیقہ کی پرستش کرتی ہے۔ لیکن اقبال کے نزدیک بی بی مریم کا بھی بڑا احترام ہے۔ کیونکہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسے

جلیل القدر نبی کی والدہ ہیں۔ اور ان کی عفت کا خدا شاہد ہے۔ لیکن حضرت فاطمۃ الزہراؓ تین بلند پایہ نسبتوں کا مرکز ہیں۔ ایک عظیم الشان نبی کی بیٹی، حضرت علیؓ جیسے عظیم انسان کی بیوی اور امام الشہدا حضرت امام حسینؓ کی ماں۔ تمام دنیا کی تاریخ ٹٹولیے اس قسم کی تین نسبتیں ایک عورت میں کبھی جمع نہ پائیں گے۔ اور آپ کا ذاتی کردار اور شخصیت کی خوبیاں ان گنت ہیں۔ حضرت امام حسینؓ کی حریت سرچشمہ اخلاق پدر بھی ہے اور اخلاق مادر بھی۔ لیکن ماں کی سیرت فرزند میں زیادہ موثر ہوتی ہے۔ اس لئے کہ بیداری شعور سے پہلے اس کے اثرات تحت الشعور میں مرتسم ہو جاتے ہیں۔ حضرت فاطمہؓ ایک محتاج یہودی کی مدد کے لئے اپنی چادر فروخت کر ڈالتی ہیں۔ عرب کے شہنشاہ کی بیٹی ہیں۔ لیکن کوئی خدمت گار نہیں قرآن کی آیات دہراتی ہوئی چکی پیستی ہیں۔ آپ صبر و رضا کی پیکر ہیں۔ آپ کے آنسو جو خوف خدا میں بہتے تھے۔ ان سے آپ کا دامن نماز بھیگا رہتا تھا۔ صدق و صفا کا جوہر تھیں۔ عشق خدا اور عشق رسولؐ میں کامل تھیں۔

مریم از یک نسبت عیسیٰ عزیز	از سہ نسبت حضرت زہراؑ عزیز
نور چشم رحمۃ اللعالمیں	آن امامؑ اولین و آخریں
آنکہ جاں در پیکر گیتی دمید	روزگار تازہ آئین آفرید
بانوئے آں تاجدار ہل اتیٰ	مرتضیٰ مشکل کشا شیر خدا
پادشاہ و کلبہ ئی ایوان او	یک حسام و یک زرہ سامان او
مادران مرکز پر کار عشق	مادران کارواں سالار عشق

مثنوی رموز بے خودی جیسی بے مثل نظم لکھ کر اقبال نے اپنے مومن ہونے کا حق ادا کر دیا۔ ان کا پیغام سراپا عمل ہے۔ کاش مسلمان علامہ کے کلام پر عمل پیرا ہو جائیں اور ان تمام مسائل سے چھٹکارا حاصل کر لیں۔ جو دین سے روگردانی کے سبب ان کا مقدر بن رہے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ کلیات اقبال فارسی

۲۔ مثنوی رموزِ بے خودی

۳۔ فکرِ اقبال۔ مصنف ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

۴۔ اقبال سب کے لئے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری

۵۔ تصوراتِ اقبال۔ مصنف شاغل فخری

۶۔ روحِ اقبال۔ از ڈاکٹر یوسف حسین خاں

۷۔ برکاتِ اقبال۔ ڈاکٹر محمد ریاض

۸۔ اقبال کامل۔ از مولانا عبدالسلام ندوی

۹۔ اقبال اور قرآن۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں

۱۰۔ قومی زندگی اور ملتِ بیضا پر ایک نظر۔ از علامہ محمد اقبال

۱۱۔ افکار و تصوراتِ اقبال۔ ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ منہاج الدین

۱۲۔ اقبال احوال و افکار۔ از ڈاکٹر عبارت بریلوی

غیر مطبوعہ / ترجیحاً تازہ نگارشات

(قلمی معاونین کی خدمت میں گذارش)

ہم اپنے معزز قلمی معاونین سے ملتمس ہیں کہ وہ "الاقرباء" کو صرف ایسی نگارشات نظم و نثر مرحمت فرمائیں جو غیر مطبوعہ اور ترجیحاً تازہ تخلیقات ہوں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم بعض ایسی نگارشات کو شائع نہیں کر سکے ہیں جن کی قبل ازیں اشاعت ہمارے علم میں آئی۔ بہر حال ہم شکر گزار ہوں گے اگر "الاقرباء" کے لئے ترسیلات پر "غیر مطبوعہ" کے الفاظ لکھ دیے جائیں۔ (ادارہ)

افسانہ

ڈاکٹر عاصی کرنالی

اونچی ٹہنی

چھوٹا قد، سیاہ رنگت، جو جوانی کے سبب ناگوار نہیں گزرتا تھا۔ پچیس چھبیس سال کی عمر، نام سیما..... کل تین بہنیں تھیں، سیما اُن میں بڑی تھی۔ چھوٹی بہنوں کی شادی کب کی ہو گئی تھی۔ سیما ابھی تک کنواری تھی۔ اس نے ایم اے کر لیا تھا۔ شاید فارسی یا اردو میں۔ کھاتا پیتا گھرانہ تھا۔ ذات پات کا امتیاز کوئی اچھی بات نہیں، تاہم یہ اونچی ذات کے لوگ تھے، ہوتا یوں ہے کہ بلکہ اسی بات کو اچھا سمجھا جاتا ہے کہ پہلے بڑوں کی شادی ہو، پھر چھوٹوں کی باری آئے۔ لیکن چھوٹی بہنیں لد چکی تھیں۔ بڑی بیٹھی تھی۔ رنگ رنگت بھی خداداد چیز ہے بعض گھرانوں میں چہرے ایسے چمکتے ہوئے جیسے مرکری بلب جل رہے ہیں اور بعض خاندانوں میں ایسے بجھے ہوئے جیسے کسی نے پھونک مار کر چراغ بجھا دیئے ہوں اور دھواں پھیل گیا ہو۔ دونوں چھوٹی بہنیں بھی رنگت کی سیاہ تھیں لیکن یک دوشیڈ کم تھے جب کہ سیما کے چہرے پر ایک دوشیڈ زیادہ سیاہی تھی۔ گویا قدرت نے اُدھر کی سیاہی بچا کر اِدھر لگا دی تھی، تا ہم جوانی بہت سے عیبوں کی پردہ پوش ہوتی ہے، پھر چھوٹے قد کے سبب بدن گدرایا ہوا، اس لئے یہ سب کچھ اتنا ناگوار نہ گزرتا تھا۔ سیما کے کنوار پن کا یہ سبب نہ تھا کہ پیغام نہیں آئے تھے بلکہ جب بھی کہیں سے کوئی مانگ آتی، نتیجہ انکار ہوتا۔ ماں باپ کی رضا مندی اور خواہش کے باوجود سیما کی جانب سے صاف انکار۔ ...... پانچ چھ سال اسی صورت حال میں گزر گئے تھے، انکار کا تسلسل جاری تھا۔ عمر انیس بیس سے پھسل کر پچیس چھبیس کے پیٹے میں آ گئی تھی، لیکن انکار کا پتھر راستہ نہ دیتا تھا۔ لڑکی کی شادی بیاہ کے لئے ایک خاص عمر ویسے ہی ضروری ہے لیکن سیما کو اس کا احساس نہ تھا جب کہ اُس کے ماں باپ اس کے دبے پاؤں گزرتی جوانی کے اندیشے سے بوجھل تھے۔

میں اُن لوگوں کا پڑوسی تھا۔ ہمارا گھر دوسری قریبی گلی میں تھا اور چالیس گھروں کی تعداد

سے پہلے واقع تھا۔ دونوں گھرانوں میں میل جول تھا۔ ہمارے گھر میں تھا ہی کون۔ میری ماں اور ایک میری پھپھی جو بیوگی کے بعد ہمارے ہی گھر میں رہ پڑی تھی۔ سیما کے گھر میں بھی دونوں بہنوں کے رخصت ہو جانے کے بعد وہ تھی یا اس کے ماں باپ یا رشتے کی ایک خالہ اور اس کا شوہر جو اکثر بیمار رہتا۔ سیما کے گھر میں وہی زیادہ پڑھی لکھی تھی۔ ادھر مجھے بھی بی اے تک پڑھ لینے کے بعد زیادہ ہی پڑھا لکھا سمجھ لیا گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم مجھ میں اور سیما میں قدر مشترک بن گیا۔ اس لئے میں بھی کبھار اس کے پاس جا بیٹھتا تھا۔ یا وہ ہمارے گھر آتی جاتی تھی۔ اور ہم دونوں مختلف موضوعات پر الجھتے رہتے تھے۔ وہ اکثر ہار جاتی تھی لیکن ہار نہ مانتی تھی۔

.... دو سال سے پیغام آنے بند ہو گئے تھے۔ لیکن ایک دن اچانک کچھ عورتیں پیغام لے کر آنکلیں.... زمیندار گھرانہ تھا۔ لڑکے کی پہلی بیوی مر چکی تھی۔ دوسری کرنا چاہتا تھا..... عمر پینتالیس سال..... سیما نے انکار کر دیا۔ اُسی شام کو اس کی ماں نے مجھے بلایا اور اپنا سارا دکھ میرے سامنے انڈیل دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ مجھے سیما کی روش پر بے حد غصہ آیا۔ اسے گھر والوں کی تکلیف کا ذرا بھی احساس نہیں۔ یہ پیغام بھی کتنے عرصے کے بعد آیا ہے۔ نہ جانے پھر کوئی ادھر کا رخ کرے یا نہیں۔

اگلے دن میں سیما سے ملا اور اس پر برس پڑا۔

''تم شادی کیوں نہیں کرتیں؟ تم آخر گھر والوں کے دل کا بوجھ کیوں بنی بیٹھی ہو؟''

وہ بھی پھٹ پڑی۔ ''جب تک میری شرط پوری نہ ہو گی۔ میں ہرگز شادی نہ کروں گی۔''

''کیا ہے تمہاری شرط؟''

''صرف ایک شرط۔ لڑکا حسین ہو، بے حد حسین''

''کیا تم حسن کو چاٹو گی؟ اگر وہ جاہل ہو۔ علم سے کورا ہو؟''

''کوئی پرواہ نہیں۔ میں اسے پڑھا لوں گی''

''اگر وہ غریب ہو اور دو وقت کی روٹی بھی نہ کھلا سکتا ہو؟''

''میں خود خوش حال ہوں۔ پیسے والی ہوں۔ صرف حسن کی شرط۔ بے حد حسین، بے

انداز و حسین''

''یہ جو کل رشتہ آیا ہے، اس لڑکے کو دیکھا تم نے؟''

''ہونہہ لڑکا! دوسری بیوی کرنے چلا ہے اور لڑکا''

''بعض لوگ بڑی عمر میں بھی حسین ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے.........''

''یہ نہیں ہو سکتا'' اس نے میری بات کاٹ دی۔ ''یہ بڑی عمر کا آدمی ہے اس کا حسن خرچ ہو چکا ہے''

''دیکھو سیما''...... میں سنجیدہ ہو چلا تھا۔ ''اس شاخ کی طرف ہاتھ نہ بڑھاؤ جو تمہارے قد سے بہت اونچی ہو، پھر حسن جلد مٹنے والی شے ہے۔ صابن کے جھاگ کتنے شفاف ہوتے ہیں۔ لیکن کتنے جلدی مٹ جاتے ہیں۔ صبح کا وقت کیسا روشن ہوتا ہے، لیکن کتنا ناپائیدار ہوتا ہے، بہار کا موسم پھول کی رنگت، شبنم کی دمک، شفق کی لالی، یہ سب حسن ہے لیکن کتنی دیر کا نظارہ ہے۔ پلک جھپکنے میں غائب...... اور پھر ایک بات اور کہوں؟''

''کہو بلکہ بکو''......... اس نے جھلا کر کہا۔

''ہمیں کسی طلب سے پہلے اپنے استحقاق کو بھی دیکھنا چاہئے''

''میں سمجھی نہیں''

''میرا مطلب یہ ہے کہ فرض کرو کہ میرا رنگ سانولا ہے تو مجھے کیا حق پہنچتا ہے کہ میں نہایت حسین عورت کا انتخاب کروں۔ مجھے اپنی حد سے..........''

''بند کرو یہ بکواس۔ تم دلوں کی خوبصورتی کو نہیں مانتے۔ تم میرے رنگ پر طنز کر رہے ہو۔ میرا حسن میرے دل میں ہے اور میں اسی کے مطالبے پر ایک نہایت حسین ساتھی کی طلب میں حق بجانب ہوں۔''

''شاید طلب.........'' میں بات کہتے کہتے خود رک گیا۔

''تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''کچھ نہیں''

''میں کچھ کہنا چاہتی ہوں'' . . . . وہ اچانک کرسی سے اٹھی اور اس نے میرے پاؤں پکڑ لئے ...... ''تمہارا ایک دوست ہے'' .... سیما کی آنکھوں میں ایک ایسی چمک تھی جس میں جذبے کی شدت کے ساتھ وحشت کی آمیزش بھی تھی۔

''تم اگر چاہو تو اس سے بات کرو۔ تمہیں بات کرنی پڑے گی ورنہ میں تمہیں جان سے مار دوں گی۔''

''اس کا نام کیا ہے؟''

وہ میرے پاؤں چھوڑ کر اپنی کرسی پر جا بیٹھی۔

''شہزاد''

میں شہزاد کا نام سن کر اس طرح اچھلا جیسے کسی بچھو نے مجھے ڈنگ مار دیا ہو۔ اس قدر حسین نوجوان جیسے آسمان سے چاند کا کوئی ٹکڑا ٹوٹ کر زمین پر آ گرا ہو۔ بحث فضول تھی۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

''میں کوشش کروں گا'' اور بوجھل قدموں سے لوٹ آیا۔

میں نے دو دن بعد شہزاد سے بات کی۔ اس نے کہا۔ ''کیسی ہے؟''

میں نے مختصراً کہہ دیا۔ ''لڑکی اچھی ہے کیوں کہ لڑکیاں اچھی ہی ہوتی ہیں''

اس نے کہا۔ ''میں دیکھنا چاہتا ہوں'' .... میں نے سیما سے کہہ دیا۔ وہ آمادہ ہو گئی۔ اگلی شام مقرر ہو گئی۔ کیوں کہ اس وقت اس کے گھر والے کسی تقریب میں مدعو تھے۔ اس نے پلان بنائی کہ وہ دردِ سر کا بہانہ بنا کر گھر رہ جائے گی۔ تم شہزاد کو لے آنا۔ میں گھر آ گیا ....!

اگلی شام میں شہزاد کو لے کر جا پہنچا۔ بیٹھک کو نہایت سلیقے سے سجایا گیا تھا۔ گل دانوں میں تازہ پھول، اگر بتیاں جل رہی تھیں۔ کمرے کی فضا دل و دماغ پر ایک نشہ طاری کئے دیتی تھی۔ دس پندرہ منٹ بعد سیما آ گئی۔ میں نے اسے دیکھا، دیکھتا ہی رہ گیا۔ بھڑکیلی شوخ رنگ کی ساڑھی، چہرے پر اتنا زبردست میک اپ کہ تمام سیاہی غائب۔ ہونٹوں پر گہری سرخ لپ سٹک۔ بالوں کی ایک لٹ ارادتاً پیشانی پر چھوڑی ہوئی۔ شہزاد نے اسے بھرپور نظر سے دیکھا اور جب تک بیٹھا رہا۔

وقفے وقفے سے دیکھتا رہا۔ باتیں ہوتی رہیں۔ چائے، پھل، مٹھائی سب کچھ چلتا رہا۔ گرمی کا موسم تھا۔ اچانک بجلی چلی گئی۔ برقی پنکھا رک گیا۔ پانچ منٹ بعد بجلی آئی۔ ......ہم سب پسینے میں نہا گئے۔ سیما کے چہرے سے پسینہ یوں ٹپک رہا تھا جیسے بوندوں کی دھاریں۔ سارا میک اپ بہہ گیا اور اصلی چہرہ نکل آیا۔ سیما کو اچانک اس کمی کا احساس ہوا۔ اس نے گھر میں جانے کی اجازت چاہی۔ شہزاد نے کہا۔

''ہمیں بھی اجازت دیجئے۔ ایک ضروری کام ہے'' ....اور ہم اس پر تکلف چائے کا شکریہ ادا کرکے چلے آئے۔

شہزاد نے انکار کر دیا بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ کیا میرے مقدر میں چڑیلیں اور بھتنیاں ہی رہ گئی ہیں۔...... اگلے دن میں نے سیما سے کہہ دیا کہ قصہ یہ ہے کہ شہزاد کی پہلے ہی منگنی ہو چکی ہے۔ شاید سیما نے میرے چہرے پر سفید جھوٹ کی تحریر پڑھ لی۔ اس نے وحشت آمیز لہجے میں کہا۔ ''کوئی بات نہیں۔ میں زمانے سے اپنا حق چھین کر رہوں گی'' ......!

اس واقعے سے کچھ عرصے بعد میرا تبادلہ دوسرے شہر میں ہو گیا، پھر تیسرے شہر میں اور دیکھتے ہی دیکھتے وقت کی کتاب کے پندرہ صفحے پلٹ گئے۔ ایک دن ڈاک میں سیما کا خط آیا۔

''فوراً آ جاؤ۔ مجھے تمہاری سخت ضرورت ہے'' ..... میں اسی شام ریل سے اس کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے اسے دیکھا۔ وہ پہلے سے کتنی مختلف ہو گئی تھی۔ اب وہ چالیس برس کی تھی۔ خزاں باغ کے آنگن میں داخل ہو چکی تھی۔ جسم کی کشش اور چہرے کا بھراؤ اپنی جگہ چھوڑ چکے تھے۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

''ایک کوشش اور، بس ایک کوشش''

''میں نہیں سمجھا''

''ایک لڑکا مجھے پسند آ گیا ہے۔ اتنا حسین جیسے'' ......وہ تشبیہ مکمل نہ کر سکی۔.... ''تم خدا کے لئے ایک بار مجھ سے اور تعاون کرو۔ ثواب کا کام ہے''

میں نے اس سے کوئی بحث نہ کی۔ ظاہر ہے، وہ اپنی شرط، اپنے معیار سے دست کش نہ

ہوئی تھی............!

''اس کا نام سلمان ہے۔ ہمارے یہاں آتا جاتا رہتا ہے۔ مجھے دیکھتا ہے تو دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔''

''اس کی نظروں سے تم کیا اندازہ کرتی ہو؟''

''یہی کہ وہ مجھے LIKE کرتا ہے۔ بے حد LIKE''

''پھر تم خود کیوں نہیں کہہ دیتیں؟''

''ہمارے معاشرے میں لڑکیاں خود کہہ سکتی ہیں؟''

.........میں لاجواب ہوگیا۔ میں نے اس لڑکے کا پتہ لیا۔ وہ مقامی کالج کے ایک ہاسٹل میں مقیم تھا۔ میں وہاں پہنچا میں نے اسے دیکھا۔ میری آنکھیں چکاچوند ہوگئیں' قدرت نے ایسے حسین چہرے کم ہی بنائے ہوں گے۔ لیکن جس بات سے میں حیرت زدہ رہ گیا بلکہ خوف زدہ ہوگیا، وہ یہ تھی کہ وہ کسی طرح بھی بیس سال سے زیادہ نہ ہوگا۔ بیس سال اور چالیس سال کی عمر کا فرق۔ میرا ذہن الجھ کر رہ گیا.........!

''تشریف رکھیے ......'' ایک ملکوتی آواز کا نغمہ بکھر گیا۔

میں نے اپنا تعارف کرایا اور جھوٹ موٹ کہہ دیا۔ ''میں سیما کا چچازاد بھائی ہوں، یہاں نہیں رہتا۔ تم سے ایک بات کہنے آیا ہوں''

''کہیئے'' اس نے بے حد مودب لہجے میں کہا۔

''کیا تم سیما سے شادی کرسکتے ہو؟''

''میں؟ .... میں تو انہیں اپنی امی سمجھتا ہوں۔ میری مرحوم امی کی کتنی جھلک ہے اُن میں''

بات ختم ہو چکی تھی۔ میں مناسب انداز میں اجازت لے کر آ گیا۔

میرے دل میں مختلف جذبوں کا ہجوم تھا۔ میں اس کے گھر گیا۔ میں نے کسی تمہید کے بغیر بات کہہ دی۔

''وہ تمہیں ماں سمجھتا ہے اور ہاں شہزاد نے بھی تمہیں ریجیکٹ کر دیا تھا۔ اور تمہیں چڑیل کہا تھا۔ تم نے ایک ضد کے پیچھے اپنی جوانی گزار دی۔ ایک موہوم جذبے کے پیچھے۔ تم ہواؤں کی لہروں کو مٹھی میں تھامنا چاہتی تھیں۔ ستارے اپنے آنچل میں بھرنا چاہتی تھیں۔ حُسن، حُسن۔ کبھی اپنے چہرے کو آئینے میں ٹھنڈے دل سے دیکھو اپنی حد میں رہو۔''

.........میں سب کچھ کہے جا رہا تھا۔ مجھے اپنے جذبات، اپنے لفظوں پر قابو نہ تھا۔

''کیا میں اتنی بدصورت ہوں؟''

''ہاں! انتہائی بدصورت، بالکل میری طرح۔ میں نے بھی زندگی میں یہی غلطی کی تھی۔ ایک حسین ترین عورت کی آرزو، جو مجھے نہ مل سکی۔''

وہ ایک دم چونکی۔ اس نے اپنی نظریں مجھ پر گاڑ دیں۔

''کیا تم بدصورت ہو؟''

''ہاں تمہاری طرح''

''کیا وہ بدصورتیاں مل کر ایک حُسن نہیں بن سکتیں؟''

وہ آگے بڑھی...... اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور اس کی لٹ اس کے ماتھے پر گرا دی۔

انشائیہ

ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی

جھوٹ

جھوٹ ایک انتہائی دلچسپ فن ہے۔ اس میں فلسفیانہ پہلو بھی ہوتے ہیں، عام تجربہ یہ ہے کہ ننانوے فیصد لوگ کسی نہ کسی اسٹیج پر جھوٹ بولتے رہیں اور جو ایک فی صد رہ جاتا ہے وہ بھی جھوٹا ہے۔

جھوٹ بولنے والے باوضع لیکن مکار ہوتے ہیں، ان کا ذہن رواں ہوتا ہے وہ یہی سوچتے رہتے ہیں اس بات کا ردعمل یہ ہوسکتا ہے اور اس کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے۔ جھوٹ کے لئے وقت اور موقع محل کی ضرورت بھی نہیں جب چاہیں بولیں، بس جھوٹ بولنے والے کا حاضر جواب ہونا شرط ہے۔

جھوٹ بولنا حد درجہ ذہانت اور کمال کا کام ہے۔ سیاست دانوں کے جتنی فتوز سے مدد لی جا سکتی ہے بعض اوقات جھوٹے اس میں بھی اپنی ضرورت کے مطابق ترمیم کر لیتے ہیں۔ جھوٹ بولنا خواہ وہ کسی معیار اور درجہ کا ہو حیران اور دنگ کرنے کا فن ہے۔ جھوٹے کو چالاکی اور سفاکی سے بات کرنے کا گر آنا چاہئے اس لئے کہ ایک جھوٹ کو چھپانے کے لئے جو مزید جھوٹ بولنے پڑتے ہیں وہ بڑی ہی مہارت کا کام ہے۔ شک وشبہ کی ہر بات پر پردہ ڈالنا جان جوکھم کا کام ہے۔ بعض اوقات یہ مقابلہ دور تک چلتا ہے جب جھوٹا جیت جاتا ہے تو خود کو اپنی ذہانت کی داد دیتا ہے۔

افواہ جھوٹ کی ایک اعلیٰ قسم ہے۔ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے لیکن وہ بجلی سے زیادہ تیز دوڑتا ہے بلکہ اُڑتا ہے۔ جھوٹا احساس کمتری کا شکار ہوتا ہے، اس کا جھوٹ اس کی کسی نہ کسی محرومی کا مرہون منت ہوسکتا ہے۔ دوسروں کے دل کو دکھ دینا یقین کی دولت کو لوٹنا شخصیت کو مجروح کرنا جھوٹے کی مہارت میں شامل ہے۔ جھوٹا جھوٹ کے جوڑ سے جوڑ ملاتا چلا جاتا ہے اور کسی بڑے منافع کی توقع رکھتا ہے یہ اس کے اندر کی کیفیت ہوتی ہے۔ بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں جنہیں ہم سنجیدگی سے نہیں لیتے بچوں کے ذہن پر بری طرح اثر انداز ہوتی ہیں اور ایک وقت ایسا آتا ہے

جب انہیں جھوٹ میں ہی تصور کیا جاتا ہے۔ جھوٹ بولنا آہستہ آہستہ عادت کا درجہ اختیار کر لیتا ہے۔
غلط بیانی جھوٹ بولنے کی ایک اور قبیح صورت ہے اس میں کینہ، کدورت، بدنیتی کا عمل بھی شامل ہو جاتا ہے۔ یہاں جھوٹ کو جھوٹ سے رد کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔

اس سلسلے میں وکیلوں کا بھی ایک واضح کردار ہے وہ ساری بات کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اس جھوٹ یا بہتان سے انسانیت کس طرح مجروح ہوتی ہے۔ ان کا بڑا ہنر یہ ہوتا ہے کہ جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ ثابت کر کے اپنا محنتانہ وصول کریں۔ سیاست دان جھوٹ بولتا ہے اور ڈنکے کی چوٹ پر بولتا ہے۔ حکومتیں مسلسل جھوٹ بولتی ہیں بلکہ اس کے لئے خصوصی اہتمام کرتی ہیں اور مصلحت کا نام دیتی ہیں۔ ذاتی مفاد کی خاطر کچھ سے کچھ کر دیا جاتا ہے ان کی بات جھوٹ سے شروع ہو کر جھوٹ پر ہی ختم ہوتی ہے۔

جھوٹ بولنے والا اپنے عمل کو زندگی کا معمول سمجھتا ہے تھوڑی دیر کا ہنسی مذاق اور بس جھوٹ کی ہر بات میں چاشنی ہوتی ہے۔ یہ چاشنی اتنی تیز ہوتی ہے کہ جھوٹ بولنے والا نشے میں چور ہو جاتا ہے۔ سچ بولنے والا لاکھ منہ بنائے کیا ہوتا ہے۔

جھوٹ کی ایک بڑی خاصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ جلد دلوں میں مقام بنا لیتا ہے۔ شاعر بھی جی بھر کے جھوٹ بولتے ہیں اور بڑے دھڑلے سے بولتے ہیں۔ اس کا نام انہوں نے شاعرانہ خیال رکھ لیا ہے۔ ان کی پیش کردہ تشبیہات ایسی ہوتی ہیں جن کا حقیقی زندگی سے تعلق برائے نام ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں تشبیہ تو تشبیہ ہی ہوتی ہے اصل چیز تو نہیں چنانچہ اس بات کی اجازت شاعروں نے خود سے حاصل کر لی ہے۔ محبوب کی گردن اگر صراحی دار مان بھی لی جائے تو محبوب کا عجوبہ ہونا شرط ہوگا۔

اداکاری جھوٹ کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اداکاری جھوٹ کی انتہا ہوتی ہے۔ ساری باتیں فرضی ہوتی ہیں۔ بیوی، شوہر، بہن، بھائی فرضی اور جھوٹے ہوتے ہیں۔ لیکن انہیں اسی انداز سے پیش کیا جاتا ہے۔ کہ سچ کا گمان ہوتا ہے۔ اداکار جس قدر بھی اپنی شخصیت کو مسخ کر سکتا ہے کرتا ہے، دوسرے کی شخصیت کو خود پر مسلط کر لیتا ہے۔

جھوٹ بولنے والا کبھی دل کی گہرائیوں سے خوش نہیں ہوتا۔ ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے کہ

کسی کو سچ بات کا علم ہو گیا تو کیا ہوگا۔ کرکری ہو جائے گی۔ جھوٹ کی بھی کوئی حد ہوگی اس کے بھی آداب ہوں گے۔ جب سرحد ختم ہو جاتی ہے تو طوائف الملوکی جنم لیتی ہے، بے یقینی بے زاری کا دور دورہ ہوتا ہے ہر بات پر سے اعتبار اٹھ جاتا ہے۔

جھوٹ پر کسی کا بھی اجارہ نہیں جتنا چاہیں اور جب چاہیں جھوٹ بولیں، سچ تول تول کر بولا جاتا ہے۔ سونگھ سونگھ کر بولا جاتا ہے۔ سچ کو پرکھنے کے کڑے سے کڑے اصول ہوتے ہیں جبکہ جھوٹ میں لفاظی سے بھی کام چل جاتا ہے۔ اب ترقی کا زمانہ ہے۔ سائنسی ذرائع نے ہزار ہا آسانیاں بہم پہنچادی ہیں۔ اعلیٰ سے اعلیٰ جھوٹ بولا جا سکتا ہے۔ سونے پہ سہاگہ یہ ہے کہ ایک سال میں ایک دن مقرر کرلیا گیا ہے یعنی یکم اپریل کو جھوٹ، اور جھوٹ بولنے والے کے لیے درگزر کا دن ہے۔ اس دن کچھ مواخذہ نہیں ہوگا اس دن کوئی کسی کی سچی بات پر یقین نہیں کرتا، ہر جھوٹ مذاق کے کھاتے میں ڈال دیا جاتا ہے۔

قارئین کرام کی اطلاع کے لئے

ہم یہ اعلان کر چکے ہیں کہ سہ ماہی ''الاقرباء'' کی ویب سائٹ کا اجراء کیا جا چکا ہے۔ جس پر مجلہ ہذا کے آغاز سے اب تک، تمام شماروں کے مندرجات کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ اندرون ملک و بیرون ملک سے بعض قارئین کو ''الاقرباء'' کی عدم دستیابی کی شکایت ہے، لہٰذا قارئین کرام ویب سائٹ سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ (ادارہ)

www.alaqreba.com

افسانہ

نعیم فاطمہ علوی

پیدائشی ملزم

صاف شفاف ٹھنڈے پانیوں کے چشمے، آبشاروں کے شور اور مختلف پھلوں پھولوں کے درختوں کی خوشبو کے بیچ اس نے ہوش سنبھالا۔ اس الہڑ دوشیزہ کے معصوم چہرے پر سادگی، حسن، معصومیت اور بے فکرا پن، وہ اپنے اسی فطری حسن سے مالا مال گاؤں میں ہنستی کھیلتی کسی ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرتی قہقہے لگاتی بھاگتی پھرتی تو پورے گاؤں میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔

وہ اپنے فطری اور بے مثل حسن سے بیگانہ تھی بچپن سے جوانی میں کب قدم رکھا تو اسے پتہ ہی نہیں چلا۔ بس اتنا ہوا کہ اس کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا۔ پہلے وہ جن جنگلوں اور خود رو پودوں میں اپنے ننھے منے پاؤں سے رستے بناتی کھیلتی کودتی یا پھر کسی بڑے کے ساتھ بکریوں کے ریوڑ کو چراتی، بکریوں کے ارد گرد گھومتی رہتی تھی۔ اب ان جنگلوں سے اسے سوکھی لکڑیاں جمع کر کے واپس اپنے گھر بھی لانی ہوتی تھیں۔ اور گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹانا پڑتا تھا۔ وہ کسی امیر گھرانے میں تو پیدا ہوئی نہیں تھی۔ جو سارے کام خود بخود ہی ہو جاتے۔ اسے تو ٹھنڈے پانی کے چشموں سے مٹکے بھر کر پانی لانا پڑتا اور پھر ندی پر جا کر سارے گھر کے کپڑے دھونے پڑتے۔ گیلی سوکھی لکڑیوں سے آگ جلا کر کھانا پکانے میں اپنی ماں کی مدد بھی کرنا پڑتی۔ وہ ان تمام کاموں کو ہنستے کھیلتے ہی کر لیتی۔ چشموں سے پانی لانا، جنگل سے لکڑیاں لانا یہ سب کام اس کے کھیل کود کا حصہ ہی تھے۔ یونہی ہنستے کھیلتے زندگی گزر رہی تھی مگر اچانک اس کے ساتھ ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ دن تو ویسا ہی تھا حالات و مناظر بھی نہیں بدلے تھے۔ سورج کی کرنیں اپنی لاکھ کوشش کے باوجود گھنے درختوں کے سایوں میں اٹک کر رہ جاتیں۔ وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی گھنے درختوں سے لکڑیاں چن چن کر ایک جگہ جمع کر رہی تھی کہ اچانک ایک بھیڑیا نہ جانے کب سے گھات لگائے بیٹھا تھا اچانک نمودار ہوا اور وہ

ڈری سہمی۔ چیخی مگر اس کی یہ چیخ و پکار اس جنگل میں گم ہو کر رہ گئی۔ اس کے ساتھ پروان چڑھنے والے یہ خودرو پودے اس کے دشمن ہو گئے تھے۔ سب نے مل کر چپ سادھ لی تھی وہ کس سے شکایت کرتی۔ وہ ایسے شخص کے جبر کا شکار ہو گئی تھی جس سے اسے نہ محبت تھی اور نہ ہی نفرت۔ وہ تو اسے ٹھیک طرح سے جانتی بھی نہیں تھی۔ ہاں مگر پہچانتی ضرور تھی۔ مگر پہچاننا کافی نہیں تھا۔ کیونکہ وہ اس کا نام سرعام نہیں لے سکتی تھی۔

ٹھنڈی ہوا کے جھونکے پتوں کی سرسراہٹ اور پودوں کی لہلہاہٹ سب نے اس جرم کی پردہ پوشی کر کے مجرم کا ساتھ دیا۔ وہ بہت دیر حیران و پریشان بیٹھی روتی رہی اور آج وہ لکڑیاں اٹھائے بنا ہی گھر لوٹ آئی۔ ماں نے بیٹی کا پریشان چہرہ دیکھا تو حیران ہو گئی۔ بیٹی نے پیٹ کے درد کا بہانہ کیا اور چادر میں منہ چھپا کر دیر تک روتی رہی۔ یہ کیسا غم تھا کہ جس کا کوئی مداوا نہ تھا۔ وہ کسی کو بتا نہیں سکتی تھی۔ کسی کو رازدان نہیں بنا سکتی تھی۔ اور حتیٰ کہ اپنے آپ کو بھی بہلا نہیں سکتی تھی مگر وقت بہت بڑا مرہم ہے۔ دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں گزرنے لگے۔ وہ اپنے اندر آنے والی تبدیلیوں سے ناآشنا تھی۔ مگر ہونی تو ہو کر رہتی ہے چاہے آپ کی مرضی شامل ہو یا نہ ہو۔ اس کے ابھرتے ہوئے پیٹ کو دیکھ کر پہلے تو ماں نے وہم سمجھا مگر جب وہ آہستہ آہستہ زیادہ بڑھنے لگا تو کلیجہ تھام کر رہ گئی۔ بچی کو کمرے میں لے جا کر خوب مارا پیٹا۔ بالآخر جب تھک ہار گئی تو دونوں ماں بیٹیاں خوب روئیں۔ بیٹی ناکردہ گناہ کی سزا بھگت رہی تھی۔ اور ماں اپنی لاعلمی، بے خبری، مجبوری اور بے بسی کی۔ بات گھر کے مردوں تک پہنچی، مگر قصوروار صرف اور صرف وہ بچی ہی ٹھہری، پیار بھرے اور جاں نثار رشتوں کو نجانے کیا ہو گیا تھا۔ ہر ایک کی اس طرف اٹھنے والی نظر میں غم و غصہ کا طوفان تھا۔ ان کا دل چاہتا تھا کہ اسے زندہ دفن کر دیں۔ ماں نے آسمان کی طرف نظریں اٹھا کر جھولی بلند کی، اے اللہ اسے موت دے دے۔ مگر موت بھی تو اپنی مرضی سے نہیں آتی۔ اچانک اس ہنستے بستے گھر میں موت کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ کوئی بھی اونچی آواز میں بات نہیں کرتا تھا۔ ماں کو معلوم ہونے کے باوجود کہ اس کی پھول جیسی بچی پر ظلم کرنے والا کون تھا۔ شکایت نہیں کر سکتی تھی کیونکہ ظالم کے ہاتھ صاف تھے۔ اس ظلم کا ان کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا۔ کسی نے ظالم کو ظلم کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ مردوں کے بنائے ہوئے

اس معاشرے میں یہ کیسا دستور تھا کہ عورت کو اپنی بے گناہی ثابت کرنے کیلئے گواہ چاہیئے تھے۔ اس نے درگندہ نگاہوں سے ان پتوں، پھولوں، خودرو پودوں اور درختوں کو دیکھا، وہ اسی طرح مستی میں جھوم رہے تھے۔ کوئی بھی تو اس کی گواہی دینے کیلئے تیار نہ تھا۔ جب سارا عالم ہی اس کے خلاف تھا۔ تو اس نے خاموشی اختیار کرلی۔ اور اپنی گویائی پر خود ساختہ پہرے لگا دیئے۔ بات کسی طرح پورے گاؤں میں پھیل گئی۔ اور انہی میں سے کسی نے دشمنی نبھانے کا سنہری موقع سمجھتے ہوئے اگلے پچھلے تمام گلوں شکووں کا سہارا لے کر پولیس کو اطلاع کردی۔ پولیس لڑکی کو تھانے لے گئی، ذرا دھمکا کر نام پوچھا۔ وہ نام ایک ''شریف'' ''خاندان'' کے ''شریف'' لڑکے کا تھا۔ وہ خاندان چونکہ رئیس تھا۔ لہٰذا اگلے دن ہی پولیس نے چھوڑ دیا۔ اور لڑکی والوں کو شریف خاندان کے شریف لڑکے پر الزام کے جرم میں اور زیادہ ملعون کیا۔ وہ بیچارے زندہ درگور ہو کر رہ گئے۔ کسی کی ایک غلطی نے پورے خاندان کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا تھا۔ لڑکی پولیس کی تحویل میں چلی گئی۔ اور پولیس اسٹیشن کے ایک چھوٹے سے قید خانے میں ایک معصوم سے بچے نے جنم لیا۔ ایسا بچہ جسے پیدائش سے پہلے ہی ملعون قرار دیا جا چکا تھا۔ اور جس کے مرنے کی دعائیں مانگی جا رہی تھیں وہ بچہ جس نے قدرت کے بنائے ہوئے فطری عمل سے جنم لیا تھا۔ کتنا بدنصیب تھا کہ معاشرے اور پہلے سے جنم لینے والے لوگوں نے اس کیلئے کانٹوں کا بستر بچھایا۔ نفرت کا ماحول بنایا۔ زندگی اور دنیا کی بدصورت شکل پیش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔

ماں نے فطری جذبے سے مغلوب ہو کر خوبصورت بچے کو اپنے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ اس کے سینے سے چشمے پھوٹ پڑے اور بچہ ہمک ہمک کر زندہ رہنے کی فطری کاوش کے نتیجے میں شیر مادر سے تازہ دم ہوتا گیا۔ وہ کچھ دیر کیلئے بھول گئی کہ اس کے ساتھ کیا ہوا۔ اس کی وجہ سے اس کے پورے خاندان نے کس کس طرح سے اپنے آپ کو سلگایا اور جھلسایا۔ وہ تو بس اس فطرت کے شاہکار حسن کے مجسمے کو دیکھ رہی تھی۔ جس کے چہرے پر سادگی اور معصومیت کا بے پناہ نور تھا۔ اگر یہ ملعون ہے تو پھر اس کے چہرے پر یہ نور کیسا؟ وہ کچھ دیر کیلئے یہ تک بھول گئی کہ اس کے پیٹ سے جنم لینے والا بچہ جسے اس نے خون جگر سے پالا اور سینے سے پھوٹتے ہوئے چشموں سے سیراب کیا وہ بڑا ہو کر جب

اپنے باپ کا نام پوچھے گا۔ اور اسے خاموش پا کر قصور وار سمجھے گا تو وہ کیسے اپنی بے گناہی کا ثبوت دے گی۔ وہ کیا کہے گی۔ اور کہاں سے گواہ لائے گی۔ اور کیسے اس ہمکتے ہوئے اور بے بس اور بے گناہ بچے کو مطمئن کرے گی۔ کیا بچہ بھی اس کا دشمن ہو سکتا ہے؟ نہیں کبھی نہیں۔

ممتا کے دلفریب حسن نے انگڑائی لی اور وہ اپنے بچے کی محبت سے مغلوب ہو کر سب کچھ بھول گئی۔ تمام خیالات کو جھٹک کر اس نے بچے کو اپنی تخوڑا گود میں چھپا کر سینے سے لگا لیا۔ مجبوری اور بے بسی کے آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر اس معصوم اور خوبصورت بچے کو بھگونے لگے۔ سولہ سالہ ماں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ روئے یا ہنسے، یہ سزا ہے۔ یہ جزا وہ گنہگار ہے یا پارسا۔ اس نے ایک دفعہ پھر ایک موہوم سی امید کے سہارے کل کے اسی مرد کو پناہ کیلئے دیکھا اور سینے سے لگا لیا۔

مکتوب جناب محمد اسماعیل قریشی

(سینئر ایڈووکیٹ سپریم کورٹ وہائی کورٹس پاکستان)

برادر مکرم جناب منصور عاقل صاحب السلام علیکم۔ اردو سے آپ کو جو والہانہ عشق ہے وہ کچھ کچھ الاقربا ء میں نمایاں ہے۔ فروغ اردو کے بارے میں میری بھی جو تھوڑی بہت خدمات ہیں اس میں آپ کی حوصلہ افزائی شامل حال رہی ہے اردو تو بلا شبہ پاکستان کی قومی زبان ہے۔ اس کو ملک کی سرکاری زبان بنائے جانے کے لئے آئین پاکستان سال ۱۹۷۳ء میں دفعہ ۲۵۱ موجود ہے جس کی رو سے نفاذ آئین کے ۱۵ سال کے اندر اسے سرکاری زبان بنائے جانے کا صریح حکم موجود ہے مگر ۱۵ سال گذر جانے کے باوجود اس آئینی تقاضہ کو نظر انداز کر دیا گیا۔ قومی مطالبہ کو بھی کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔ بالآخر سال ۱۹۹۱ء میں چند مخلص احباب کے تعاون سے عدالت عالیہ میں موجودہ رٹ دائر کی گئی جس میں بابائے تحریک نفاذ اردو چوہدری احمد خاں مرحوم کی مساعی ناقابل فراموش ہیں۔

آئینی درخواست کی دائری کے بعد سخت مراحل سے گذرنا پڑا۔ حکومت پاکستان کے چند محکموں کی جانب سے یہ عذر پیش ہوا (ڈپٹی اٹارنی جنرل کی جانب سے) کہ رٹ اردو میں ناقابل فہم ہے۔ اس کے بعد تاخیری حربوں سے معاملہ معرض التواء میں رہا جس سے تنگ آ کر میں نے اس وقت کے چیف جسٹس (جناب خلیل الرحمن خاں) سے کہا کہ جناب اس مقدمہ اردو کو اکیسویں صدی کے آخر میں لگا دیا جائے تاکہ موجودہ جج حضرات کو اس الجھن سے نجات مل جائے جسے وہ منظور کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ ایک جج صاحب (خلیل الرحمن خاں رمدے) نے یہ تک فرما دیا کہ اردو کو سرکاری زبان بنانے کے لئے قائداعظم کا اصرار غلط تھا جس پر ان سے کافی تکرار بھی ہو گئی۔

کچھ عرصہ بعد معلوم ہوا کہ رٹ آفس سے گم ہو گئی ہے۔ اسی کی تلاش جاری ہے۔ گذشتہ ماہ جا کر کہیں برآمد ہوئی ہے۔ لیکن سماعت کے لئے بار بار درخواستیں دینے کے باوجود وسیع تر بینچ تشکیل نہیں پا رہا ہے۔ بہرحال کوششیں جاری ہیں۔ دعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے جج صاحبان کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ اس طرف توجہ فرمائیں۔

ایک بات قابل ذکر ہے کہ میں نے چیف جسٹس پاکستان جناب انوار الحق صاحب سے

گذارش کی تھی کہ وکلاء کو قومی زبان اردو میں بحث کی اجازت دی جائے۔ جج صاحبان اور وکلاء کے لئے کوٹ کی بجائے سیاہ شیروانی کو عدالتی لباس قرار دیا جائے جس سے ہمارے قومی تشخص کا اظہار ہو سکے۔ جس کو موصوف نے پسند فرمایا اور اس سلسلہ میں احکام بھی جاری کر دیئے لیکن جنرل مشرف اور جناب انوار الحق کے جانشین چیف جسٹس جناب سجاد علی شاہ کو یہ احکام ناپسند تھے چنانچہ کچھ عرصہ بعد قومی زبان اردو اور قومی لباس شیروانی کے احکام کو واپس لے لیا گیا۔ اب وہی کاروبار فرنگ کی گرم بازاری ہے۔

اردو ورث اور عدالت عالیہ کے اہم احکام کی نقل اس مکتوب کے ہمراہ ارسال خدمت ہے۔

کل تک کچھ سابقہ سپریم کورٹ مقدمات میں مصروف تھا۔ آج صبح قلم برداشتہ یہ چند سطور پیش خدمت ہیں تاکہ آپ کے علمی ذخیرے میں بطور ریکارڈ محفوظ رہیں۔

زرِ تعاون کے لئے چیکوں کی ترسیل
جو کرم فرما سہ ماہی "الاقرباء" کو سالانہ زرِ تعاون اور اشتہارات کے سلسلہ میں بذریعہ چیک ادائیگی فرماتے ہیں، وہ از راہِ کرم چیکوں پر مندرجہ ذیل عنوان تحریر فرمایا کریں:
Quarterly Al-Aqreba, Islamabad

نقل درخواست برائے نفاذ اردو

بیدلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

(غالب)

بعدالت عالیہ لاہور

آئینی درخواست نمبر ۸۸۱۷ سال ۱۹۹۱ء

محمد اسماعیل قریشی وتو دیگران سائلان

بنام

اسلامی جمہوریہ پاکستان وتو دیگران مسئول علیہم

اشاریہ (انڈکس)

نمبر شمار	قسم دستاویز	تاریخ	صفحہ
۱۔	آئینی درخواست		۲تا۸
۲۔	ضمیمہ ۱۔ اردو کو سرکاری زبان بنانے کے انتظامات		۹تا۱۰
۳۔	ضمیمہ ۲۔ حکومت پاکستان وزارت تعلیم کا خط (نمبر ایف۔۳۔۸۵/۳۔انگلش)	۱۸-اکتوبر ۱۹۸۷ء	۱۱
۴۔	ضمیمہ ۳۔ حکومت پاکستان وزارت تعلیم کا خط (نمبر ایف۔۳۔۸۵/۴۔انگلش۔والیوم۔VI)	۳ مئی ۱۹۸۹ء	۱۲
۵۔	ضمیمہ ۴۔ حکومت پاکستان وزارت تعلیم کا خط (نمبر ایف۔۳۔۸۵/۴۔انگلش (سی ڈبلیو)	۲۰ مئی ۱۹۸۹ء	۱۳
۶۔	ضمیمہ ۵۔ حکومت پاکستان لاء ڈویژن (نمبر ایف۱۷(۱)/۸۳ پ ب)	۱۸۔مئی ۱۹۸۳ء	۱۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بعدالت عالیہ لاہور

آئینی درخواست نمبر ۸۸۱۷ سال ۱۹۹۱ء

۱۔ محمد اسماعیل قریشی سینئر ایڈووکیٹ، سپریم کورٹ وصدر تنظیم مسلم ماہرین قانون اسلامی (پاکستان) لاہور

۲۔ چوہدری احمد خاں، صدر تحریک نفاذ اردو پاکستان، ساکن ۲۹۔ غالب کالونی، سمن آباد، لاہور۔

۳۔ سید اسعد گیلانی، سابق رکن قومی اسمبلی پاکستان، ساکن منصورہ، ملتان روڈ، لاہور

۴۔ الطاف حسن قریشی، مدیر اردو ڈائجسٹ، لاہور

۵۔ راجہ ظفر علی ایڈووکیٹ، صدر حلقہ احباب قانون، لاہور

۶۔ ملک وقار سلیم، ایڈووکیٹ، سیکرٹری لاہور ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن، لاہور۔

۷۔ چوہدری نذیر محمد، ایڈووکیٹ، چیئرمین لائرز فیڈریشن پاکستان، لاہور۔

۸۔ میجر نسیم صادق، صدر بزم فروغ اردو، ساکن ۶۵۔ ویلی روڈ، راولپنڈی۔

۹۔ ضیاء الاسلام انصاری، سابق چیئرمین نیشنل پریس ٹرسٹ پاکستان، لاہور۔

۱۰۔ ڈاکٹر سمعیہ قریشی، معتمد بزم فروغ اردو۔ ساکن ۲۶۔ ر چناب۔ علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور۔

سائلان

بنام

۱۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان بذریعہ سیکرٹری کابینہ ڈویژن، حکومت پاکستان، اسلام آباد۔

۲۔ حکومت پاکستان بذریعہ جناب وزیراعظم پاکستان، اسلام آباد

۳۔ حکومت پاکستان بذریعہ سیکرٹری اسٹیبلشمنٹ ڈویژن، اسلام آباد۔

۴۔ حکومت پاکستان بذریعہ سیکرٹری وزارت قانون و پارلیمانی امور، اسلام آباد۔

۵۔ حکومت پاکستان بذریعہ سیکرٹری وزارت تعلیم، اسلام آباد۔

۶۔ حکومت پاکستان بذریعہ سیکرٹری وزارت مالیات۔ اسلام آباد۔

۷۔ صوبہ پنجاب بذریعہ جناب وزیراعلیٰ، پنجاب، کراچی۔

۸۔ صوبہ سندھ بذریعہ جناب وزیر اعلیٰ سندھ، کراچی
۹۔ صوبہ سرحد بذریعہ جناب وزیر اعلیٰ، سرحد، پشاور۔
۱۰۔ صوبہ بلوچستان بذریعہ جناب وزیر اعلیٰ بلوچستان، کوئٹہ۔

مسئول علیہم

آئینی درخواست زیر دفعہ ۱۹۹ آئین اسلامی جمہوریہ پاکستان سال ۱۹۷۳ء برائے اجرائے ہدایت و احکام بنام مسئول علیہم کہ وہ قومی زبان اردو کو تمام سرکاری اور دیگر مقاصد کے لیے نافذ اور جاری کریں۔

سائلان درخواست حسب ذیل عرض پرداز ہیں:۔

۱۔ یہ کہ سائلان آئینی درخواست وطن عزیز پاکستان کے شہری ہیں اور وہ پاکستان کی سالمیت، استحکام، اس کی بقا اور ارتقا اور پاکستانی عوام کے اتحاد، یکجہتی ان کی ترقی اور بہبود میں گہری دل چسپی رکھتے ہیں۔ پاکستان کی تشکیل و تعمیر اور ترقی میں ان کی حقیر کوششیں بھی شامل ہیں۔

۲۔ یہ کہ مفکر پاکستان حضرت علامہ اقبال نے بتاریخ ۲۷ ستمبر ۱۹۳۶ء بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم کے نام اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا تھا۔ ''میری لسانی عصبیت میری دینی عصبیت سے کسی طرح کم نہیں۔'' یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ ہندوؤں کے آنجہانی لیڈر گاندھی جی نے اسی دور میں اردو کی مخالفت کانگرس کے اجلاس ناگپور میں صرف اس لیے کی تھی کہ اردو قرآنی حروف میں لکھی جاتی ہے۔

۳۔ یہ کہ بابائے قوم حضرت قائد اعظم محمد علی جناح نے تشکیل پاکستان سے قبل اور پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد بطور سربراہ مملکت واضح طور پر اس امر کا اعلان کیا تھا کہ پاکستان کی قومی اور سرکاری زبان اردو ہوگی ان کے خطبات سے یہاں صرف ان کی دو تقاریر کا اقتباس درج ذیل ہے جو انہوں نے اپنی خرابی صحت کے باوجود اور معالجین کی ہدایات کے خلاف ڈھاکہ پہنچ کر کی تھیں۔ ۲۱

مارچ ۱۹۴۸ء کو جلسہ عام ڈھاکہ کے موقع پر آپ نے اعلان فرمایا تھا:۔

"میں آپ کو واضح طور پر بتا دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہوگی اور صرف اردو اور اردو کے سوا اور کوئی زبان نہیں۔ جو کوئی آپ کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ پاکستان کا دشمن ہے۔ ایک مشترکہ سرکاری زبان کے بغیر کوئی قوم باہم متحد نہیں ہو سکتی اور نہ کوئی کام کر سکتی ہے۔"

بتاریخ ۲۲ مارچ جلسہ تقسیم اسناد ڈھاکہ یونیورسٹی کے موقع پر آپ نے اعلان فرمایا تھا:۔

"اردو وہ زبان ہے جس کی برصغیر کے کروڑوں مسلمانوں نے پرورش کی۔ اسے پاکستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سمجھا جاتا ہے۔ یہ بات بھی اردو کے حق میں جاتی ہے اور یہ بہت اہم ہے کہ بھارت نے اردو کو دیس نکالا دے دیا ہے۔ اور حتیٰ کہ اردو رسم الخط کو بھی ممنوع قرار دیا ہے۔"

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اردو کو دیس نکالا دینے اور اپنے آنجہانی لیڈر گاندھی جی کی ہدایات کے مطابق اردو رسم الخط کو ممنوع قرار دینے کے بعد بھارت نے اردو دشمنی میں ہندی کو بھارت کی سرکاری زبان بنا دیا اور اردو رسم الخط کو ویدوں کی ہزاروں سال پرانی سنسکرت بھاشا کے رسم الخط میں تبدیل کر دیا اور اب سارے بھارت میں مختلف صوبائی اور علاقائی زبانوں اور مختلف تہذیب و تمدن اور کلچر کے باوجود وہاں کی سرکاری زبان ہندی ہے۔

۴۔ یہ کہ قائداعظم کے قومی زبان کے بارے میں اس فرمان کی روگردانی کی وجہ سے پاکستان دشمن طاقتوں نے لسانی عصبیت کو وجہ نزاع بنا کر ملک عزیز کو ۱۹۷۱ء میں دولخت کر دیا تھا۔ اس المیہ میں یہاں کے غاصب حکمرانوں اور ان کے مشیروں نے جو شرمناک کردار ادا کیا وہ تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔

۵۔ یہ کہ پاکستان کی صوبائی اور علاقائی زبانوں کا اردو سے کسی قسم کا کوئی تنازعہ نہیں صرف لہجہ اور بولی کے فرق سے اردو ہی پاکستان کے تمام صوبوں میں اپنی مختلف شکلوں کے ساتھ رائج ہے اور پاکستان کی جملہ صوبائی اور علاقائی زبانیں بھی شروع ہی سے اردو کی طرح قرآنی اور عربی رسم الخط

میں لکھی اور پڑھی جاتی ہیں اور ان سب میں قرآن مجید ہی کے الفاظ و حروف مشترک ہیں جبکہ غیر ملکی سامراج کے بعد لارڈ میکالے کے زمانہ سے انگریزی ہی اردو کی حریف چلی آرہی ہے اور اردو کو اس کا جائز قانونی اور آئینی مقام دینے میں مانع اور مزاحم ہے۔

۶۔ یہ کہ اردو کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ اس میں تفسیر قرآن، حدیث، فقہ، سیرت، منطق، علم کلام، تصوف، تاریخ اسلام اور سارا اسلامی لٹریچر انگریزی زبان اور دنیا کی سب زبانوں سے عربی کے بعد سب سے زیادہ ہے جس کی تائید اور توثیق حضرت علامہ اقبال اور حضرت قائداعظم نے فرمائی ہے۔ کلام الٰہی کے پچھتر فیصد الفاظ آج بھی اردو زبان کا حصہ ہیں۔

۷۔ یہ کہ پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی کی قرارداد مقاصد کو قائداعظم کے دست راست اور پاکستان کے پہلے وزیراعظم شہید ملت لیاقت علی خان نے پہلی قومی اسمبلی پاکستان سے منظور کرالیا جو پاکستان کے آئین سال ۱۹۵۶ء اور آئین پاکستان سال ۱۹۶۲ء میں بطور دیباچہ شامل رہی ہے۔

۸۔ یہ کہ قرارداد مقاصد کی روشنی میں پاکستان کے تمام دساتیر میں اردو کو قومی زبان قرار دیا گیا ہے۔ پاکستان کے تینوں دساتیر کی متعلقہ دفعات جن میں اردو کو اسلامی جمہوریہ پاکستان کی قومی زبان کا درجہ دیا گیا ہے۔ حسب ذیل ہیں:

نمبر شمار	آئین پاکستان	متعلقہ دفعات
۱۔	سال ۱۹۵۶ء	۲۱۴
۲۔	سال ۱۹۶۲ء	۲۱۵
۳۔	سال ۱۹۷۳ء	۲۵۱

لیکن بار بار مارشل لاء کے نفاذ اور آئین کی تنسیخ کی وجہ سے اردو کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل نہ ہو سکا حالانکہ دنیا کی ترقی یافتہ اقوام اور ملکوں کے دفاتر، عدالتوں، تعلیمی اداروں، مقابلہ کے امتحانات اور سرکاری گزٹ میں ان کی قومی زبان ہی کو استعمال کیا جاتا ہے۔

۹۔ یہ کہ اردو دنیا کی زندہ اور مروجہ زبانوں میں شامل ہے۔ برطانیہ، امریکہ، ایشیاء، افریقہ

اور اسلامی ملکوں میں بھی اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے اور اظہار خیال کا ذریعہ بھی ہے اور ماضی میں بھی برصغیر پاک و ہند کی درس گاہوں اور ممتاز یونیورسٹی جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن کا ذریعہ تعلیم اردو رہی ہے جس میں تمام سائنسی علوم انجینئرنگ اور طب کی تعلیم بھی اردو میں دی جاتی تھی۔ وہیں کے تعلیم یافتہ ممتاز ماہر ریاضیات ڈاکٹر رضی الدین صدیقی پاکستان کی مختلف جامعات کے وائس چانسلر رہے ہیں اور ان کا نام بھی نوبل پرائز کے مستحقین میں شامل رہا ہے۔ اس کے علاوہ مرحوم ریاست حیدر آباد دکن کی علمی، سرکاری، تعلیمی، عدالتی اور دفتری زبان بھی دو صدیوں تک بھارت کے ناجائز قبضہ سال ۱۹۴۸ء تک اردو ہی رہی ہے۔ خود پاکستان میں ریاست بہاولپور کی سرکاری زبان اردو ہی رہی ہے۔

۱۰۔ یہ کہ ہماری عدالت عظمیٰ اور اعلیٰ عدلیہ نے بھی اپنے فیصلے اردو میں تحریر کئے ہیں اور وکلا کو انگریزی کی بجائے اردو میں بحث کی اجازت بھی دے دی ہے۔ لاہور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن نے اردو کو اپنی سرکاری زبان قرار دیا ہے۔

۱۱۔ یہ کہ پاکستان کے موجودہ آئین سال ۱۹۷۳ء کی دفعہ ۲۵۱ کی رو سے آئین کے نفاذ کے ۱۵ سال کے اندر اردو کو سرکاری زبان قرار دیا جانا ناگزیر آئینی تقاضہ ہے اور یہ پندرہ سالہ مدت ۱۴ اگست ۱۹۸۸ء کو پوری ہو چکی ہے۔

۱۲۔ یہ کہ دستور کی دفعہ ۲۵۱ کے مطابق اردو کو سرکاری اور دیگر مقاصد کے استعمال کے لئے پندرہ سال کے اندر اہتمام اور انتظام کی تکمیل کے لئے حکومت پاکستان کی کابینہ ڈویژن نے سال ۱۹۷۹ء میں مقتدرہ قومی زبان کا ادارہ قائم کیا۔

۱۳۔ یہ کہ مقتدرہ قومی زبان نے ساڑھے گیارہ سال کی مدت میں اردو کو سرکاری زبان بنانے کے لئے جملہ انتظامات مکمل کر لئے ہیں جو ضمیمہ ا میں درج ہیں جو لف درخواست ہذا ہے۔

۱۴۔ مقتدرہ قومی زبان نے انگریزی کی جگہ اردو کو دفتری زبان بنانے کی مفصل تجویز ۲ مارچ ۱۹۸۱ء کو حکومت پاکستان کابینہ ڈویژن کو پیش کر دی تھی۔ مقتدرہ نے دفاتر میں نفاذ اردو کی تاریخ ۱۴ اگست ۱۹۸۱ء تجویز کی تھی لیکن کابینہ ڈویژن کی ایک اہم کمیٹی نے جو ۱۳ اکتوبر ۱۹۸۱ء کو مقتدرہ کی

سفارشات پر غور کرنے کے لئے ترتیب دی گئی تھی اور جس میں صوبائی حکومتوں اور مرکزی وزارتوں و ڈویژنوں کے نمائندوں نے شرکت کی تھی یہ طے کیا کہ نفاذ کی ابتدا ۱۴ اگست ۱۹۸۱ء کی بجائے ۱۴ اگست ۱۹۸۲ء سے کی جائے۔ جسے مقتدرہ نے تسلیم کر لیا۔ مقررہ تاریخ کے بعد تقریباً نو سال کا عرصہ گزر چکا ہے لیکن ابھی تک اردو دفتری زبان نہیں بنی حالانکہ دستور ۱۹۷۳ء کی دفعہ ۲۵۱ کے مطابق ۱۴ اگست ۱۹۸۸ء تک سرکاری دفاتر، عدالتوں، تعلیمی اداروں، امتحانات مقابلہ اور سرکاری گزٹ میں انگریزی کی جگہ اردو رائج ہو جانی چاہئے تھی۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم نے اگست ۱۹۷۸ء میں انگریزی کی بالادستی کے خلاف پچاس لاکھ پاکستانیوں کے دستخط صدر مملکت کو بھیجے تھے اور ملک کے مختلف حصوں سے اردو کو سرکاری زبان بنانے کے لئے ہزاروں تاریں صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان کو روانہ کی گئی تھیں۔

۱۵۔ یہ کہ مقتدرہ قومی زبان کی مذکورہ تجویز کی منظوری کے بعد اور آئین کی مقرر کردہ پندرہ سالہ میعاد گذرنے کے باوجود حکومت پاکستان اور مسئول علیہم نے دستور کے اس آئینی تقاضا سے انحراف کرتے ہوئے اردو کو پاکستان میں سرکاری زبان کے طور پر رائج کرنے سے گریز کیا ہے۔

۱۶۔ یہ کہ سائلان درخواست ہذا نمبر ۲ اور نمبر ۳ نے عدالت عظمیٰ پاکستان میں ایک آئینی درخواست زیر دفعہ ۱۸۴ (۳) برائے اجرائے ہدایت حکومت پاکستان اور دیگر مسئول علیہم بایں مضمون بتاریخ ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۹ء دائر کی کہ وہ قومی زبان اردو کو تمام سرکاری اور دیگر مقاصد کے لئے نافذ کرنے میں اپنی آئینی ذمہ داری پوری کریں لیکن فاضل عدالت عظمیٰ نے اس آئینی درخواست کو بتاریخ مئی ۱۹۹۰ء اس بناء پر خارج کیا کہ وہ آئین کی مذکورہ دفعہ کے تحت قابل پیش رفت نہیں لیکن بنگر انصاف اپنے حکم میں اس امر کی وضاحت کر دی کہ سائلان درخواست اس سلسلہ میں عدالت مجاز سے رجوع کر سکتے ہیں۔

۱۷۔ یہ کہ مسئول علیہم نے اردو کو سرکاری زبان کے طور پر نافذ کرنے کی آئینی ذمہ داری کو ابھی تک پورا نہیں کیا جس کی وجہ سے سائلان درخواست ہذا اور پاکستان کے تمام شہریوں کو ایک معمولی سی اقلیت کے سوا ذہنی، روحانی اور جسمی تکلیف پہنچی ہے اور اس کے مداوا کے لئے کوئی اور

صورت موجود نہیں۔ اس لئے فاضل عدالت ہذا سے آئین پاکستان کی دفعہ ۱۹۹ کی حسب ذیل وجوہ پر رجوع کرنے کے لئے مجبور ہیں۔

نکات وجوہات

۱۔ آئین پاکستان کی دفعہ ۲۵۱ (۱) کے مندرجات تاکیدی نوعیت کے ہیں جن پر عملدرآمد کرانا مسئول علیہم کا فرض منصبی ہے۔

۲۔ یہ کہ پبلک، گرامر، مشنری اور دیگر انگریزی ذریعہ تعلیم اسکولوں اور کالجوں میں بھاری فیس داخلہ اور ماہانہ فیس دے کر صرف طبقہ امراء کے نونہال پبلک سروس کمیشن اور دیگر مقابلہ کے امتحانات میں کامیاب ہو کر حکومت کے کلیدی اور پالیسی ساز مناصب پر فائز ہو جاتے ہیں۔ جب کہ درمیانہ اور نچلے طبقہ کے بچوں کو اردو ذریعہ تعلیم اسکولوں اور کالجوں میں جگہ ملتی ہے کیونکہ ان کے والدین اور سرپرستوں کے لئے انگریزی ذریعہ تعلیم اداروں کے بھاری اخراجات ناقابل برداشت ہیں۔ پبلک سروس کمیشن اور دیگر امتحانات مقابلہ میں چونکہ انگریزی ذریعہ اظہار و ذریعہ گفتگو ہوتا ہے اس لئے یہ بچے اکثر اور عموعی طور پر ان امتحانات میں ناکام ہو جاتے ہیں اور انہیں کلرکی اور معمولی ملازمتیں کرنا پڑتی ہیں۔ اس لئے انگریزی کا بطور سرکاری زبان برقرار رہنا اسلامی مساوات اور عدل اجتماعی کے اصولوں کے خلاف ہونے کی بناء پر آئین کی دفعہ ۲۔ الف سے متصادم ہے۔

۳۔ یہ کہ پاکستان میں میٹرک کی سطح تک انگریزی ذریعہ تعلیم طلباء کا تناسب تقریباً دو فیصد ہے اس لئے ایک معمولی اقلیت کی اعلیٰ حکومتی آسامیوں پر مسلسل اجارہ داری آئین پاکستان ۱۹۷۳ء کی دفعہ ۳ کی روح اور منشاء کے خلاف ہے۔ نیز اس صورت حال سے غریب، محنت کش عوام اور مراعات یافتہ طبقہ کے درمیان کش مکش اور منافرت پیدا ہوتی ہے۔ معاشرہ کو ہر قسم کے استحصال سے پاک کرنا اور ہر شہری کو ترقی کے مساوی مواقع فراہم کرنا بھی آئین پاکستان ۱۹۷۳ء کی دفعہ ۳ کی رو سے مسئول علیہ نمبر ا کی آئینی ذمہ داری ہے۔

۴۔ یہ کہ مسئول علیہم نے نہ صرف آئین ۱۹۷۳ کی دفعہ ۲۵۱ کے تقاضوں کو پورا کرنے سے گریز کیا ہے بلکہ انہوں نے آئین کی دفعات ۲، ۲۔الف، ۱۴ اور ۳۱ کو نظر انداز کر دیا ہے۔ فاضل عدالت ہٰذا کو مسئول علیہم سے آئین کی دفعات مذکورہ کی تعمیل کرانے کے لئے کلی اختیارات حاصل ہیں۔

اندریں حالات فاضل عدالت ہٰذا سے سائلان گذارش کرتے ہیں کہ مسئول علیہم کو حسب ذیل ہدایات اور احکامات جاری کئے جائیں:۔

۱۔ کہ وہ تمام وفاقی (قومی اور شہری) تمام صوبائی، سرکاری و نیم سرکاری اور خود مختار اداروں اور تمام عدالتوں میں سرکاری زبان انگریزی کی بجائے اردو کو فی الفور رائج کریں۔

۲۔ کہ ملک کے تمام انگریزی ذریعہ تعلیم سکولوں (بشمول ملٹری سکولوں) میں پہلی جماعت سے دسویں جماعت تک انگریزی کی جگہ اردو کو ذریعہ تعلیم بنائیں۔ مزید برآں اردو ذریعہ تعلیم سکولوں میں بھی نویں دسویں جماعت میں سائنس و ریاضی سمیت تمام مضامین کا ذریعہ تعلیم انگریزی کی جگہ اردو بنائیں۔ نیز جماعت ششم سے لے کر بی۔اے / بی ایس سی تک انگریزی کو لازمی زبان کی بجائے فی الفور اختیاری زبان کا درجہ دیا جائے۔ جیسا کہ حکومت پاکستان وزارت تعلیم کی تعلیمی پالیسی مجریہ ۱۹۷۹ء میں لکھا ہے۔ ملک میں کوئی نیا انگریزی ذریعہ تعلیم سکول نہ کھولنے دیا جائے۔

۳۔ کہ تمام آرٹس، سائنس، تجارت، قانون، تعلیم، بزنس ایڈمنسٹریشن، انجینئرنگ، میڈیکل اور ٹیکنیکل مضامین کی تعلیم پی ایچ ڈی تک ملک کی تمام درسگاہوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں انگریزی کی بجائے اردو میں دی جائے۔

۴۔ وفاقی اور چاروں صوبائی پبلک سروس کمیشن کے زیر انتظام ہونے والے تمام زبانی اور تحریری امتحانات مقابلہ میں اور ملٹری انٹر سروسز سلیکشن بورڈ کے امتحانات مقابلہ میں ذریعہ اظہار اور ذریعہ گفتگو فوری طور پر اردو میں کرانے کا اہتمام کریں نیز پبلک سروس کمیشن کے تمام پرچے اردو زبان میں چھاپنے کا اہتمام کریں۔ مسئول علیہم کو مزید حکم دیا جائے۔

۵۔ کہ مسئول علیہم وفاقی اور صوبائی گزٹ فی الفور اردو میں شائع کریں۔

۶۔ کہ وزارت تعلیم اپنی ہدایات جو اس نے اپنے خطوط مورخہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۸۷ء (ضمیمہ ۲) مورخہ ۲ مئی ۱۹۸۹ (ضمیمہ ۳) مورخہ ۳۰ مئی ۱۹۸۹ (ضمیمہ ۴) کے ذریعہ جاری کی ہیں واپس لے۔

۷۔ کہ حکومت پاکستان وزارت قانون و پارلیمانی امور لا ڈویژن کے صدارتی حکم مورخہ ۱۸ مئی ۱۹۸۳ (ضمیمہ ۵) کے آخری فقرے کو حذف کرے۔

۸۔ کہ فی الفور نفاذ اردو آرڈیننس جاری کیا جائے جس میں فوری اور مکمل نفاذ اردو کا حکم درج ہو۔

۹۔ مزید برآں مسئول علیہم کو دیگر ایسی ہدایات اور ایسے احکام بھی جاری کئے جائیں جو معزز عدالت ہذا کی نظر میں ضروری اور مناسب ہوں تا کہ عدل و انصاف کے تقاضے پورے ہو سکیں۔

تصدیق: آج بتاریخ ۲۵ مئی ۱۹۹۱ء بمقام لاہور حلفاً تصدیق کی جاتی ہے کہ درخواست ہذا کے تمام فقرات میرے علم و یقین کی رو سے صحیح اور درست ہیں اور قبل ازیں عدالت ہذا میں اس قسم کی کوئی آئینی درخواست پیش نہ ہوئی ہے۔

سائلان درخواست گزار بذریعہ

محمد اسماعیل قریشی، سینئر ایڈووکیٹ سپریم کورٹ،
۳ ٹمپل روڈ، لاہور ۲۵ مئی ۱۹۹۱ء

پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالی

حمد

اے خدا تو نے اپنے بندوں کو
زندگی کی ہر ایک نعمت دی

تو نے ہم کو بشر کیا پیدا
دو جہاں میں بشر کو عظمت دی

خاتم الانبیاء ﷺ کی امت میں
کر کے شامل بڑی سعادت دی

اچھی صورت سے سرفراز کیا
ساتھ کے ساتھ نیک سیرت دی

رنج سے فکر سے کیا آزاد
سکھ دیا راحت و مسرت دی

علم کا شوق بھر دیا دل میں
نیکیاں سیکھنے کی عادت دی

بخشی پاکیزگی خیالوں کو
اور کردار کی شرافت دی

نام جس کا ہے ارض پاکستان
ایسی اک بے مثال جنت دی

ہو گیا جس سے ملک مالا مال
وہ وسائل دیے وہ دولت دی

دل سے دل مل گئے، قدم سے قدم
بھائی کو بھائی کی محبت دی

ہے تیرا فضل بے کراں ہم پر
ہم کو تاریخ میں فضیلت دی

نعت

ذہن بیدار نہ تھے ان کی نظر ہونے تک
کتنی صدیوں کا اندھیرا تھا سحر ہونے تک

آگہی کب سے تھی زندانِ جہالت میں اسیر
زیست دیوار ہی دیوار تھی، در ہونے تک

ان سے گر ربط نہ ہوتا تو کلی ہستی کو
کن عذابوں سے گزرنا تھا بشر ہونے تک

ہم کو آفاق کی تسخیر کا اندازہ نہ تھا
آسمانوں پہ تیری راہ گزر ہونے تک

قصرِ آفاق، گلستانِ فضاء، دشتِ خلا
بند تھے ہم پہ ترے عزمِ سفر ہونے تک

جو افق بھی ہے ہماری حدِ پرواز میں ہے
ہم ہیں محدود قفس، جنبشِ پر ہونے تک

آدمیت ہے ترے سائے میں مائل بہ عروج
قطرہ آغوشِ صدف میں ہے گہر ہونے تک

دل گرفتہ ہے کلی اس کو تبسم سے نواز
جاں کا اندیشہ بہت ہے گلِ تر ہونے تک

رونق افروز وہ کب ہوں گے دلِ ویراں میں؟
کتنے دن چاہئیں اس دشت کو گھر ہونے تک

کیا لطافت ہے کہ طیبہ میں ہزاروں جلوے
جذب دل ہو گئے آنکھوں کو خبر ہونے تک

فرصتِ دید ہو اور گنبدِ خضرا عاصی!
دیکھتا ہی رہوں معراجِ نظر ہونے تک

شارق جاوید

نعت

اٹھ گئے ہیں قدم، اب وہ رکھ لیں بھرم، آن پہنچا تو ہوں ان کے دربار تک
بس یہی ہے جگہ ہو گی کامل شفا غمزدہ آ گیا اپنے غمخوار تک

سید الانبیاء ﷺ بادشاہ زمن رحمتیں چار سو ان کی سایہ فگن
سنگ ریزے تلک ان کے ہیں مدح گو، جھکتے ہیں انکے قدموں میں اشجار تک

میں مکمل خطا وہ مجسم عطا ان کے فضل و کرم کا ٹھکانہ ہے کیا
ان کے در پر دعا میری ٹھہری رہی ان کے ہونٹوں پہ اک حرفِ اقرار تک

حاضری کا جسے اذن کر دیں عطا اس کو دشواریاں روک سکتی نہیں
اسکی ٹھوکر سے بن جائے گا راستہ، چاہے رستے میں آ جائے کہسار تک

مجھ کو نیکی کی توفیق جب سے ہوئی، میں بدی کی طرف دیکھتا بھی نہیں
کر رہے ہیں مری رہنمائی وہی میرے افکار سے میرے کردار تک

فہم و فکر رسا کیا انہیں پا سکے، حدِ ادراک میں وہ کہاں آ سکے
عشق احمد ﷺ سے اک روشنی آ گئی، میری گفتار تک، میرے اشعار تک

میں تھا شارق تہی دست اور بے نوا نعت گوئی سے مجھ کو شرف یہ ملا
بے ہنر آ گیا، ان کی سرکار تک، بس گئے آنکھ میں ان کے انوار تک

پروفیسر سہیل اختر

نعت

سبق واحدانیت کا مصطفیٰ ﷺ کے در سے ملتا ہے
شعورِ مرکزِ کعبہ اسی محور سے ملتا ہے

ترے قدموں کی مٹی ہی کرے ہے مندمل اس کو
دلوں کو زخم جو بھی وقت کے خنجر سے ملتا ہے

درودوں کی صدائیں آنسوؤں کی جھلملاہٹ میں
محبت کا کوئی منظر کب اس منظر سے ملتا ہے

ہزاروں ساغروں کی گردشِ پیہم پہ بھاری ہے
وہ اک ساغر ہمیں جو ساقیِ کوثر ﷺ سے ملتا ہے

یہ سنگِ اسودِ کعبہ بظاہر ایک پتھر ہے
ترے ہونٹوں کا لیکن لمس اسی پتھر سے ملتا ہے

یہ کن رستوں سے تم الجھے ہوئے ہو ہجر کے مارو!
پتا شہرِ نبی ﷺ کا روح کے اندر سے ملتا ہے

ہمارے ذہن پر بھی کاش وہ نعتیں اتر آئیں
وہ نعتیں جن کا رشتہ شافعِ محشر ﷺ سے ملتا ہے

صابر عظیم آبادی

نعت

ہر اک بستی ہر اک آنگن شگفتہ
محمد ﷺ ہی کے سبب ہے کارن شگفتہ

جو کی ہجرت تو اُنؐ کے دم قدم سے
مدینے کا ہوا گلشن شگفتہ

لٹاتے ہے درودوں کے شگوفے
رہے گا من شگفتہ ، تن شگفتہ

انھیں کی ذاتِ اقدس کی بدولت
رہا اسلام کا خرمن شگفتہ

غمِ سرکار ﷺ میں بہتے وہ آنسو
تمھیں رکھتا ہے گر دامن شگفتہ

گُلِ احمد ﷺ کی خوشبو میں نہا کر
ہوا ہے میرا بھی تن من شگفتہ

ثنائے سرورِ عالم ﷺ سے صابر
ہوا لہجہ شگفتہ ، فن شگفتہ

سید تابش الوری

نعت

محبوبِ خلائق بھی ہو محبوب خدا ہو
حیران زمانہ ہے کہ تم کون ہو کیا ہو

بس ایسا کوئی معجزۂ عشق عطا ہو
میں تیرا ہی کہلاؤں فنا ہو کہ بقا ہو

سرشارِ جنوں یوں ترے اطراف میں گھوموں
نعتوں کا عمامہ ہو درودوں کی قبا ہو

دیتا ہے عجب لطف درودوں کا ترنم
جیسے کوئی آواز کا رس گھول رہا ہو

حسّان کی مانند ہو تابش پہ بھی احساں
جو تجھ کو پسند آئے وہی شعر عطا ہو

سید حبیب اللہ بخاری

نعت (روضۂ رسول ﷺ پر لکھی گئی)

مدینہ وہ مقامِ عز و شاں ہے
زمیں بھی جس کی رشکِ آسماں ہے

عجب ماحول ہے اس سرزمیں کا
یہاں کا ذرہ ذرہ ضوفشاں ہے

ہے میرے سامنے روضہ نبیؐ کا
زمیں پر یہ ادب گاہِ جہاں ہے

یہاں روح الامیں آتے رہے ہیں
نبیؐ کا آستاں کیا آستاں ہے!

ہے خوش بختی حبیبِ بے نوا کی
کہ وہ شاہِ زماں کا میہماں ہے

پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالی

○

کارِ آب و ہوا کرے کوئی — پھول چن کر کھلا کرے کوئی
جب جفا پر جفا کرے کوئی — مر نہ جائے تو کیا کرے کوئی
میرے احساس میں ہیں جس کی جڑیں — چارہ اس زخم کا کرے کوئی
غمِ جاناں غمِ جہاں، غمِ جاں — حق نعمت ادا کرے کوئی
ان کے احسانِ یک نظر کے لئے — ان سے کتنی وفا کرے کوئی
میں نے اب تک جنہیں نہیں لکھا — وہ ورق بھی پڑھا کرے کوئی
مجھ پہ بھی جو ابھی نہیں اترے — وہ سخن بھی سنا کرے کوئی
اک بہشت اماں بنائی ہے — آ بسے اور اجاڑا کرے کوئی
موت اک کارِ رائگاں ہی سہی — زندہ رہ کر بھی کیا کرے کوئی
لوگ سو سو گمان کرتے ہیں — کیا کسی کا بھلا کرے کوئی
تیرا جانا تو یوں لگا جیسے — مجھ کو مجھ سے جدا کرے کوئی

وہ ہوں یا ان کا دھیان ہو عاصی
آتا جاتا رہا کرے کوئی

سید مشکور حسین یاد

○

آدمی کا ملنا بھی دو طرح کی عشرت ہے — کوئی اچھی بات کرو
ایک ملنا قدرت ہے ایک ملنا ندرت ہے — تصفیۂ حالات کرو

دیکھنے دکھانے تک دیکھتے چلے جاؤ — لمحوں کو دو شکل کوئی
چاند چاند چہرہ ہے چاند چاند چاہت ہے — تقسیم اوقات کرو

اک سفر ہے شادابی اک سفر ہے آبادی — دنیا بعد میں سمجھو پہلے
اک سفینہ صحت ہے اک سفینہ صحبت ہے — خود سے دو دو بات کرو

ویسے دونوں پتھر ہیں انتخاب جوہر سے — رونق استدلال رہے
اک نگینہ نازش ہے اک نگینہ نخوت ہے — تجزیۂ ذات و صفات کرو

دل کو کیجیے آباد سلسلے اُسی کا سب اسناد — پوری طرح سے سامنے آؤ
سارے شہر کی شہرت شہرِ شہادت میں ہے — جسم و جاں سوغات کرو

کس طرح سے جیتے ہیں آپ پر ہے یہ موقوف — ذوق یقیں کے شیشے سے
اک قرینہ قربت ہے اک قرینہ غربت ہے — ٹکڑے لات و منات کرو

پیاس کس سے بجھتی ہے دیکھنا ہے یہ مشکور — تازہ تازہ خیالوں کی
اک پسینہ پانی ہے اک پسینہ امرت ہے — یاد آنسو برسات کرو

امین راحت چغتائی

○

وہ گھر لوٹے تو کیا آنسو سنبھلتے
کہ خالی ہاتھ تھے پھر شام ڈھلتے

کہیں منزل، نہ منزل کا نشاں ہے
مسافر تھک گئے ہیں چلتے چلتے

ہزاروں آندھیاں، طوفان آتے
چراغ امید کے تو پھر بھی جلتے

کہیں کچھ لوگ ایسے بھی تو ہوتے
جو خوابوں کو حقیقت میں بدلتے

بہت نادم ہیں ہم عرضِ ہنر پر
نہ ہم ہوتے نہ دل یاروں کے جلتے

ہمیں کہنا تھا جو بھی کہہ کے اُٹھتے
وہ محفل میں رہے پہلو بدلتے

جنہیں پالا تھا اندھیاروں نے راحت
وہ کب تک روشنی کے ساتھ چلتے

○

ذرا سوچو یہی عجزِ ہنر ہے
وہی لب دوز ہے جو باخبر ہے

ہر اک راہی کی اپنی رہ گزر ہے
نہ جانے کون کس کا راہبر ہے

ہے کارِ عشق بھی کارِ طفلاں
حقیقت سے فسانہ معتبر ہے

تھکا ہارا مسافر بھی ہے نادم
یہ کیسا باغ ہے جو بے ثمر ہے

گروہِ بے بصر کو داد تو دو
کہ جس کا راہبر بھی بے بصر ہے

سنبھل کر، دیکھ کر گزرو یہاں سے
یہ آبادی ہے پھر بھی پُر خطر ہے

مکیں سب شاد کام، آباد راحت
وہی گھر میں نہیں ہے جس کا گھر ہے

مضطر اکبر آبادی

کسی پہ کھل نہ سکا بھید کچھ بھی قامت کا
کسی کا قامت موزوں تھا اس قیامت کا

جو میرے حال پہ ڈالی نظر تو رونے لگا
عدو سے حق نہ ادا ہو سکا عداوت کا

میں زخم کھانے کے باوصف مسکراتا ہوں
مری نظر میں ہے معیار یہ شرافت کا

گزر چکا ہوں میں اس حد سے اب بہت آگے
نہیں ہے کچھ مجھے احساس غم کی شدت کا

منافقت سے ہیں چہرے سجے ہوئے جن کے
انہیں ہے خبر سے وعدہ مری رفاقت کا

مرے خدا، مجھے رکھ دور ایسے لوگوں سے
کہ جن کے خون میں شامل ہے زہر نفرت کا

قیامت آئی بھی مضطر اور آ کے جا بھی چکی
میں انتظار ہی کرتا رہا قیامت کا

احتشام ادیب

ہنوز راہ میں حائل سراب کتنے ہیں
مرے خدا ابھی ان دیکھے خواب کتنے ہیں

مزاج بنتی چلی جا رہی ہے تنہائی
شعور ذات کے ہم پہ عذاب کتنے ہیں

تجھے خبر نہیں ظالم ترے بدن کے خطوط
شریر کتنے ہیں حاضر جواب کتنے ہیں

کسے بتائیں کہ دنیا کے اس خرابے میں
گناہ کتنے ہیں لازم ثواب کتنے ہیں

ستم بس ایک یہی ہے کہ ہیں اکیلے ہم
کرم تو ورنہ ترے بے حساب کتنے ہیں

ہم آنکھ بند کئے ہیں اگرچہ راہوں میں
نجوم کتنے ہیں اور آفتاب کتنے ہیں

ادیب کرب غم آگہی چھپانے میں
تمہیں بتاؤ کہ ہم کامیاب کتنے ہیں

محمود رحیم

○

حقیقتوں کے تناظر میں اشتباہ دیا
خموش رہنے کا اُس نے جب انتباہ دیا

کچھ اور لوگ تھے اُس آنکھ کے تصرف میں
میری طرف تو فقط گوشۂ نگاہ دیا

وہی تو چہرہ تھا جس میں سراغِ منزل تھا
وہی تو آنکھ تھی جس نے نشانِ راہ دیا

میں اپنے حق میں کہاں سے شہادتیں لاتا
مرے خلاف اولوالامر نے گواہ دیا

تمام عصمتیں حاضر ہوں شہ کے مقدم کو
نقیبِ شاہ نے خلقت کو حکمِ شاہ دیا

کرم کہ رکھتا رہا ہے مجھے نگاہ میں تُو
مگر پیام جو تُو نے پسِ نگاہ دیا

○

نجانے کون سی سنجیدگی کے خبط میں تھا
وہ میرے پاس تھا اور میں گرفتِ ضبط میں تھا

ہجومِ درد کا باعث کچھ اور کیا ہو گا
اداس دل کہ خیالِ نشاطِ فرط میں تھا

کلام جو بھی ہوا تھا وضاحتوں سے ہوا
کہا ہوا تری آنکھوں کا شرح و بسط میں تھا

میں جس زمانے میں تنہا رہا ہجوم میں بھی
میں اس زمانے میں کچھ رفتگاں سے ربط میں تھا

نصیب میں تھیں ادھوری مسافتیں ورنہ
رفاقتوں کا رویہ ہماری شرط میں تھا

رحیم لائی نہ منزل تلک اس کی ہمقدمی
جب اس نے چھوڑا مجھے، میں سفر کے وسط میں تھا

عقیل دانش (لندن)

○

خیالِ نو کی ضیاء وہی ہے شعر کے فن کو
غزل میں ڈھالا ہے ہم نے دلوں کی دھڑکن کو

جنونِ دید کا کچھ اور بھی فزوں ٹھہرا
دعائیں دیتے ہیں ہم لوگ ان کی چلمن کو

وہی بہار سے ہر عہد میں رہے محروم
جنہوں نے خون سے سینچا زمینِ گلشن کو

بلند عمارتیں کھاتی رہیں ہواؤں کو
میں دیکھتا رہا حسرت سے اپنے آنگن کو

جو لوگ راہِ صداقت پہ چل پڑے دانش
نظر میں لاتے نہیں وہ کسی بھی قدغن کو

○

مصلحت خاموشیوں کی بھی بتا سکتے نہیں
ہم ہیں گونگے خواب دیکھیں تو سنا سکتے ہیں

زندگی ہم نے گزاری صرف اپنے واسطے
زندگی سے ہم کبھی نظریں ملا سکتے نہیں

درد دنیا بھر کا دل میں ہے مگر مشکل یہ ہے
چیر کر دل ہم کسی کو بھی دکھا سکتے نہیں

صرف ان کا ذکر رہ جاتا ہے دنیا میں مگر
مرنے والے جا کے پھر واپس تو آ سکتے نہیں

ایک چشمِ نم ہے دانش بوجھ دل پر اس طرح
لاکھ چاہیں ہم خوشی کے گیت گا سکتے نہیں

کرامت بخاری

بات تو صاف اور سادہ ہے
تم بتاؤ کہ کیا ارادہ ہے

تھک گئے ہو تو ہے یہی منزل
دم اگر ہے تو پھر یہ جادہ ہے

جتنا کہنہ تر عزیز تر اُتنا
زندگی بھی عجب لبادہ ہے

یہ جو وعدہ ہے پھر نیا اس کا
پچھلے وعدوں کا ہی اعادہ ہے

لوگ کہتے ہیں ظرف تھوڑا ہے
میں یہ کہتا ہوں غم زیادہ ہے

تنگ دل آ بسے ہیں گلیوں میں
ورنہ یہ شہر تو کشادہ ہے

کیوں نہ ہو میر سے مجھے نسبت
وہ بھی میرا ہی خانوادہ ہے

سوئے منزل کوئی انجان چلا
قافلہ بے سر و سامان چلا

ساعتِ ہجر میں پھر سانس رکی
پھر تری یاد کا طوفان چلا

دیکھ کیا طوق و سلاسل کو مجھے
ساتھ قیدی کے جو زندان چلا

ضبط نے روک لیا ہاتھوں کو
ہم تو سمجھے تھے گریبان چلا

یہ خوشی ہے کہ مرا دشمنِ جاں
رفتہ رفتہ مجھے پہچان چلا

تیری اقلیمِ وفا میں اے دل
حسن کے نام کا فرمان چلا

پھر کوئی آہ لبوں تک آئی
ہے پھر کہیں ظلم کا پیکان چلا

ظفر اکبر آبادی

سجانا اشک بھی آنکھوں میں مسکراتے ہوئے
غموں کو بھول نہ جانا خوشی مناتے ہوئے

قدم قدم پہ ہواؤں کا سامنا ہوگا
یہ بات ذہن میں رکھنا دیے جلاتے ہوئے

مسرتوں کے سبب مجھ پہ واردات
تمام عمر کٹی جشنِ غم مناتے ہوئے

وہ زخم اٹھائے ہیں دل نے کہ خوف آتا ہے
تعلقات کسی سے بھی اب بڑھاتے ہوئے

کسی کو کیا خبر اس کی کسی کو کیا معلوم
جو دل پہ بیت گئی رازِ غم چھپاتے ہوئے

اب اس قدر بھی خدارا نہ روٹھ تو مجھ سے
میں خود سے روٹھ نہ جاؤں تجھے مناتے ہوئے

یہ انتہا ہے ظفر میری سادہ لوحی کی
کہ لطف آنے لگا ہے فریب کھاتے ہوئے

سید صفدر حسین جعفری

کوئی خواب ہے نہ خیال ہے مجھے میرے حال پہ چھوڑ دو
ابھی زندگی کا ملال ہے مجھے میرے حال پہ چھوڑ دو

کبھی رنگِ گل ہوں اور کبھی پابہ گل، ابھی میں ہوں اور ابھی میں نہیں
ابھی ہست و بود کا حال ہے مجھے میرے حال پہ چھوڑ دو

مری آنکھ آج کھلی نہیں مری صبح آج ہوئی نہیں
مرا وقت روبہ زوال ہے مجھے میرے حال پہ چھوڑ دو

وہ غبار پہ ہوں پڑا ہوا کوئی کیل جیسے جڑا ہوا
نہ عروج ہے نہ زوال ہے مجھے میرے حال پہ چھوڑ دو

نہ یہ شرق ہے نہ یہ غرب ہے نہ جنوب ہے نہ شمال ہے
یہ طلسمِ دشتِ خیال ہے مجھے میرے حال پہ چھوڑ دو

مرا عشق خواب و ہوا میں ہے مری زندگی وقتِ دعا میں ہے
کوئی رنج ہے نہ ملال ہے مجھے میرے حال پہ چھوڑ دو

ابھی میں ہوں اور ابھی میں نہیں ابھی ہست ہوں ابھی بود ہوں
یہ فسونِ حرفِ کمال ہے مجھے میرے حال پہ چھوڑ دو

پروفیسر سہیل اختر

پاؤں جس کے اٹھیں گمرہی کی طرف
جا نکلتا ہے وہ تیرگی کی طرف

اس کے لہجے میں تھی اس طرح کی کھنک
دھیان میرا گیا نغمگی کی طرف

بزم میں یوں تو آنے کو آئے بہت
سب کی نظریں اٹھیں آپ ہی کی طرف

شامِ ہجراں میں جب یاد آئی تری
دل کا در کھل گیا چاندنی کی طرف

اپنی تنہائی سے ہو کے مجبور ہم
آ نکلتے ہیں تیری گلی کی طرف

گر جہالت پنپتی رہی اس طرح
کون آئے گا پھر آگہی کی طرف

اہلِ فن میں سہیل ایسے بھی لوگ ہیں
جو نہیں دیکھتے روشنی کی طرف

مسلم شمیم

ہجر کے شب گزار ہم بھی ہیں
یعنی اختر شمار ہم بھی ہیں

آج ان کو ملول دیکھا ہے
مضطر و بے قرار ہم بھی ہیں

ٹوٹ کر آج ابر برسا ہے
جانے کیوں اشکبار ہم بھی ہیں

دینِ الفت کے ہم ہیں پیروکار
زاہد و دین دار ہم بھی ہیں

ہم کہ کرتے ہیں کاروبارِ عشق
برسرِ روزگار ہم بھی ہیں

شہرِ یارِ وفا ہیں اے لوگو!
صاحبو! شہر یار ہم بھی ہیں

درد کی مملکت کے ہیں والی
صاحبِ اقتدار ہم بھی ہیں

ڈاکٹر انور سدید

○

اگر ہے دوست تو انورؔ عداوتیں کیسی
نہیں ہے دوست تو اس سے شکایتیں کیسی

ہمیں تو ایک جھلک خیر کی نہیں دیتے
عدو پہ کرتے ہیں اپنی عنایتیں کیسی

تمہارے نام جو اِک نظم معنون کی تھی
اب اس کے گرد بنی ہیں حکایتیں کیسی

بکھر گئے ہیں ہوا میں تمہاری یاد کے پھول
اُگی ہیں آج مگر دل میں حسرتیں کیسی

جمالِ یار کی رعنائیوں کی مانگو خیر
سدیدؔ اس کی تھیں تم پہ عنایتیں کیسی

ثریا بانو ہاشمی

○

لو ہم نے اپنی سوچ پہ پہرے بٹھا دیے
منظر جو سامنے تھے وہ سارے ہٹا دیے

آنکھوں میں ان کی یاد سے جگنو چمک اٹھے
محرومیوں نے سارے دیے جب بجھا دیے

ایک تم کہ بھول کر بھی ہمیں یاد کب کیا
ایک ہم کہ ہم نے سارے زمانے بھلا دیے

فرقت میں ان کی یاد سے شکوے ہزار تھے
وہ سامنے جو آئے تو ہم مسکرا دیے

ماؤں کے اور بہنوں کے وہ دل خراش بین
وحشت گروں نے اُن کے سہارے مٹا دیے

سیف الرحمٰن سیفی

○

اپنے احساس کا سودا نہیں ہونے دیں گے
عشق میں ہم تجھے رسوا نہیں ہونے دیں گے

غم نہ کر بجھتے چراغوں کا مری جان کہ ہم
تیری محفل میں اندھیرا نہیں ہونے دیں گے

ناگہاں آ بھی گئی کوئی مصیبت جو کبھی
ہم تری آنکھ کو دریا نہیں ہونے دیں گے

حاکمِ شہر نے کیا خوب سنائی ہے نوید
شہر میں خون خرابہ نہیں ہونے دیں گے

تجھ پہ غلبہ کسی دشمن کا ہو اے ارضِ وطن
ہم کسی حال میں ایسا نہیں ہونے دیں گے

جس کو سینچا تھا کبھی خون سے اپنے سیفی
اس چمن زار کو صحرا نہیں ہونے دیں گے

ضیاء الحسن ضیاء

○

حوصلہ دل کو ملا اے ہم نفس اب کے برس
اپنے جیسے جب ملے دو چار دس اب کے برس

اس برس بھی قیدِ تنہائی میں ہم پیاسے رہے
اے مرے ابرِ کرم اب تو برس اب کے برس

رات دن بے چین کرتی ہی رہی یادوں کی گونج
جان پر بھاری ہی گزرا یہ برس اب کے برس

وحشت کی آندھی سے باغِ جاں میں ہلچل سی رہی
ٹوٹنے سے بچ گیا تارِ نفس اب کے برس

زندگی کے کھیت اور کھلیان سارے جل گئے
دے گیا شادابیاں ہم کو قفس اب کے برس

قافلوں کو وادیاں، صحرا ترستے ہیں ضیاء
مر گئی بے موت آوازِ جرس اب کے برس

پروفیسر زہیر کنجاہی

O

قصۂ درد سنایا جائے
زخمِ دل ان کو دکھایا جائے

کر لیا حوصلہ دل نے، ورنہ
بارِ غم کس سے اٹھایا جائے

اس کی تعمیر بہت مشکل ہے
کعبۂ دل کو نہ ڈھایا جائے

اپنی نظروں ہی میں گر کے رہ جاؤں
یوں نہ نظروں سے گرایا جائے

دل میں رہتے ہو تو چھپنا کیسا
اب یہ پردہ بھی اُٹھایا جائے

خوب اِک شخص کی یہ بھی ہے ادا
خود بخود دل میں سمایا جائے

اِک زمانے کی نظر ہے مجھ پر
رازِ دل کیسے چھپایا جائے

جاگتے ہو بھی نہ جاگیں جو زہیر
اُن کو کس طرح جگایا جائے

خالد یوسف

(آکسفورڈ۔ برطانیہ)

O

بظاہر تو شعر، ادب، منطق ندارد
پشاور تو ہے، قصہ خوانی ندارد

جدیدی نشے میں لگا وہ فسانہ
علامت کی یورش، کہانی ندارد

نقیبوں نے پہنچا دیا آسماں پر
مگر رتبۂ آسانی ندارد

غزل وہ کہی جس کا مفہوم عنقا
کہ راجہ تو ہے راجدھانی ندارد

سجا تو لیا جام و مینا سے گھر کو
مگر بادۂ ارغوانی ندارد

جتاتے ہیں خود کو روایت شکن وہ
مگر شیخ سے چھیڑ خانی ندارد

عبادت کو ہر شے پہ جانا مقدم
وضو کو جو پہنچے تو پانی ندارد

رکھو حرفِ حق کو سدا عام خالد
مگر یہ نہ ہو خوش بیانی ندارد

اکبر حیدرآبادی (آکسفورڈ)

o

ملال کا بھی تاثر خوشی میں ملتا ہے
مرا مزاج مری سادگی میں ملتا ہے

ہے کائنات اگر اب بھی ناتمام تو کیا
تمام ہونے کا امکاں کمی میں ملتا ہے

سوال اُٹھتا ہے آغاز وقت کا جب بھی
جواب اس کا ہمیشہ نفی میں ملتا ہے

جو ہم پہ سایہ فگن ہے پروں کو پھیلائے
سراغ صبح کا اُس تیرگی میں ملتا ہے

کبھی ہے قہر مجسم کبھی ہے رحم تمام
ہے کس کا عکس جو یہ آدمی میں ملتا ہے

نظر فروز سہی چشم و لب کی آرائش
وہ حسن اور ہے جو سادگی میں ملتا ہے

بنا کے دیکھو کسی کو تم اپنا یار عزیز
کہ دشمنی کا پتہ دوستی میں ملتا ہے

وہ چہرہ دیکھا تھا میں نے جسے اندھیرے میں
کچھ اور ہوتا ہے جب روشنی میں ملتا ہے

بڑے مزے سے گزرتی ہے زندگی اکبر
بڑا سکون مجھے شاعری میں ملتا ہے

محشر زیدی

o

پھولوں سے کھیلئے، گُلِ خنداں سے کھیلئے
جوشِ نموئے سبزہ و ریحاں سے کھیلئے

جب تک قیامِ روح سرِ خاکداں رہے
تب تک مزاجِ گردشِ دوراں سے کھیلئے

جب ماتمِ بہار کی مجلس ہو منعقد
امیدِ فصلِ لالہ و ریحاں سے کھیلئے

جب تک ہو شغل دولتِ ایماں سے مستفیض
تب تک وجودِ عظمتِ انساں سے کھیلئے

جب تک تمازتِ غمِ دوراں ہے جاں گسل
ساقی کی چشمِ میکدہ ساماں سے کھیلئے

اک تو بہار ناز ہے پھر رسم و راہ ہو
زنجیرِ زلف و گوشۂ داماں سے کھیلئے

جب مفتیانِ شہر چڑھائیں صلیب پر
اس وقت بھی تصورِ جاناں سے کھیلئے

ناسازیٔ حیات کبھی وقت بھی تو دے
مقدور ہو تو عہدِ بہاراں سے کھیلئے

محشر یقیں کی نیند سلا دے خیال کو
پھر اعتبارِ ذوقِ فراواں سے کھیلئے

انور شعور

O

لاکھ بے اعتنائی کی محسوس
ہم خدا سے نہیں ہوئے مایوس

کیا بتائیں کہ آئینے میں ہمیں
کیسی لگتی ہے صورتِ معکوس

دردِ دل کی دوا نہیں دیتا
کوئی لقمان، کوئی جالینوس

کچھ تو شیشے سے رنگِ مے جھلکے
اے، کفایت شعارا اے کنجوس

کوششیں رائگاں نہیں جاتیں
رفتہ رفتہ وہ ہو گئے مانوس

رات پیتے رہے ضیافت میں
ہم نئے تائب، شیخ صاحب جوس

کوئی بولا نہیں شعور سے آج
آخر اٹھ کر چلا گیا منحوس

O

اگر خیریت نیک مطلوب ہے
اسے بھول جاؤ جو محبوب ہے

فقط شکر کرتا رہے آدمی
شکایت محبت میں معیوب ہے

جو مشہور تھا قیس کے نام سے
وہ افسانہ اب ہم سے منسوب ہے

خدا خوش سہی اس گنہگار سے
یہ بندوں کے نزدیک معتوب ہے

سنے گا بھلا عقل کی بات کیا
ابھی دل محبت سے مغلوب ہے

جو اس دور میں صبر سے رہ سکے
وہ اپنے زمانے کا ایوب ہے

کہاں وہ، کہاں آپ انور شعور
اسے آپ کا چاہنا خوب ہے

پروفیسر محمد اویس جعفری (سیاٹل۔امریکہ)

گنبدِ سماعت

چاندنی کی خوشبو نے
اوس کے نگینوں نے
پھول کی شعاعوں نے
رنگ کے سفینوں نے
پھوار نے ستاروں کی
آنچ نے بہاروں کی
جو بھی کچھ کہا اس سے
سُرمگیں نگاہوں سے
مدبھری ہواؤں سے
درد کی اداؤں سے
روح کی صداؤں سے
جو بھی کچھ سنا اس نے
ذات کے شوالے میں
شوق کے اجالے میں
خامشی کے خامہ سے
آئینہ پہ حیرت کے

نقش کر لیا اس نے
پر یہ لفظ کہ جگنو
نکہتوں کے سوداگر
ساعتوں کے چارہ گر
چور اور یہ جادوگر
وہ متاعِ بے پایاں
سب کی سب چرا لائے
تشنگانِ زم گاہی سے
تیرے دل میں در آئے
میرے دل میں در آئے
ذہن کی منڈیروں پہ
رقصِ نور ہوتا ہے
اور چراغ جلتے ہیں
رت جگوں کی رُت آئی
گنبدِ سماعت میں
جلترنگ بجتے ہیں

پروفیسر خیال آفاقی

عدل

نفرتوں کا دشت ہو یا ہو محبت کا چمن
جہل کا ظلمت کدہ ہو یا ہو بزمِ علم و فن

عدل تاجِ شاہِ شاہاں، عدل اقلیمِ فقیر
سیرتِ فاروقِ اعظمؓ، صورتِ روشن ضمیر

ماہ و انجم کے بدن ہوں یا گل و لالہ کے تن
سنگ و آہن کے ہیولے ہوں کہ ریشم کے بدن

عدل کی تاریخ میں ملتی ہے ایسی بھی نظیر
راکبِ ناقہ ہے بندہ اور پیادہ ہے امیر

یہ اجالوں کا جہاں، یہ رنگ و بو کی محفلیں
بزمِ پروانہ ہو یا ہو جگنوؤں کی انجمن

عدل سے انسانیت ہوتی ہے جوہر آشنا
عدل ہی رستہ خودی کا، ہے خدا کا بھی سفیر

بادلوں کا گھن ہو یا بجلیوں کی شورشیں
ندیوں کی چال ہو یا آبشاروں کا چلن

عدل کرتا ہے نظر کو واقفِ حدِ ادب
درمیانِ عشق و مستی کھینچ دیتا ہے لکیر

بادِ تند و تیز ہو کہ ہو نسیمِ خوشگوار
وحشیانِ دشت ہوں یا ہوں حسینانِ چمن

چھوٹ جاتا ہے کمانِ ظلم سے بے ساختہ
عدل کی ہو دستگیری تو پلٹ آتا ہے تیر

اہلِ زر کی موت ہو یا اہلِ دل کی زندگی
عقل کی "دانشوری" یا عشق کا دیوانہ پن

عدل سے عنوان پاتے ہیں مضامینِ حیات
عدل جب بنتا ہے اخبارِ محبت کا مدیر

صورتِ لیلیٰ ہو کوئی یا کوئی تصویرِ قیس
جانِ پردہ دار ہو یا جسمِ بے گور و کفن

رکھ نہیں سکتا سفینے کا توازن بادباں
عدل سے واقف نہیں جب ناخدا کا ہی ضمیر

عدل جلوہ گر ہے ہر صورت میں، ہر تصویر میں
زندگی جکڑی ہوئی ہے عدل کی زنجیر میں

عدل ہو تو موجِ طوفاں بن نہیں سکتی کبھی
عدل کے آگے کسی میں تن نہیں سکتی کبھی

یہ نقوشِ زندگی، یہ رنگ و بو کی کائنات — اشک ہائے چشمِ شب سے صبحِ تازہ کی بہار
گردشِ شام و سحر، یہ روز و شب کے حادثات — آفتابِ عدل سے ہے خونِ انجم کا نکھار

یہ عروجِ آرزو، یہ جستجوؤں کی برات — عدل کو سب صاحبانِ مقتدر پہ اقتدار
عدل کے ہیں سب کرشمے، عدل کے ہیں معجزات — سرنگوں ہے بارگاہِ عدل میں ہر ذی وقار

اشکِ شبنم پر لرزتا ہے گلِ خنداں کا دل — عدل کرتا ہے غریبِ شہر کو بھی معتبر
ہے مرتب کچھ اسی عنواں سے مضمونِ حیات — عدل کے آگے امیرِ شہر بھی بے اختیار

پرتوِ خورشید سے ہے ماہ و انجم کو فروغ — معرکہ ہو بدر کا یا کہ ہو میدانِ اُحد
یہ جہاں آئینہ، تصویر، عکسِ حُسنِ ذات — غیرتِ شمشیرِ مومن عدل کی آئینہ دار

شہر کی ہنگامہ خیزی، دشت و صحرا کا سکوت — عدل کی تلوار سے ہے حق و باطل میں تمیز
یہ خرد کی داستانیں، یہ جنوں کے واقعات — عدل ہے ایمانِ مومن، مرضیِ پروردگار

موسمِ گل کا زمانہ ہو کہ ہو دورِ خزاں — عدل کی میزان میں لعل و جواہر ہی نہیں
خار سے ملتی نہیں ہے دامنِ گل کو نجات — بے حقیقت سنگریزوں کو بھی کرتی ہے شمار

مصرعِ موزوں ہے کوئی لفظ ناموزوں نہیں — عدل کو طوفان و ساحل پر ہے یکساں دسترس
اک مسلسل نظم ہے گویا نظامِ کائنات — موجِ سرکش کو نہیں ملتی عدالت سے فرار

روشنی ہے دو جہاں میں آفتابِ عدل سے — عدل سے بنتا ہے جب کوئی غلامِ زندگی
مر کے جینا سیکھتا ہے دل کتابِ عدل سے — دستِ قدرت کھینچ لیتا ہے زمامِ زندگی

عدل آئینِ وفا ہے، عدل دستورِ یقیں
عدل پیمانِ شریعت، عدل ہے معیارِ دیں

لاکھ مجرم چھپ رہے یا رنگ بدلے آستیں
جرم لیکن عدل کی آنکھوں سے چھپ سکتا نہیں

ہے جمالِ ماہتابی، ہے جلالِ آفتاب
عدل ہے آئینۂ فطرت کا عکسِ دل نشیں

عدل کے دل میں نہیں ہے امتیازِ رنگ و نسل
ہے نگاہِ عدل میں ہر رنگ، ہر صورت حسیں

عدل کے ہی زیرِ فرماں ہے نظامِ ہست و بود
اقتدارِ وقت بھی ہے عدل کے زیرِ نگیں

آسماں کی وسعتیں تارا ہیں چشمِ عدل میں
عدل کا ہے نقشِ پا یہ دور تک پھیلی زمیں

عدل مطلوبِ ازل ہے، عدل مقصودِ ابد
عدل پر قائم ہے دنیا، عدل پر قائم ہے دیں

اس جہانِ آب و گِل میں ہی نہیں ایمان عدل
عرصۂ محشر کے سینے پر بھی ہے میزانِ عدل

ڈاکٹر انور سدید

آخری لمحہ

یونہی اک روز
اس نے دل کی میں
خود فراموشی کے لمحے میں
مجھے یہ بات کہہ دی تھی
کہ وہ عمرِ رواں کے آخری زینے پہ بیٹھا
دیکھتا کرۂ روشن۔ تپیدہ درد
اترتا جا رہا ہے نردبانِ وقت سے آہستہ آہستہ
ہوا جاتا ہے گم آہستہ آہستہ
کسی پاتال میں
جو سب کا بھی اوجھل نگاہوں سے

وہ کہتا تھا
کہ میں بھی ایک سورج ہوں
مگر محسوس کرتا ہوں
کہ جیسے میں نہیں آیا تھا اس دنیا میں
لے کر روشنی کی ان گنت کرنیں
سفر میں نے کیا تھا، بس اندھیرے سے اندھیرے تک

کہا یہ اور پھر وہ
خود فراموشی کے لمحے میں
کہیں ایسا گیا کہ پھر نہیں دیکھا اسے میں نے
نہیں باتیں سنی اس کی
وہ لمحہ.....کون جانے؟
زیست کا تھا آخری لمحہ

امین راحت چغتائی

ردِ عمل

زخمِ دل! آج بہاروں کو دکھا آئینہ — تجھ پہ رہ رہ کے گلستاں کا گماں ہوتا ہے
مسکرا، غم کی عنایاتِ مسلسل کے طفیل — ٹیس اُٹھتی ہے تو احساس جواں ہوتا ہے۔

عام ہونے دے ذرا شیوۂ فرعون ابھی — یہی انداز کرے گا کئی موسیٰ پیدا
ظلمتیں مہرِ درخشاں کی قسم کھائیں گی — زندگی ہو گی نئے فکر و عمل کی شیدا

ظلم نے عیسیٰ مریم کو دیا بامِ عروج — رسن و دار نے تخلیق کیا ہے منصور
مہرِ خاموشی بھی اِک طرزِ بیاں رکھتی ہے — جبر و بیداد ہے سرچشمۂ ادراک و شعور

کون جانے یہی احساس کی نوخیز ترنگ — کتنی گل رنگ بہاروں کو لیے ابھری ہے
کتنی بے باک تمناؤں کا مظہر بن کر — ہر طرف دشت میں خوشبو کی طرح بکھری ہے

اوڑھ لو موت کا بے رنگ کفن چارہ گرو!
زندگی اُٹھی ہے خود درد کا درماں لے کر
اب نہ اندھیارے اجالوں سے کبھی اُلجھیں گے
صبح تو آئے گی پیغامِ بہاراں لے کر

احتشام ادیب

وصالِ نیم

پھر ایک روز کیا ہوا
وہ میری جانِ آرزو
وہی جو ایک عمر سے
مرے طویل و بے جہت سفر میں میرے ساتھ ہے
وہ جس کے دم سے میری زندگی میں اک نکھار ہے
وہ جس کا پیکرِ حسیں
خزانۂ بہار ہے
وہ جس کی مست انکھڑیوں میں جتنی دور تک بھی
دیکھیے
سرور ہی سرور ہے
خمار ہی خمار ہے
وہ مجھ سے پوچھنے لگی
وصال کے یہ روز و شب
تمھیں بھی کیا فراق کے سے لگتے ہیں

سید مشکور حسین یاد

وحی کا قرار

بات کریں دو لوگ
نکلے دھوپ
سامنے آئے طرح طرح کا روپ
شخصیت کی رونق بے پایاں کے اجالے
چھم چھم برسیں
جم جم برسیں
بات کریں دو لوگ۔ لطیف وقت ہو دو دو
بادِ نسیم چلے
لطفِ نسیم کی کلیاں چٹکیں
باغِ جہاں میں آئے بہار
دلوں پہ اترے
مصحفِ اطمینان۔ وحی قرار
بات کریں دو لوگ

سید صفدر حسین جعفری

مرے پاؤں جل رہے ہیں

نہ وہ زیرِ پا زمیں ہے نہ وہ سر پہ آسماں ہے
نہ وہ محملِ آرزو ہے نہ خیالِ دلبراں ہے

یہ مقام کون سا ہے مرے پاؤں جل رہے ہیں

نہ وہ نیلگوں فلک ہے نہ وہ بحرِ بیکراں ہے
نہ وہ مرکبِ ہوا ہے نہ وہ کشتِ کہکشاں ہے

یہ مقام کون سا ہے مرے پاؤں جل رہے ہیں

نہ وہ ذوقِ گفتگو ہے نہ وہ چشمِ جستجو ہے
نہ خیالِ کاخ و کو ہے نہ وہ حسنِ آرزو ہے

یہ مقام کون سا ہے مرے پاؤں جل رہے ہیں

نہ گلی میں شورِ طفلاں نہ وہ میزباں نہ مہماں
نہ کوئی نویدِ باراں نہ ہے کوئی ابرِ نیساں

یہ مقام کون سا ہے مرے پاؤں جل رہے ہیں

نہ وہ نالۂ شبانہ نہ وہ حرفِ محرمانہ
تب و تابِ عاشقانہ نہ ادائے دلبرانہ

یہ مقام کون سا ہے مرے پاؤں جل رہے ہیں

نہ عتابِ دوستانہ نہ عتابِ زمانہ
نہ روایتِ سحر ہے نہ حکایتِ شبانہ

یہ مقام کون سا ہے مرے پاؤں جل رہے ہیں

نہ ستارہ ہے نہ رہبر نہ جلوسِ کارواں ہے
مری آنکھ میں لہو ہے مرا دل دھواں دھواں ہے

یہ مقام کون سا ہے مرے پاؤں جل رہے ہیں

رباعیات صادقین
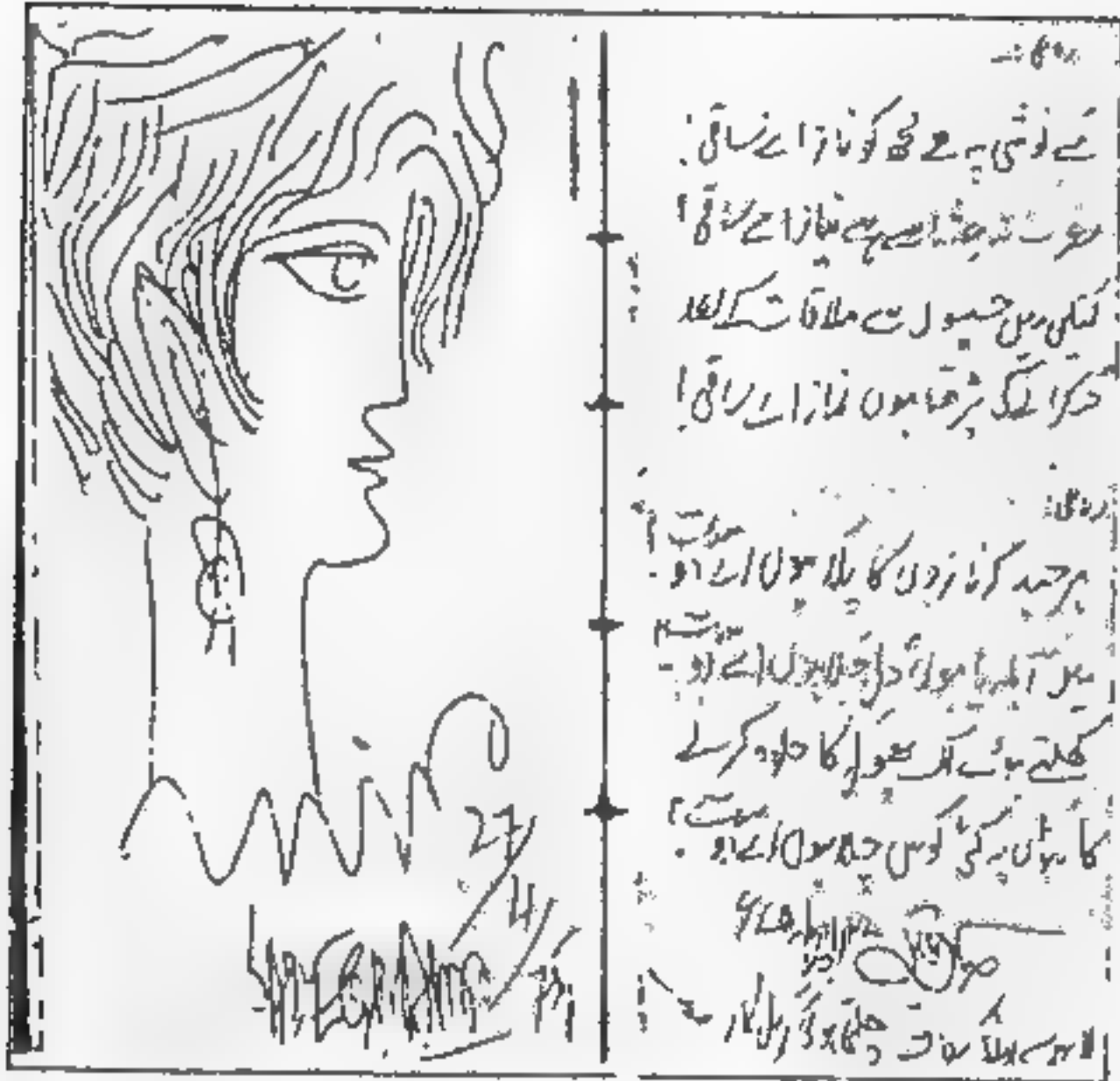
عظیم مصور صادقین مرحوم کی مندرجہ بالا رباعیات مرحوم ہی کی خود نوشتہ ہیں جو برادر عزیز پروفیسر محمد اویس جعفری نے امریکہ سے ارسال کی ہیں۔ رباعیات کے متصل ایک پنسل اسکیچ بھی ہے۔ یہ تحفۂ نادر و نایاب ہم نذر قارئین کرتے ہوئے جعفری صاحب کے مکتوب سے اقتباس بھی پیش کرتے ہیں ملاحظہ ہو "ایک صبح (۲۷ اپریل ۱۹۷۶ء) لاہور سے راولپنڈی تک صادقین صاحب کے ساتھ ریل کار میں سفر ہوا۔ بہت باتیں ہوئیں۔ وہ بہت دلچسپ گفتگو کرتے تھے۔ مستقل رباعیات سناتے گئے اور مختلف موضوعات پر گفتگو کی۔ میں "فکر اقبال" پڑھنے کیلئے سفر میں ساتھ لے گیا تھا۔ اس پر انہوں نے دو رباعیات لکھ دیں اور ایک تصویر بنا دی" (ادارہ)

عبدالعزیز خالد

رباعیات

برپا ہے یہ جشنِ رنگ و بو تیرے لیے
ہر جلوہ تجھے دعوتِ نظارہ دے
اے زاہدِ حجرہ گیرا نہ کر صرفِ نظر
لا تنسَ نصیبکَ منَ الدنیا☆ سے

○

ہوتا نہیں شعر ہر کلامِ موزوں
آئے نہ اثر ساز میں بے سوزِ دروں
ہر فن کو مناسبت ہے طبعی درکار
مجنوں کوئی بن سکے نہ بے ذوقِ جنوں!

○

ہر پھول جو کھلتا ہے مُنبر نہ چڑھے
قدرت نہ سلوک ایک سا سب سے کرے
لقمان سے بڑھ کے ہوں گے کتنے دانا
گمنام جیے اور جو گمنام مرے!

○

بولے تو لگے تار چھڑے بربط کے
چال ایسے جیسے موجِ صہبا لرزے
سانچے میں ڈھلے وہ متناسب اعضا
آنکھوں کی ہو سیری نہ طبیعت ہی بھرے!

○

کیوں اس نے شکایت کی اکیلے پن کی
کس عالم میں یہ بات غالب نے کہی:
"جیتے بھی کوئی میرا غم خوار نہیں
مرنے پہ عزادار نہ ہو گا کوئی!"

○

اک راز ہے سربستہ نظامِ قدرت
ادراک سے باہر ہے خدا کی حکمت
میلہ ہے پلک جھپک کا یہ بزمِ رواں
آتے ہی ملے جہاں پہ حکمِ رخصت

○

کرتا نہیں یاں خستہ نوازی کوئی
ہر شخص کو ہر دم رہے اپنی ہی پڑی
شاید یہ تمنا رہے حسرت ہی مدام
ہو دورِ زمانہ حسبِ دلخواہ کبھی!

○

کیوں دیکھ کے نقشہ ملتِ بیضا کا
آتا ہے مجھے یاد سلیمانی عصا
لگتا تھا بظاہر جو صحیح و سالم
اندر سے مگر ریختہ و دیمک خوردہ!

☆ کر فراموش نہ دنیا میں سے اپنا حصہ

شریف فاروق

خاطر غزنوی۔۔۔حیرت انگیز شخصیت

پروفیسر خاطر غزنوی کی رحلت میرے لئے ایک سانحہ ہے جس کا گہرا زخم جب تک میں زندگی کی کشاکش سے دوچار ہوں رستا رہے گا۔ خاطر کا شمار میری زندگی میں شامل ان دوستوں میں ہوتا ہے جنہیں میں مرحوم نہیں قرار دے سکتا کیونکہ اس کی شخصیت کی ایک ایک رمق میرے نہاں خانہ دل و دماغ میں سرگرداں ہے۔ جب کسی ایسے دوست کی یاد کا یہ تڑپا دینے والا عالم ہو تو آپ ہی بتایئے اسے مرحوم کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟ بے شک وہ میری نظروں سے ہی نہیں زمانے کی نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے لیکن اس کی تابندہ صورت کا ایک ایک نقش میرے سامنے جلوہ فگن ہے۔ اسے میں نے آخری بار سفید پیراہن میں ملبوس حضرت شیخ جنید بابا کے قبرستان میں منوں مٹی کے سپرد ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں چاہوں بھی تو یہ خاموش لیکن دل دوز منظر زندگی کے کسی لمحے میں بھلا نہیں سکتا۔ وہ ہم سے ضرور روپوش ہو گیا لیکن اس کے باوجود اپنی شرافت و نجابت، اور علمی و ادبی کاوشوں اور مجلس آرائیوں کی وجہ سے زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔

سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس کی کس خوبی کا آغاز کہاں سے کروں؟ پاکباز، صاحب کردار، پیکر شرافت خاطر کی شخصیت کثیر الجہت تھی۔ اس کی زندگی کی ہر جہت پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن اس کے لئے ایک طویل فرصت کی ضرورت ہے بہرحال اس کی زندگی کی داستان میرے لئے طویل اور دلگداز ہے کیونکہ میں نے اسے اس کی جان لیوا بیماری کے ساتھ طویل جنگ آزمائی کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کی زندگی کے آخری ایام میرے سامنے گزرے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ وہ کسی طرح بھی موت کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ جس طرح وہ تمام مہمات حیات سے ٹکراتا منزل کی طرف بڑھتا رہا اسی طرح اس کی زندگی کے آخری ایام بھی نشیب و فراز میں لپٹے ہوئے تھے لیکن اس نے ان سنگین مراحل کو نہایت باوقار انداز سے بسر کیا وہ جونہی سنبھالا لیتا اس کا دماغ متحرک اور پورا جسم فعال ہو جاتا۔ ایک لمحے کے بعد بجلی کے کرنٹ کی طرح اس کے تخلیقی عمل کا آغاز ہو جاتا، اس لئے جب وہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش ہوگا تو اپنی

عبدالعزیز خالد

رباعیات

برپا ہے یہ جشنِ رنگ و بو تیرے لیے
ہر جلوہ تجھے دعوتِ نظارہ دے
اے زاہد حجرہ مزا نہ کر صرفِ نظر
لاتنسَ نصیبکَ من الدنیا ☆ سے

○

ہوتا نہیں شعر ہر کلامِ موزوں
آئے نہ اثر ساز میں بے سوزِ دروں
ہر فن کو مناسبت ہے طبعی درکار
مجنوں کوئی بن سکے نہ بے ذوقِ جنوں!

○

ہر پھول جو کھلتا ہے منبر نہ چڑھے
قدرت نہ سلوک ایک سا سب سے کرے
لقمان سے بڑھ کے ہوں گے کتنے دانا
گمنام جیے اور جو گمنام مرے!

○

بولے تو لگے تار چھڑے بربط کے
چال ایسے جیسے موجِ صہبا لرزے
سانچے میں ڈھلے وہ متناسب اعضا
آنکھوں کی ہو سیری نہ طبیعت ہی بھرے!

○

کیوں اس نے شکایت کی اکیلے پن کی
کس عالم میں یہ بات غالب نے کہی:
"جیتے جی کوئی میرا غم خوار نہیں
مرنے پہ عزادار نہ ہو گا کوئی!"

○

اک راز ہے سربستہ نظامِ قدرت
ادراک سے باہر ہے خدا کی حکمت
میلہ ہے لپک جھپک کا یہ بزمِ رواں
"آتے ہی ملے جہاں پہ حکمِ رخصت

○

کرتا نہیں یاں خستہ نوازی کوئی
ہر شخص کو ہر دم رہے اپنی ہی پڑی
شاید یہ تمنا رہے حسرت ہی مدام
ہو دورِ زمانہ حسبِ دلخواہ کبھی!

○

کیوں دیکھ کے نقشِ ملتِ بیضا کا
آتا ہے مجھے یاد سلیمانی عصا
لگتا تھا بظاہر جو صحیح و سالم
اندر سے مگر ریختہ و دیمک خوردہ!

☆ کر فراموش نہ دنیا میں سے اپنا حصہ

شریف فاروقی

خاطر غزنوی۔۔۔حیرت انگیز شخصیت

پروفیسر خاطر غزنوی کی رحلت میرے لئے ایک سانحہ ہے جس کا گہرا زخم جب تک میں زندگی کی کشاکش سے دوچار ہوں رستا رہے گا۔ خاطر کا شمار میری زندگی میں شامل ان دوستوں میں ہوتا ہے جنہیں میں مرحوم نہیں قرار دے سکتا کیونکہ اس کی شخصیت کی ایک ایک رمق میرے نہاں خانہ دل و دماغ میں سرگرداں ہے۔ جب کسی ایسے دوست کی یاد کا یہ تڑپا دینے والا عالم ہو تو آپ ہی بتایئے اسے مرحوم کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟ بے شک وہ میری نظروں سے ہی نہیں زمانے کی نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے لیکن اس کی تابندہ صورت کا ایک ایک نقش میرے سامنے جلوہ فگن ہے۔ اسے میں نے آخری بار سفید کفن میں ملبوس حضرت شیخ جیہ باباؒ کے قبرستان میں منوں مٹی کے سپرد ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں چاہوں بھی تو یہ خاموش لیکن دل دوز منظر زندگی کے کسی لمحے میں بھلا نہیں سکتا۔ وہ ہم سے ضرور روپوش ہو گیا لیکن اس کے باوجود اپنی شرافت و نجابت اور علمی و ادبی کاوشوں اور مجلس آرائیوں کی وجہ سے زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔

مجھ میں نہیں آ رہا کہ اس کی کس خوبی کا آغاز کہاں سے کروں؟ پاکباز، صاحب کردار، پیکر شرافت خاطر کی شخصیت کثیر الجہت تھی۔ اس کی زندگی کی ہر جہت پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن اس کے لئے ایک طویل فرصت کی ضرورت ہے۔ بہر حال اس کی زندگی کی داستان میرے لئے طویل اور دلگداز ہے کیونکہ میں نے اسے اس کی جان لیوا بیماری کے ساتھ طویل جنگ آزمائی کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کی زندگی کے آخری ایام میرے سامنے گزرے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ وہ کسی طرح بھی موت کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ جس طرح وہ تمام عمر مجاہد حیات سے ٹکراتا منزل کی طرف بڑھتا رہا اسی طرح اس کی زندگی کے آخری ایام بھی نشیب و فراز میں لپٹے ہوئے تھے لیکن اس نے ان سنگین مراحل کو نہایت باوقار انداز سے بسر کیا وہ جونہی سنبھالا لیتا اس کا دماغ متحرک اور پورا جسم فعال ہو جاتا۔ ایک لمحے کے بعد بجلی کے کرنٹ کی طرح اس سے تخلیقی عمل کا آغاز ہو جاتا۔ اس لئے جب وہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش ہوگا تو اپنی

زندگی کے ایک ایک لمحے کا حساب یہ کہہ کر پیش کردے گا کہ "شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم"

آج سے چند سال قبل میں نے گرین ہوٹل میں اس کے اعزاز میں "شام خاطر" کا اہتمام کیا۔ اس میں پروفیسر اشرف بخاری مرحوم، پروفیسر محسن احسان اور پروفیسر پریشان خٹک سمیت بہت سے دوستوں نے شرکت کی اور خاطر کی خدمات کا اعتراف کیا۔ اس موقع پر خاطر کی کاوش ہائے باکمال کا DISPLAY اس کے صاحبزادے بہزاد نے نہایت مہارت سے کیا۔ اس تقریب سے ایک خاتون نے جو اپنے زمانے کی نابغۂ روزگار تھیں بھری محفل میں کوئی نصف صدی بعد انکشاف کیا کہ جب وہ پہلی بار ریڈیو پاکستان پشاور سے تقریر کرنے کے لئے گئیں، خاطر اس وقت ڈیوٹی آفیسر تھے، میں ان کی سحر انگیز شخصیت کا شکار ہوگئی اس عمر کی تڑپ کو اب تک سینے سے لگائے رکھا ہے یعنی

جوانی مٹ گئی لیکن خلش دردِ محبت کی   جہاں محسوس ہوتی تھی وہیں محسوس ہوتی ہے

ظاہر ہے یہ انتہائی محترم لیکن اپنے عہدِ شباب میں ہوش ربا خاتون تھیں، خاطر کی شخصی صباحت کے تیروں کی خلش کو خاموشی سے عمر بھر محسوس کرتی رہیں۔ یہ کوئی انوکھا واقعہ نہیں وارداتِ قلب کی ایذا رسانیوں کی کونپلیں اسی سے پھوٹتی ہیں۔ خاطر انتہائی باکردار اور اخلاق کی بلندیوں کا پیکرِ حسین و جمیل تھا۔ اگر اسے ماڈرن صوفی باصفا اور دانشور شخصیت قرار دوں تو بے جا نہ ہوگا۔ خاطر ایک بے باک اور پرجوش محبِ وطن تھا۔ جب وہ کوالالمپور یونیورسٹی کی اردو چیئر پر تھا تو اس نے اردو اور مالائی زبان کے دو ہزار مشترک الفاظ کی حیرت انگیز ڈکشنری مرتب کر کے ملائیشیا اور پاکستان کی تاریخ علم و ادب میں مقامِ دوام حاصل کرلیا۔ اسے حکومت ملائیشیا نے اس کی اس تحقیقی کاوش کے نتیجہ میں اعزازی ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری بھی دی۔ تدریس اردو اور تحقیق علم کے ساتھ ساتھ خاطر نے ایک اور تاریخ ساز کارنامہ سرانجام دیا۔ پاکستان کے خلاف بھارتی سفارتخانے ویسے تو متحرک رہتے ہی ہیں لیکن ملائیشیا میں ان کی لابی چونکہ انڈین ہندو کمیونٹی کی وجہ سے خاصی مضبوط تھی، اس لئے پاکستان اور قائداعظم کی شخصیت کی کردارکشی اور گاندھی کی 'مہاتمائیت' کے لئے طومار باندھ دیا۔ بھارتی سفارت خانہ کی معاونت سے

میاں غلام قادر

احمد فراز کی یاد میں

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب راقم الحروف محکمہ ٹیلی فون میں پشاور میں اسسٹنٹ انجینئر تعینات تھا۔ ایک روز دیکھا کہ دفتر کے باہر فراز صاحب ہاتھ میں کوئی کاغذ لے کر پریشان گھوم رہے ہیں۔ فوری طور پر ان کی پذیرائی کی۔ دفتر میں پاس بٹھا کر چائے سے خاطر تواضع کی۔ کاغذ ان کے ہاتھ سے لے کر اپنے سپروائزر کو دیا اور چند منٹوں میں فراز صاحب کا ٹیلی فون کا قضیہ حل ہو گیا۔

راقم کا سرکاری گھر کمپاؤنڈ کے اندر تھا۔ فراز صاحب نے بیٹھک میں دیواروں پر ماچسیں ہی ماچسیں دیکھیں تو بہت محظوظ ہوئے اور لائبریری ملاحظہ فرما کر بے حد داد دی۔

کچھ ہی عرصہ بعد سکھر سے پیشہ وارانہ تربیت کے لئے مجسٹریٹ نوجوانوں کی ایک کلاس پشاور آئی۔ ان میں راقم کا ایک پرانا دوست بھی تھا۔ وہ سب کو لے کر غریب خانے آیا۔ ایک نوجوان نے خواہش ظاہر کی کہ کسی طور فراز صاحب کا دیدار ہو۔ دوسرے کمرے میں جا کر فراز صاحب کے گھر فون کیا۔ وہ ابھی ابھی یونیورسٹی پہنچے تھے۔ ان کو ان کے چاہنے والے کا پیغام پہنچایا تو الٹے پاؤں اپنے جانے پہچانے سکوٹر پر ٹیلی فون ایکسچینج پہنچے اور سکھر سے آئے تمام افسران کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ نوجوان مجسٹریٹ فراز صاحب کے نادیدہ عاشق تھے۔ بڑی خوش گوار بات چیت ہوئی اور کافی دیر بعد مہمان غریب خانے سے شاداں و فرحاں رخصت ہوئے۔ ایک بات ضرور ہوئی کہ فراز صاحب نے اپنے اشعار سنانے سے معذرت طلب کی کہ اس طرح کی محفلوں میں وہ اشعار نہیں سناتے!

پشاور میں فراز صاحب پاکستان نیشنل سنٹر کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ ایک دفعہ فیض صاحب کے اعزاز میں ایک پُروقار تقریب منعقد تھی۔ فراز صاحب نے راقم الحروف کو ہال میں داخل ہوتے دیکھا تو فرمایا: فیض صاحب کی خدمت میں پیش کرنے کو ان

زندگی کے ایک ایک لمحے کا حساب یہ کہہ کر پیش کر دے گا کہ "شام از زندگی خویش کہ کارے کردم"

آج سے چند سال قبل میں نے گرین ہوٹل میں اس کے اعزاز میں "شام خاطر" کا اہتمام کیا۔ اس میں پروفیسر اشرف بخاری مرحوم، پروفیسر محسن احسان اور پروفیسر پریشان خٹک سمیت بہت سے دوستوں نے شرکت کی اور خاطر کی خدمات کا اعتراف کیا۔ اس موقع پر خاطر کی کاوش ہائے باکمال DISPLAY اس کے صاحبزادے بہزاد نے نہایت مہارت سے کیا۔ اس تقریب سے ایک خاتون نے جو اپنے زمانے کی نابغۂ روزگار تھیں، بھری محفل میں کوئی نصف صدی بعد انکشاف کیا کہ جب وہ پہلی بار ریڈیو پاکستان پشاور سے تقریر کرنے کے لئے گئیں، خاطر اس وقت ڈیوٹی آفیسر تھے، میں ان کی سحر انگیز شخصیت کا شکار ہو گئی اس سحر کی تڑپ کو اب تک سینے سے لگائے رکھا ہے یعنی

جوانی مٹ گئی لیکن خلش دردِ محبت کی جہاں محسوس ہوتی تھی وہیں محسوس ہوتی ہے

ظاہر ہے یہ انتہائی محترم لیکن اپنے عہدِ شباب میں ہوش ربا خاتون تھیں، خاطر کی شخصی صباحت کے تیروں کی خلش کو خاموشی سے عمر بھر محسوس کرتی رہیں۔ یہ کوئی انوکھا واقعہ نہیں واردات قلب کی ایذا رسانیوں کی کونپلیں اسی سے پھوٹتی ہیں۔ خاطر انتہائی باکردار اور اخلاق کی بلندیوں کا پیکرِ حسین وجمیل تھا۔ اگر اسے ماڈرن صوفی باصفا اور دانشور شخصیت قرار دوں تو بے جا نہ ہوگا۔ خاطر ایک بے باک اور پرجوش محبِ وطن تھا۔ جب وہ کوالالمپور یونیورسٹی کی اردو چیئر پر تھا تو اس نے اردو اور مالائی زبان کے دو ہزار مشترک الفاظ کی حیرت انگیز ڈکشنری مرتب کر کے ملائیشیا اور پاکستان کی تاریخ علم وادب میں مقام ودوام حاصل کر لیا۔ اسے حکومت ملائیشیا نے اس کی اس تحقیقی کاوش کے نتیجہ میں اعزازی ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری بھی دی۔ تدریس اردو اور تحقیق علم کے ساتھ ساتھ خاطر نے ایک اور تاریخ ساز کارنامہ سرانجام دیا۔ پاکستان کے خلاف بھارتی سفارتخانے ویسے تو متحرک رہتے ہی ہیں لیکن ملائیشیا میں ان کی لابی چونکہ انڈین ہندو کمیونٹی کی وجہ سے خاصی مضبوط تھی، اس لئے پاکستان اور قائداعظم کی شخصیت کی کردارکشی اور گاندھی کی 'مہاتمائیت' کے لئے طومار باندھ دیا۔ بھارتی سفارت خانہ کی معاونت سے

میاں غلام قادر

احمد فراز کی یاد میں

یہ ان دنوں کی بات ہے جب راقم الحروف محکمہ ٹیلی فون میں پشاور میں اسسٹنٹ انجینئر تعینات تھا۔ ایک روز دیکھا کہ دفتر کے باہر فراز صاحب ہاتھ میں کوئی کاغذ لے کر پریشان گھوم رہے ہیں۔ فوری طور پر ان کی پذیرائی کی۔ دفتر میں پاس بٹھا کر چائے سے خاطر تواضع کی۔ کاغذ ان کے ہاتھ سے لے کر اپنے سپروائزر کو دیا اور چند منٹوں میں فراز صاحب کا ٹیلی فون کا قضیہ حل ہو گیا۔

راقم کا سرکاری گھر کیپا ؤنڈ کے اندر تھا۔ فراز صاحب نے بیٹھک میں دیواروں پر ماچسیں ہی ماچسیں دیکھیں تو بہت محظوظ ہوئے اور لائبریری ملاحظہ فرما کر بےحد داد دی۔

کچھ ہی عرصہ بعد سکھر سے پیشہ وارانہ تربیت کے لئے مجسٹریٹ نوجوانوں کی ایک کلاس پشاور آئی۔ ان میں راقم کا ایک پرانا دوست بھی تھا۔ وہ سب کو لے کر غریب خانے آیا۔ ایک نوجوان نے خواہش ظاہر کی کہ کسی طور فراز صاحب کا دیدار ہو۔ دوسرے کمرے میں جا کر فراز صاحب کے گھر فون کیا۔ وہ ابھی ابھی یونیورسٹی پہنچے تھے۔ ان کو ان کے چاہنے والے کا پیغام پہنچایا تو الٹے پاؤں اپنے جانے پہچانے سکوٹر پر ٹیلی فون ایکسچینج پہنچے اور سکھر سے آئے تمام افسران کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ نوجوان مجسٹریٹ فراز صاحب کے نادیدہ عاشق تھے۔ بڑی خوشگوار بات چیت ہوئی۔۔۔ کافی دیر بعد مہمان غریب خانے سے شاداں و فرحاں رخصت ہوئے۔ ایک بات ضرور ہوئی کہ فراز صاحب نے اپنے اشعار سنانے سے معذرت طلب کی کہ اس طرح کی محفلوں میں وہ اشعار نہیں سناتے!

پشاور میں فراز صاحب پاکستان نیشنل سنٹر کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ ایک دفعہ فیض صاحب کے اعزاز میں ایک پُر وقار تقریب منعقد تھی۔ فراز صاحب نے راقم الحروف کو ہال میں داخل ہوتے دیکھا تو فرمایا فیض صاحب کی خدمت میں پیش کرنے کو ان

کا کوئی خوبصورت شعر سنایئے۔ راقم چونکہ حج سے آیا تھا، عرض کیا۔ فراز صاحب! مدینہ منورہ میں مسجد نبویؐ میں حاضری دے رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ حالِ دل بیان کرنے کے لیے کہاں سے شروع کروں۔ عرب آ رہے تھے اور بہترین الفاظ میں اپنا نذرانۂ عقیدت پیش کر رہے تھے اور میں گونگوں کی مانند مہر بہ لب کھڑا تھا۔ اچانک فیض صاحب کا ایک شعر یاد آ گیا۔ جو نہ جانے، انھوں نے کس عالم میں کس موقع پر کہا ہوگا۔ آپ بھی سنیئے:

لو وصل کی ساعت آ پہنچی پھر حکم حضوری پر ہم نے　　　آنکھوں کے دریچے بند کیے اور سینے کا در باز کیا!

☆ ۱۹۶۳ء کا پشاور ☆

(احمد فراز　مہدی افضل　سید محمود علی)

اس شعر کے یاد آتے ہی آنکھوں سے سیل اشک رواں ہوا اور اس کے بعد جو کیفیت طاری ہوئی وہ ناقابل بیان ہے۔ فراز صاحب نے فیض صاحب کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کرتے ہوئے فرمایا "فیض صاحب کے کلام کی خوبی یہ ہے کہ ان کے خوبصورت اشعار ہر مسلک کے لوگ، اقبالؔ کے کلام کی طرح بوقت ضرورت استعمال کرکے کمل لوٹ لیتے ہیں۔ ابھی ابھی ایک "حاجی صاحب" نے فیض صاحب کا یہ شعر سنا کر طبیعت خوش کر دی۔

"لو وصل کی ساعت آ پہنچی پھر حکم حضوری پر ہم نے　　　آنکھوں کے دریچے بند کیے اور سینے کا در باز کیا"

فراز صاحب چین گئے تو راقم الحروف کے لیے چینی ماچسوں کا ایک خوبصورت پیکٹ ساتھ لائے۔ انھیں میرے اس شوق کا خوب علم تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس پیکٹ کی پشت پر ان کی ایک "ناتمام غزل" موجود ہے۔ جس کا مقطع ہے:

فراز اس بُتِ کافر میں کوئی بات تو ہے　　　کہ معترف ہیں ہم اہلِ کتاب بھی اس کے!

کے سفر میں یادگار سنگ ہائے میل تعمیر کر چکے ہیں۔ اُن کی مختلف زبانوں پر گرفت جن میں کثیر الجہت اردو کے علاوہ فارسی، ہندی اور سنسکرت بھی شامل ہیں اُن کا طرۂ امتیاز بن چکی ہے۔ وہ غالب کے شارح بھی ہیں اور مترجم بھی۔ ثانی الذکر حیثیت میں مکتوبات فارسی غالب کو اردو زبان کے قالب میں ڈھال کر عظیم علمی و ادبی کارنامہ سرانجام دیا ہے اور غالب کو جو فارسی اور اردو شعری پر شکوہ اقلیم کے تاجدار کی حیثیت سے اپنا نقش دوام لوحِ روزگار پر ثبت کر چکا تھا' مزید امر بنا دیا ہے۔ فارسی شعر و ادب اُنکے کلام میں عکس ذرنگار بن کر جھلکتے ہیں۔ اردو اور ہندی سنسکرت ہی نہیں بلکہ دیگر علاقائی زبانیں بھی اُنکی شعری تخلیقات میں اسلوب و آہنگ کا دلپذیر تنوع بن کر نمایاں نظر آتی ہیں۔ ان کی تصنیف تازہ کے تقریظ نگار حضرت احمد ندیم قاسمی ان محاسن کا احاطہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اردو میں کم ہی شعراء کے ہاں موضوع و اسلوب کا اتنا بھرپور تنوع دستیاب ہے۔ ان معنوں میں پرتو روہیلہ کی فنی حیثیت منفرد ہے۔''

دوم

''پرتو کا فن انسانی زندگی کی بوقلمونی کی نمائندگی کرتا ہے۔ اُس کے ہاں مشاہدات و تجربات کی ایک دنیا آباد ہے۔''

سوم

''اظہار کا یہ عالم ہے کہ وہ خالص ہندی اور اردو زبان کی نزاکتوں سے کام لینے کے علاوہ بعض پشتو اور پنجابی الفاظ بھی اتنی بے ساختگی اور روانی سے استعمال کر جاتا ہے کہ وہ اردو کا حصہ معلوم ہونے لگتے ہیں۔''

چہارم

''پرتو کی ساری شاعری اس کی ذاتی واردات کا اظہار ہے اور یہ اظہار بے تکلفانہ اور بے ساختہ ہے.....اُس کا براہِ راست انداز دراصل براہِ راست دل میں اُتر جانے کا انداز ہے۔''

قاسمی صاحب نابغۂ روزگار شخصیت تھے چنانچہ ''مستند ہے اُنکا فرمایا ہوا'' اور اس سند کو اعتبار پرتو کا تازہ شعری مجموعہ ''اثاثے شب'' مہیا کرتا ہے کہ اس میں (۱) تنوع (۲) مشاہدات و

کا کوئی خوبصورت شعر سنا ہے۔ راقم نیا نیا حج سے آیا تھا، عرض کیا فراز صاحب! مدینہ منورہ میں مسجد نبویؐ میں حاضری دے رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ حال دل بیان کرنے کے لئے کہاں سے شروع کروں۔ عرب آ رہے تھے اور بہترین الفاظ میں اپنا نذرانۂ عقیدت پیش کر رہے تھے اور میں گونگوں کی مانند مہر بہ لب کھڑا تھا۔ اچانک فیض صاحب کا ایک شعر یاد آ گیا۔ جو نہ جانے، انہوں نے کس عالم میں کس موقع پر کہا ہوگا۔ آپ بھی سنئے:

لو وصل کی ساعت آ پہنچی اور حکم حضوری پر ہم نے   آنکھوں کے دریچے بند کئے اور سینے کا در باز کیا!

☆ ۱۹۶۳ء کا پشاور ☆

(احمد فراز، [illegible]، سید منصور علی)

اس شعر کے یاد آتے ہی آنکھوں سے سیل اشک رواں ہوا اور اس کے بعد جو کیفیت طاری ہوئی وہ ناقابل بیان ہے۔ فراز صاحب نے فیض صاحب کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کرتے ہوئے فرمایا ''فیض صاحب کے کلام کی خوبی یہ ہے کہ ان کے خوبصورت اشعار ہر مسلک کے لوگ، اقبالؒ کے کلام کی طرح بوقت ضرورت استعمال کر کے محفل لوٹ لیتے ہیں۔ ابھی ابھی ایک ''حاجی صاحب'' نے فیض صاحب کا یہ شعر سنا کر طبیعت خوش کر دی۔

''لو وصل کی ساعت آ پہنچی اور حکم حضوری پر ہم نے   آنکھوں کے دریچے بند کئے اور سینے کا در باز کیا''

فراز صاحب چین گئے تو راقم الحروف کے لئے چینی ماچسوں کا ایک خوبصورت پیکٹ ساتھ لائے۔ انہیں میرے اس شوق کا خوب علم تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس پیکٹ کی پشت پر ان کی ایک ''ناتمام غزل'' موجود ہے، جس کا مقطع ہے:

فراز اس بت کافر میں کوئی بات تو ہے   کہ معترف ہیں ہم اہل کتاب بھی اس کے!

کے سفر میں یادگار سنگ ہائے میل تعمیر کر چکے ہیں۔ ان کی مختلف زبانوں پر گرفت جن میں کثیر الجہت اردو کے علاوہ فارسی، ہندی اور سنسکرت بھی شامل ہیں اُن کا طرۂ امتیاز بن چکی ہے۔ وہ غالب کے شارح بھی ہیں اور مترجم بھی۔ ثانی الذکر حیثیت میں مکتوبات فارسی غالب کو اردو زبان کے قالب میں ڈھال کر عظیم علمی و ادبی کارنامہ سرانجام دیا ہے اور غالب کو جو فارسی اور اردو شعر کی پرشکوہ اقلیم کے تاجدار کی حیثیت سے اپنا نقش دوام لوحِ روزگار پر ثبت کر چکا تو 'مزید امر بنا دیا ہے۔ فارسی شعر و ادب اُنکے کلام میں عکسی زرنگار بن کر جھلکتے ہیں۔ اردو اور ہندی سنسکرت ہی نہیں بلکہ دیگر علاقائی زبانیں بھی اُکی شعری تخلیقات میں اسلوب و آہنگ کا دلپذیر تنوع بن کر نمایاں نظر آتی ہیں۔ اُن کی تصنیفِ تازہ کے تقریظ نگار حضرت احمد ندیم قاسمی ان محاسن کا احاطہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اردو میں کم ہی شعراء کے ہاں موضوع و اُسلوب کا اتنا بھرپور تنوع دستیاب ہے۔ ان معنوں میں پرتو روہیلہ کی فنی حیثیت منفرد ہے۔'' دوم

''پرتو کا فن انسانی زندگی کی بوقلمونی کی نمائندگی کرتا ہے۔ اُس کے ہاں مشاہدات و تجربات کی ایک دنیا آباد ہے۔'' سوم

''اظہار کا یہ عالم ہے کہ وہ خالص ہندی اور اردو زبان کی نزاکتوں سے کام لینے کے علاوہ بعض پشتو اور پنجابی الفاظ بھی اتنی بے ساختگی اور روانی سے استعمال کر جاتا ہے کہ وہ اردو کا حصہ معلوم ہونے لگتے ہیں۔'' چہارم

''پرتو کی ساری شاعری اس کی ذاتی واردات کا اظہار ہے اور یہ اظہار بے تکلفانہ اور بے ساختہ ہے۔ اُس کا براہِ راست انداز دراصل براہِ راست دل میں اُتر جانے کا انداز ہے۔''

قاسمی صاحب نابغۂ روزگار شخصیت تھے چنانچہ ''مستند ہے اُنکا فرمایا ہوا'' اور اس سند کو اعتبار پرتو کا تازہ شعری مجموعہ ''اجالے شب'' مہیا کرتا ہے کہ اس میں (۱) تنوع (۲) مشاہدات و

تجربات کی وسعت (۳) لسانی کثیر الجہتی اور (۴) اسلوب و اظہار کا دل میں اُتر جانے والا بے تکلفانہ اور بے ساختہ انداز بیک وقت بین السطور اور جلی السطور برملا دکھائی دیتا ہے:

کب تاب دید ہے کہ نظارہ کرے کوئی — نیرنگیٔ جہاں کا تماشہ کرے کوئی
ہر آرزو کہ ایک غزالِ رمیدہ ہے — کس کس کا دشتِ شوق میں پیچھا کرے کوئی
فرصت کہاں کہ لوحِ تصور پہ تیرا نقش — مژگانِ آرزو سے ابھارا کرے کوئی

مرا وجود تھا آوازِ زیرِ لب کی طرح — بساطِ وقت پہ اک آہِ بے سبب کی طرح
حریمِ دیدہ و دل میں حلیمِ خاطر میں — وہ گونجتا ہے صدا انجمائے شب کی طرح
مجھے بھی ساتھ ہی لے چل ہوائے کوئے سحر — کہ جل رہا ہوں چراغِ وداعِ شب کی طرح

جبیں کو ماہ کیا آنکھ کو ستارہ کیا — تو روشنی سے ترا حسن استعارہ کیا
نگاہ اب بھی طلسماتِ نور میں گم ہے — جہانِ حسن کا اس رنگ میں نظارہ کیا
نکالی فال تو روئے نکو کے مصحف سے — پرُخ جمیل کی آیت سے استخارہ کیا

پرتو کا حسنِ نگارش مرہونِ منت ہے اُن کے مطالعۂ فارسی کا جس کے متعلق غالب نے کہا تھا کہ "فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ" چنانچہ "انجمائے شب" ایسے "نقش ہائے رنگ رنگ" سے مرصع نظر آتا ہے۔ 'غزالِ رمیدہ، لوحِ تصور، مژگانِ آرزو، آوازِ زیرِ لب، آہِ بے سبب، حریمِ دیدہ و دل، حلیمِ خاطر، چراغِ وداعِ شب اور طلسماتِ نور وغیرہ ایسی پُرشکوہ تراکیب و اختراعات ہیں جو کلام کو حسنِ اسلوب ہی نہیں حسنِ معنی بھی عطا کرتی ہیں۔ استعارہ و تشبیہ اور کنایہ کا ایک جہانِ طلسمات ہے جو از اول تا آخر کلام پرتو کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ایک خوبصورت مثال:

طلوعِ صبح کا منظر تھا اس گریباں پہ — میں سوچتا تھا کہ سورج کہاں دکھائی دیا

پرتو نے کتاب کے آخری صفحات 'دوہوں' کی نذر کیے ہیں جو اُنکے شاعرانہ تشخص کی ایک اہم جہت بھی ہیں اور قدرتِ کلام کا نمونہ بھی۔ آخر میں اُنکی ثنائیت پرور فکر پر مبنی ایک مترنم بحر میں غزل سے چند اشعار پیش کرتا ہوں اور اجازت چاہتا ہوں:

کسی حسینہ کی ٹوٹی گاگر کے ٹھیکروں کی طرح ہیں ویراں
وہ لب کہ جن پر کبھی بہاروں کی پُرسکوں تازگی ملی ہے
کبھی جو ماضی کے پیرہن میں سے یاد کی انگلی پہ ڈالے
تو ململی ریشمی تہوں میں گلوں کی خوشبو بسی ملی ہے
سیاہ راتوں کی چادروں پہ بنوکِ مژگاں لکھا ہے میں نے
وہ ایک فسانہ حقیقتوں کو بھی جس سے تابندگی ملی ہے

کتاب: مسلم شمیم۔ شخصیت و فن (مقالہ برائے ایم۔اے اردو)

مصنفہ: شہلا نازنین

مبصر: سید منصور عاقل

ناشر: کاروانِ امن۔ کراچی

قیمت: دو سو روپے

یہ رجحان کہ معاصر شخصیات کے فکر و فن پر نصابی مقالات لکھے جائیں ایک فال نیک بن کر سامنے آیا ہے۔ تاہم جامعات کے لئے لازم ہے کہ وہ علمی و تحقیقی معیار اور بامعنی و مربوط مواد کی مقدار کو یقینی بنانے کے لئے ذمہ دارانہ کردار ادا کریں۔ اس ضمن میں ایسی نگارشات بھی ہمارے زیرِ مطالعہ آئیں جن سے معیار و مقدار دونوں اعتبار سے فکری و معنوی تہی دامنی کے سوا کوئی اور تاثر مرتب نہ ہو سکا لیکن کراچی یونیورسٹی کی طالبہ شہلا نازنین کا زیرِ نظر مقالہ اُن کی معیاری تحقیق اور کثیرالاوصاف ایسی شخصیت کے انتخاب پر ستائش کا مستحق ہے جو جامعہ کی طرف سے سندِ اعتبار عطا

تجربات کی وسعت (۳) لسانی کثیر الجہتی اور (۴) اسلوب و اظہار کا دل میں اتر جانے والا بے تکلفانہ اور بے ساختہ انداز یک وقت بین السطور اور بین السطور برملا دکھائی دیتا ہے:

کب تابِ دید ہے کہ نظارہ کرے کوئی | نیرنگیٔ جہاں کا تماشہ کرے کوئی
ہر آرزو کہ ایک غزالِ رمیدہ ہے | کس کس کا دشتِ شوق میں پیچھا کرے کوئی
فرصت کہاں کہ لوحِ تصور پہ تیرا نقش | مژگانِ آرزو سے سنوارا کرے کوئی

مرا وجود تھا آوازِ زیرِ لب کی طرح | بساطِ وقت پہ اک آہِ بے سبب کی طرح
حریمِ دیدہ و دل میں حلیمِ خاطر میں | وہ گونجتا ہے سدا اپنجائے شب کی طرح
مجھے بھی ساتھ ہی لے چل ہوائے کوئے سحر | کہ جل رہا ہوں چراغِ ودائے شب کی طرح

جبیں کو ماہ کیا آنکھ کو ستارہ کیا | تو روشنی سے ترا حسن استعارہ کیا
نگاہ اب بھی طلسماتِ نور میں گم ہے | جہانِ حسن کا اس رنگ میں نظارہ کیا
نکالی فال تو روئے نکو کے مصحف سے | رُخِ جمیل کی آیت سے استخارہ کیا

پرتو کا حسنِ نگارش مرہونِ منت ہے اُنکے مطالعۂ فارسی کا جس کے متعلق غالب نے کہا تھا کہ "فارسی بین تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ" چنانچہ "اپنجائے شب" اپنے "نقش ہائے رنگ رنگ سے مرصع نظر آتا ہے۔" غزالِ رمیدہ، لوحِ تصور، مژگانِ آرزو، آوازِ زیرِ لب، آہِ بے سبب، حریمِ دیدہ و دل، حلیمِ خاطر، چراغِ ودائے شب اور طلسماتِ نور وغیرہ ایسی پُر شکوہ تراکیب و اختراعات ہیں جو کلام کو حسنِ اسلوب ہی نہیں حسنِ معنی بھی عطا کرتی ہیں۔ استعارہ و تشبیہ اور کنایہ کا ایک جہان طلسمات ہے جو از اول تا آخر کلامِ پرتو کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ایک خوبصورت مثال:

طلوعِ صبح کا منظر تھا اُس گریباں پہ | میں سوچتا تھا کہ سورج کہاں دکھائی دیا

پرتو نے کتاب کے آخری صفحات 'دو ہوں' کی نذر کیے ہیں جو اُن کے شاعرانہ تشخص کی ایک اہم جہت بھی ہیں اور قدرتِ کلام کا نمونہ بھی۔ آخر میں اُن کی غنائیت پرور فکر پر مبنی ایک مترنم بحر میں غزل سے چند اشعار پیش کرتا ہوں اور اجازت چاہتا ہوں:

کسی حسینہ کی ٹوٹی گاگر کے ٹھیکروں کی طرح ہیں ویراں
وہ لب کہ جن پر کبھی بہاروں کی پُر سکوں تازگی ملی ہے
کبھی جو ماضی کے پیرہن میں نے یاد کی انگلی پہ ڈالے
تو ملگجی ریشمی تہوں میں گلوں کی خوشبو بسی ملی ہے
سیاہ راتوں کی چادروں پر بنوکِ مژگاں لکھا ہے میں نے
وہ اک فسانہ حقیقتوں کو بھی جس سے تابندگی ملی ہے

کتاب: مسلم شمیم۔ شخصیت و فن (مقالہ برائے ایم۔ اے اردو)
مصنفہ: شہلا نازنین
مبصر: سید منصور عاقل
ناشر: کاروانِ امن۔ کراچی
قیمت: دو سو روپے

یہ رجحان کہ معاصر شخصیات کے فکر و فن پر نصابی مقالات لکھے جائیں ایک فالِ نیک بن کر سامنے آیا ہے۔ تاہم جامعات کے لئے لازم ہے کہ وہ علمی و تحقیقی معیار اور بامعنی و مربوط مواد کی مقدار کو یقینی بنانے کے لئے ذمہ دارانہ کردار ادا کریں۔ اس ضمن میں ایسی نگارشات بھی ہمارے زیرِ مطالعہ آئیں جن سے معیار و مقدار دونوں اعتبار سے فکری و معنوی تہی دامنی کے سوا کوئی اور تاثر مرتب نہ ہو سکا لیکن کراچی یونیورسٹی کی طالبہ شہلا نازنین کا زیرِ نظر مقالہ اُن کی معیاری تحقیق اور کثیر الاوصاف ایسی شخصیت کے انتخاب پر ستائش کا مستحق ہے جو جامعہ کی طرف سے سندِ اعتبار عطا

کرنے کا مکمل جواز مہیا کرتی ہے۔

موضوعِ تحقیق بنائے جانے والی شخصیت سے تعارف کا دعویٰ تو ہمیں بھی ہے اور یہ تعارف بھی کم و بیش چار دہائیوں پر محیط ہے لیکن تحقیقی مواد سامنے آنے کے بعد ہمیں اپنی بے خبری کا احساس ہوا کہ مسلم شمیم کی 'حیاتِ زلزلہ پا' کے احوال و آثار پر اگر کام نہ کیا جاتا تو معاصر ادبی تاریخ میں پیدا ہونے والا خلا مستقبل کے محققین کا زیاں بن کر رہ جاتا۔ مقالہ نگار کی درج ذیل تحریر سے اُن اکنافِ تحقیق کا اندازہ ہوتا ہے جن پر توجہ مرکوز کی گئی ہے:

''مسلم شمیم مشہور قانون دان، سیاسیات کے سابق معلم، صحافی اور شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہترین نقاد بھی ہیں۔ جدید اردو تنقید میں مسلم شمیم کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے ترقی پسند نقاد کی حیثیت سے تنقید کی ابتداء کی اور آج تک ترقی پسندیت کو اپنا نصب العین بنایا ہوا ہے۔''

شہلا نازنین نے مسلم شمیم کے سنِ ولادت ۱۹۳۹ء سے سالِ رواں ۲۰۰۸ء تک ان کی متنوع الجہت زندگی کا پوری جزرسی اور دقتِ نظر سے جائزہ لیا ہے اور بہار کی مردم خیز سر زمین کے شہرۂ آفاق صدر مقام سے لے کر جسے تاریخ میں ابتدا 'پاٹلی پترا' مغل عہد میں عظیم آباد اور فرنگی دور میں پٹنہ کا نام دیا گیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد سکھر، لاڑکانہ اور کراچی تک جو مسلم شمیم کی حیاتِ شعور و آگہی کے اہم سنگ ہائے میل ہیں اُن کے نظریاتی مسلک اور ادبی پرورش و تربیت پر حتی الامکان مصدقہ مواد پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ مسلم شمیم کی نظریاتی اساس کا مستحکم حوالہ اُنکے عہدِ طفلی میں پٹنہ کا وہ سماجی و معاشی نظام مہیا کرتا ہے جس میں کسان زمیندارانہ استحصال کا شکار تھا۔ مسلم شمیم نے اپنے والد کو کھیتوں میں خود ہل چلاتے ہوئے اور ایک نا آسودہ زندگی سے مسلسل نبرد آزما دیکھا اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اُنکے ادبی سفر کا آغاز بھی منزل سے ہوا یعنی پٹنہ میں ایک صاحبِ علم و نظر شخصیت حمید عظیم آبادی کا وہ بوسیدہ سا مکان جسے 'حمید منزل' کہا جاتا تھا۔ یہاں مسلم شمیم نے صرف ابتدائی تعلیمی مراحل ہی طے نہیں کیے بلکہ یہیں اُنکا ادبی و شعری وجدان بھی متحرک ہوا۔ پٹنہ ہی کے ایک طرحی مشاعرہ میں اُنکے تعارف کا عنوان درج ذیل شعر

بن گیا:

دل بہل جائے گا دیکھیں گے تڑپتے جو مجھے   سیر کی سیر، عیادت کی عیادت ہو گی

لیکن جن عوامل نے مسلم شمیم کے ذہن پر گہرے نقوش مرتب کیے انہوں نے مسلم شمیم کو بحیثیت شاعر 'ترقی پسند تحریک' کا حلقہ بگوش عقیدت بنا کر رکھ دیا۔ مقالہ نگار نے اس تحریک کے ابتداء وارتقا کے ساتھ ساتھ اُن اسباب وعوامل پر بھی مبسوط بحث کی ہے جن کے باعث جنوبی ایشیاء کے ادب میں برپا ہونے والا انقلاب مغرب کی مماثل تحریکوں سے مغلوب ومتاثر نظر آنے لگا۔ مسلم شمیم نے اس منظرنامے کا عمیق ووسیع مطالعہ کیا تاہم ان کی ادبی سرشت کی تشکیل میں غیر شعوری طور پر سر زمین بہار کی اُن قدآور شخصیتوں کا فیضان وراثتاً شامل ہے جو لوح تاریخ پر اپنی ادبی عظمتوں کے نقوش دوام ثبت کر گئے ہیں۔ ان میں عبدالقادر بیدل، شاد عظیم آبادی، سید امداد امام اثر اور بعد میں آنے والوں میں پروفیسر کلیم الدین احمد، قاضی عبدالودود، سید سلیمان ندوی، پروفیسر جمیل مظہری اور پروفیسر حسن عسکری جیسے جلیل القدر نام شامل ہیں۔ وہ عوامل جنہیں پٹنہ کے عہد طفلی نے مسلم شمیم کے ذہن کو نظریاتی وفکری بنیادیں مہیا کیں ان کا معنوی تسلسل اُنکی بعد کی زندگی میں نمایاں نظر آتا ہے چنانچہ سندھ میں سکھر ولاڑکانہ کے دوران قیام اُنکی ادبی سرگرمیاں دو تہذیبی امتزاج یعنی بھارت کی گنگا جمنی تہذیب اور پاکستان میں وادیٔ سندھ کی تہذیب وثقافت سے عبارت نظر آتی ہیں۔ حسن اتفاق کہ بچپن سے آغاز جوانی اور جوانی سے وسیع تجربہ ومشاہدہ پر محیط موجودہ عمر تک نظریاتی وادبی ارتقاء کی تمام کڑیاں ملتی چلی گئیں۔ سکھر میں دوران قیام اُنکے معاصرین بلکہ متاثرین ترقی پسند تحریک میں اُنکے استاد مکرم حمید عظیم آبادی جنہیں شاد عظیم آبادی سے شرف تلمذ حاصل تھا کے صاحبزادے اشتراکیت پسند حسن حمیدی اور پیکر نقوی (مدیر ہفت روزہ رہنما) کی رفاقت حاصل رہی جبکہ سکھر میں اُنکے صدر مدرس اور سندھی زبان کے ادیب شیخ عبدالرزاق راز کے علاوہ مقامی اہل قلم آفاق صدیقی، شوکت عابدی، مظہر جمیل اور نکہت بریلوی بھی ان کی ادبی فکر کی تشکیل میں ہمرکاب نظر آتے ہیں۔ نیز شیخ ایاز اور تنویر عباسی سے رابطے اُنکی زندگی کی جہتوں میں عکس زیر نظر آتے ہیں۔ اُنکا یہ

نظریاتی ارتقا اپنے نقطۂ عروج کو اُنکے لاڑکانہ کے دوران قیام پہنچا۔ جہاں وہ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان سے اُس وقت وابستہ ہوئے جو اُس وقت غیر قانونی اور زیرِ زمین پارٹی تھی چنانچہ وہ ۱۹۶۱ء سے ۱۹۷۲ء تک ضلعی سطح پر پارٹی کے سیکرٹری رہے۔ لاڑکانہ میں اُنکی نظریاتی تعمیر و تشکیل میں جن شخصیات کی قربت نے کردار ادا کیا ان میں سوبھو گیان چندانی، سید جمال الدین بخاری اور حیدر بخش جتوئی شامل ہیں۔ مسلم شمیم اس عہد کو اپنی زندگی کا سنہرا دور قرار دیتے ہیں اور لاڑکانہ کو اپنی ''کرم بھومی اور گیان بھومی'' جبکہ پٹنہ بکلم قضا و قدر اُنکی ''جنم بھومی'' ٹھہرا۔

مقالہ نگار شہلا نازنین نے زیرِ تبصرہ کتاب کو تین ابواب میں تقسیم کیا ہے اور اپنے ممدوح کے احوال و آثار اور فکر و فن کا معتبر حوالوں اور اقتباسات سے کما حقہٗ احاطہ کیا ہے۔ آخر میں ایک نہایت جامع مجموعی محاکمہ بھی پیش کیا گیا ہے مسلم شمیم کی سندھ اور یہاں کی تہذیب و معاشرت سے والہانہ وابستگی کا اندازہ مقالہ نگار کے ان الفاظ سے کیا جاسکتا ہے کہ انہیں ''سندھ محبتوں کی سرزمیں اور تہذیب و تمدن کا آسمان نظر آیا۔'' حضرت شاہ عبدالطیف بھٹائی سے اُنکی عقیدت اُنکے سندھی ادب کے مطالعہ کے رہینِ منت ہے وہ متعدد کتب کے مولف و مصنف ہیں جن میں امکان (شعری مجموعہ) آدرش (مضامین و مقالات) شوکت عابدی (فن اور شخصیت) اور تناظر (نثری ادب) شامل ہیں۔ اُنکے مزید نصف درجن مسودات کتب زیرِ تدوین ہیں۔ جن میں اُنکی خودنوشت ''پاٹلی پترا سے موئن جوڈرو تک'' قابلِ ذکر ہے۔ مسلم شمیم نے اہم معاصر شخصیات پر ادبی رسائل و جرائد میں بکثرت لکھا ہے۔ سہ ماہی 'الاقربا'' میں بھی ان کی اہم نثری و شعری نگارشات شائع ہوتی رہتی ہیں۔ حال ہی میں ہارورڈ یونیورسٹی (امریکہ) نے اپنے طلباء کے لئے 'الاقربا' کے جن تحقیقی مقالات کو اپنے رواں نصابی پروگرام میں شامل کیا ہے اُن میں مسلم شمیم کا ایک مقالہ بھی شامل ہے۔ چنانچہ ان کے فکر و فن کی ہمہ جہتی اور زندگی کے تلخ و شیریں تجربات کے پیشِ نظر کتاب کی مصنفہ نے سرِ آغاز کے طور پر اُنکا یہ شعر نقل کیا ہے ۔

جتنے بدر ہوا کبھی مصلوب میں ہوا ایسے کئی مقام مری داستاں میں ہیں

کتاب: شیر زمان (ناولٹ)

مصنف: غلام الثقلین نقوی

مبصر: ڈاکٹر انور سدید

غلام الثقلین نقوی کا ناولٹ ''شیر زمان'' ۔ ۔ ۔ ان کے دل کی اس خلش کا مداوا ہے کہ وہ جموں اور کشمیر کے اس محاربے پر کوئی ناول یا افسانہ نہیں لکھ سکے تھے جو تخلیق پاکستان کے فوراً بعد پیدا ہو گیا تھا۔ اس خلش کی وجہ یہ تھی کہ جموں و کشمیر سے ان کا گہرا جذباتی لگاؤ تھا۔ سیالکوٹ کے ضلع میں ان کا آبائی گاؤں ''بجر محمد'' اس ریاست کی ورکنگ باؤنڈری سے صرف دو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ وہ آزاد کشمیر کے گاؤں ''سہنی'' کو اپنا دوسرا وطن قرار دیتے تھے۔ یہاں ان کے والد اور دادا پیدا ہوئے اور یہیں ان کے پردادا کا مزار بھی واقع ہے۔ ان کے دادا کا مدفن ''کلاں'' میں ہے جو سہنی سے چار کوس کے فاصلے پر ایک پہاڑ کی اوٹ میں آباد ہے۔ غلام الثقلین نقوی کی پیدائش موضع ''چوکی ہنڈن'' میں ہوئی جو مقبوضہ کشمیر کے ضلع نوشہرہ میں واقع ہے۔ کشمیر کا مسئلہ ۱۹۴۷ء میں آزادی کے فوراً بعد ابھر آیا تھا۔ ریاست جموں و کشمیر مسلمانوں کی کثرت کی آبادی تھی لیکن اس کا مہاراجہ ڈوگرہ تھا۔ اس ریاست کا فطری الحاق پاکستان سے ہونا تھا۔ ریاستی مسلمانوں نے اپنی آزادی کے لئے ایک تحریک ۱۹۳۰ء کی دہائی میں چلائی تھی۔ ۔ ۔ انگریزی راج میں تحریک کامیاب تو نہ ہو سکی لیکن کشمیری مسلمانوں کی بیداری میں زبردست معاون ثابت ہوئی تاہم مہاراجہ کشمیر نے ہندوستانی ریاستوں کے طے شدہ اصول کے خلاف جموں و کشمیر کا الحاق ہندوستان کے ساتھ کر دیا اور حکومت ہند نے فوج کشی کر کے ریاست کے کچھ حصے پر قبضہ کر لیا۔ اس دوران پاکستان کے مجاہدین نے جس علاقے تک رسائی حاصل کی ''سیز فائر'' کے بعد اس علاقے کو آزاد کشمیر کا نام دیا گیا۔ ہندوستان اس مسئلے کو اقوام متحدہ میں لے گیا تو کشمیری عوام کے حق رائے دہی کو تسلیم کیا گیا اور الحاق کے لئے استصواب کرانے کا ریزولیشن منظور کر لیا گیا لیکن ہندوستان اس معاہدے سے منحرف ہو گیا۔ چنانچہ خطۂ کشمیر متنازعہ علاقہ بن گیا جہاں ورکنگ باؤنڈری کے دونوں طرف نہ صرف گولے برستے رہتے ہیں بلکہ اب تک اس مسئلہ پر تین بڑی جنگیں لڑی جا چکی ہیں۔ آخری معرکہ کارگل کی

پہاڑیوں پر ہوا لیکن مسئلہ کشمیر لاینحل ہے اور ہندوپاک میں کشیدگی قائم ہے "ساہنی" کے پیدائشی اور "بھرتھو" کے رہائشی ہونے کے باعث غلام الثقلین نقوی کے دل میں اس علاقے کی محبت گہری تھی۔ ان کا دوسرا وطن ساہنی ہر وقت دشمن کی توپوں کی زد میں رہتا تو ان گولوں کی دھمک وہ اپنے دل پر برداشت کرتے اور ملال کرتے کہ تخلیق کار ہونے کے ناطے انہوں نے اپنا فرض ادا نہیں کیا۔

جموں و کشمیر کے مسئلہ پر پاکستان اور ہندوستان کے مابین پہلی جنگ آزادی کے بعد ہوئی جو یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو "سیز فائر" پر ختم ہوئی....... اب چوتھا "سیز فائر" بھی ہو چکا ہے۔ لیکن مسئلہ کشمیر جوں کا توں موجود ہے اور امن عالم کے لیئے بھی خطرے کا باعث ہے۔ غلام الثقلین نقوی نے ناولٹ "شیر زمان" ۵۸۔۱۹۵۷ کے دوران لکھا تھا۔ اس لئے اس کے پس منظر میں کشمیر کی ۱۹۴۸ء کی پہلی جنگ ہے۔ ناول کا اختتام "سیز فائر" پر ہوتا ہے۔ جو اس جنگ کے ختم ہونے کا اعلانیہ نہیں بلکہ عارضی طور پر دونوں اطراف سے گولہ باری روک دینے کا اعلان ہے۔ ناولٹ کا مرکزی کردار شیر زمان ہے جو آزاد کشمیر کے ایک گاؤں سنگل گاہ کا رہنے والا ہے۔ اور اس لحاظ سے پیدائشی فوجی ہے کہ فوج کی ملازمت اس علاقے کے لوگوں کا عام پیشہ تھا اور اس کا باپ بھی فوجی تھا۔ آٹھویں جماعت پاس کرکے وہ اپنے باپ کی باڑیوں میں ہل چلانے اور بکریاں چرانے لگا تو ایک وہ اس زندگی سے اُکتا گیا اور فوج میں بھرتی ہونے کی اجازت لینے کے لئے اپنے باپ کے پاس گیا تو اسے بلا توقف اجازت مل گئی۔ یہ دوسری جنگ عظیم کا دور ہے جس میں انگریزوں کی فوج میں بھرتی ہونے والے جوان جرمنوں اور اطالویوں کے خلاف جنگ لڑ رہے تھے۔ شیر زمان نے بھی فوج میں بھرتی ہونے کے بعد لیبیا اور ماؤنٹ کینو (اٹلی) میں خدمات انجام دیں اور ترقی کرتے کرتے سنگل گاہ کا یہ جوان صوبیدار بن چکا تھا۔ ناولٹ کا آغاز اس کی ریٹائرمنٹ کے بعد اس وقت سے ہوتا ہے جب وہ وطن واپس آ رہا تھا۔ شیر زمان کا باپ کریم داد فوت ہو چکا ہے۔ آبائی گھر جس کی دیواروں پر اس کی مرحومہ بیوی ریشم جان نے اپنے ذوق کے مطابق نیلا رنگ اپنے لباس اور دوپٹے کی طرح بھر دیا تھا۔ اب شکستہ حالت میں تھا۔ وطن واپس آ کر وہ آبائی گھر کی تعمیر نو کرتا ہے تو اس کا چچا رحم داد کہتا ہے

"شیر زمان تیرا مکان تو بن گیا؟...... ریشم جان زندہ ہوتی تو میں کہتا تیرا گھر آباد ہو گیا ہے۔"

اور رحم داد اپنے لہجے میں غم اور ہمدردی کے سُر پیدا کرتے ہوئے کہتا ہے۔ ''تو میرے بھائی کی ایک نشانی ہے یہ سوچتا ہوں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے کہ تو لاوارث ہے تو میرے بھائی کی نسل تو آگے نہیں چلے گی اور اس کے ساتھ وہ شیر زمان کو دوسری شادی کی تجویز پیش کرتا ہے۔ رشتہ جوش کرنے کی پیش کش بھی کرتا ہے۔ اور حوالدار چیندے خان سے دور پار کی رشتہ داری ہونے کی وجہ سے اس کی بیٹی نیلم کے رشتے کی بات چلانا چاہتا ہے۔ سنگل گاہ میں داخل ہونے سے پہلے شیر زمان حوالدار چیندے خان کا مہمان رہ چکا ہے۔ وہ نیلم کی جھلک بھی دیکھ چکا ہے جس میں اسے ریشم جان کا سراپا نظر آیا تھا۔ اپنے چچا کی اس تجویز پر اس نے اپنی لوحِ خیال پر دیکھا کہ یکایک اس کا گھر آباد ہو گیا ہے۔ ناولٹ میں نیا موڑ اس وقت آتا ہے جب شیر زمان اپنے نوتعمیر مکان کی آرائش کے لیے سامان خریدنے کے لیے راولپنڈی جاتا ہے اور وہاں اس کی ملاقات اپنے ایک پرانے فوجی ساتھی دلاور خان سے ہوتی ہے جو کہہ رہا ہے۔

''انگریز کی جنگ ۱۹۴۵ء میں ختم ہو گئی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان تقسیم ہوا تو فسادات ہوئے لیکن اب تو ... شیر زمان انگریز کی جنگ تو ختم ہو گئی لیکن پاکستان کی جنگ تو ابھی ختم نہیں ہوئی کیا ہم نے جموں و کشمیر کو دشمن سے آزاد کرا لیا ہے؟''

کیپٹن دلاور خان شیر زمان کو اس کا قومی فرض یاد دلاتا ہے۔

''آزاد کشمیر فورس کو تمہاری ضرورت ہے۔ میں پلندری سے آگے کے محاذ پر ہوں۔ اس محاذ پر ایک مورچہ ہے جو تمہارے سوا کوئی سر نہیں کر سکتا... پلندری آؤ تو کیپٹن دلاور خان کا پتہ تمہیں آسانی سے مل جائے گا..... شیر زمان! میرا دل کہتا ہے کہ تم ضرور آؤ گے۔''

دلاور خان کے دل نے اس سے صحیح سرگوشی کی تھی اور شیر زمان نے بھی اپنے وطن کی پکار سن لی تھی۔ اس نے دوسری شادی کرنے اور گھر آباد کر کے اپنے باپ کی نسل کو آگے بڑھانے کی بجائے کشمیر کے محاذ پر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اس مورچے پر حملہ کیا جہاں سے

بھارتی صوبیدار وکرم سنگھ آزاد کشمیر فورس کو توپ کے گولے سے ہر شام سلام بھیجتا تھا۔ اس مورچے تک جانے کا ایک ہی راستہ تھا جسے سر کرنے کے لئے سپاہی اورنگزیب، نائیک رحیم گل اور حوالدار فہماسپ خان اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر چکے تھے۔ اور اس رات وکرم سنگھ نے گولہ پھینک کر سلام بھیجا تو پاکستانی بنکر سے شیر زمان روانہ ہو چکا تھا۔ اور جب تڑ تڑ وکرم سنگھ کی مشین گن چلی تو اسی لمحے شیر زمان کا گرنیڈ اس زور سے پھٹا کہ پہاڑ کانپ گئے۔ مورچہ سر ہو گیا تھا۔ اور شیر زمان دادِ شجاعت دیتے ہوئے کشمیر کی آزادی کے لئے نقدِ جان پیش کر چکا تھا۔ اس نے جامِ شہادت نوش کر لیا تھا۔ اس وقت کیپٹن دلاور خان نے ٹوپی سر سے اتار کر کہا!

''شیر زمان سنگیا میرا آخری سلام قبول کر۔ کیا میں نے سچ نہیں کہا تھا کہ یہ مورچہ صرف تیرے ہی ہاتھ سے سرنڈر ہو سکتا ہے؟''

اسی رات ''سیز فائر'' کی خبر آ گئی۔ شیر زمان نے مورچہ سیز فائر کے حکم سے پہلے سر کر لیا تھا۔ لیکن میجر شمشیر خان کہہ رہا تھا۔ ''ہم سنگی شیر زمان کی قربانی کو ضائع نہیں ہونے دیں گے......'' ناولٹ کا یہ اختتامیہ ایک طرف شیر زمان کی لازوال قربانی کی شہادت دیتا ہے تو دوسری طرف میجر شمشیر خان، میجر محمود خان اور کیپٹن دلاور خان جہدِ آزادیٔ کشمیر کو جاری رکھنے کا عزم کرتے ہیں۔ سیز فائر کی خبر پر ان کا ردِ عمل وطن کے تحفظ اور کشمیر کی آزادی کے لئے گہری معنویت کا حامل ہے۔

''میجر صاحب! ہم ''سیز فائر'' کو ماننے سے انکار کرتا ہے ۔ آج سے ہم باغی ہے۔ شیر زمان کی پلٹون اور ہماری کمپنی کے جوان ہمارا ساتھ دیں گے۔ ہم اپنے سنگی شیر زمان کی قربانی کو ضائع نہیں ہونے دیں گے۔''

جموں و کشمیر کی پہلی جنگ آزادی پر زیادہ چیزیں نہیں لکھی گئیں۔ اس ضمن میں نقوی صاحب نے سعادت حسن منٹو کے افسانے ''ٹیٹوال کا کتا'' کا ذکر کیا ہے جس میں کسی ملک کے لئے ہمدردی کا اظہار نہیں ہوتا۔ آغا بابر کا ڈرامہ ''سیز فائر'' اس سلسلے کی ایک بے حد اہم کاوش جسے قبولِ عام حاصل ہوا اور غلام الثقلین نقوی نے ناولٹ ''شیر زمان'' کا پہلا مسودہ لکھتے وقت اس کے

اثرات قبول کرنے کا ذکر بھی کیا ہے۔ محمود ہاشمی کی نا قابل فراموش تخلیق ''کشمیر اُداس ہے'' ۱۹۵۰ء میں چھپی جو ان مشاہدات کا رپورتاژ ہے جو انہوں نے ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ خیز دور میں شیخ عبداللہ کی امن فوج کے ایک کمانڈر کی حیثیت میں ریاست جموں و کشمیر کے مختلف شہروں کے دورے میں جمع کیے۔ ممتاز شیریں نے اسے اردو کا بہترین ہی نہیں سچا رپورتاژ بھی تسلیم کیا ہے۔ غلام الثقلین نے لکھا ہے کہ ''کشمیر اُداس ہے'' میں غم اور اُداسی کی جس لہر کو متحرک کیا گیا تھا وہ اب تک رواں دواں ہے۔ جب بھی کوئی سیز فائر ہوتا ہے۔ کشمیر اُداس ہو جاتا ہے۔ واضح رہے کہ غلام الثقلین نقوی نے ناولٹ ''شیر زمان'' میں نہ غم کی لہر کو ابھارا ہے اور نہ اداسی پیدا کرنے کی کاوش کی ہے۔ ان کا مقصد تو کشمیر کے لئے جذبۂ جہاد بیدار کرنا ہے۔ اور اس کا ایک فعال کردار مرکزی کہانی سے ہٹ کر دلاور خان ہے جو شیر زمان (ریٹائرڈ صوبیدار) کے دل میں اس حقیقت کو جاگزیں کرتا ہے کہ جب تک جموں و کشمیر کو دشمن سے آزاد نہیں کرا لیا جاتا پاکستان کی جنگ جاری ہے اور شیر زمان نے غیروں کی جنگ لڑی تھی۔ اب پاکستان کی جنگ لڑنا بھی اس کی اہم ترین ذمہ داری ہے دلاور خان خود بھی پلندری کے محاذ پر پاکستان کی جنگ لڑ رہا ہے۔ لیکن شیر زمان پر گومگو کی کیفیت طاری ہے۔ اس کی سوچ سے یہ سوال ابھرتا ہے۔

اگر پاکستان آرمی کو میری ضرورت ہوتی تو وہ مجھے ریلیز کیوں دیتی؟ کشمیر کے محاذ پر کیوں نہ بھیج دیتی؟

لیکن دلاور خان کا ایمانی اور جہادی جذبہ مستحکم ہے۔ اس کا ارادہ چٹان کی طرح مضبوط ہے اور اس کا مثبت جواب یہ ہے کہ ''پاکستان آرمی کو تمہاری ضرورت نہیں تھی۔ آزاد کشمیر فورس کو تمہاری ضرورت ہے۔''

اور وہ اس کے دل میں پیدا ہونے والے وسوسوں کو ایک گرم جوش مصافحے سے رفع کرتے ہوئے کہتا ہے! ''سنگیا! سوچ لے۔ ایسے موقعے روز روز نہیں ملا کرتے۔ یہ آزادی کی جنگ ہے۔ اس سے بچھڑ گئے تو بہت پچھتاؤ گے۔'' اس مرحلے پر عہدے کا معاملہ بھی سر ابھارتا ہے۔ شیر زمان کے اس سوال میں حسرت موجود ہے:

""تم آزاد کشمیر فورس میں کیپٹن ہو؟"

دلاور کہتا ہے "یار چھوڑ اس بات کو میں سپاہی بھی ہوتا تو مجھے فخر ہوتا"۔ اس جواب میں وطن کے لئے ہر حیثیت میں لڑنے کا یقین موجود ہے۔ اور دلاور کی یہ بات شیر زمان کی کایا پلٹ دیتی ہے۔ وہ اپنا گھر بسانے کی آرزو کو کشمیر میں آزادی کی جنگ میں شامل ہونے پر قربان کر دیتا ہے اور اپنے داخل کی ملامت کے تحت سول لائف کے جادو سے نکل آتا ہے۔ محاذ جنگ پر ایک کرنل اسے بتاتا ہے کہ شیر زمان کو افسر کے طور پر بھرتی کرنے کا اس کے پاس اختیار نہیں ہے تو شیر زمان مجاہد کی حیثیت میں ساتھ دینے پر آمادگی ظاہر کرتا ہے۔ ناولٹ "شیر زمان" کا یہ قصہ پیش منظر ہے اور اس کے پس منظر میں ماؤنٹ کسینو کی جنگ بھی موجود ہے جس کی یادوں سے جگنواب بھی شیر زمان کے خوابوں میں جگمگا اٹھتے ہیں اور اسے احساس دلاتے ہیں کہ "لام اچھی نہیں ہوتی۔ اپنے ملک میں ہو یا کسی دوسرے میں ہارنے والا تو نقصان اٹھاتا ہی ہے۔ لیکن جیتنے والے کا نفع نہیں ہوتا ہارنے والے کو زیادہ قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔" اٹلی کی جنگ میں شیر زمان نے بہت سے کرداروں کا مشاہدہ کیا تھا۔ اس کے خیال میں "جرمن بہت بہادر تھے۔ وہ ہر فرنٹ پر بڑی بہادری سے لڑے لیکن ماؤنٹ کسینو کے فرنٹ پر اطالوی انہیں لے ڈوبے۔ اطالوی فتح حاصل کر رہے ہوں تو جم کر لڑتے ہیں اور کمزور پر ظلم کی انتہا کر دیتے ہیں۔ لیکن جب ہار رہے ہوں تو دنیا کی کوئی طاقت ان کی مردہ رگوں میں غیرت کا خون پیدا نہیں کر سکتی۔"

اٹلی کی شکست میں وہ اطالوی بوڑھا بھی ایک اہم کردار ہے جو ایک ویرانے میں واقع مکان میں اپنی پوتی اینا کے ساتھ پناہ گزین ہے۔ اس کا بیٹا اطالوی سپاہی ہے جو کبھی کبھی آتا ہے اور انہیں راشن دے جاتا ہے۔ لیکن "سرینڈر" کے بعد ان کا کوئی پرسان حال نہیں۔ میجر براؤن اور شیر زمان اس مکان کے مکینوں سے واقف تھے۔ اور وہ فوجی بنکروں سے نکل کر نواحی آبادیوں میں انگریزی فوج کی فاتح جوان مفتوحہ خواتین سے جو سلوک کر رہے تھے، شیر زمان اس سے بھی واقف تھا "اینا" کو اپنے تصور میں ریشم جان کے روپ میں دیکھ چکا تھا اور غم کی اپنی زبان میں وہ لمحہ تو بڑا قیمتی تھا۔ جب براؤن نے اینا کو بوڑھے دادا کی ہتھیلی پر مٹھی بھر لیرے رکھ دیے تھے۔ وہ لیروں کے

نظارے میں اتنا محو ہوا کہ جمعدار شیر زمان سے ہاتھ ملانا بھول گیا۔ عین اسی لمحے اینا نے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

شیر زمان کی بیوی ریشم جان اس کے آبائی گاؤں سنبل گاہ میں فوت ہو چکی ہے اور اس لمحے میں اس کی طرف اینا کا احسان مندی کے تحت بڑھا ہوا ہاتھ حساس نزاکت کا آئینہ دار ہے۔ نقوی صاحب نے اس حساس لمحے کو بڑی چابکدستی اور فنکاری سے پیش کیا ہے۔

''وہ (شیر زمان) جھجکا اور کبھی اینا کو اور کبھی اس کے ہاتھ کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا دیا۔ اینا نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو زمین بلند ہو کر آسمان سے جا لگی۔ اینا کا ہاتھ بڑا زندہ اور توانا تھا۔ اس کی گرفت میں خفیف سا دباؤ بھی اس نے محسوس کیا۔ جیسے وہ اس کے غم میں شرکت کا اظہار کر رہی ہو۔'' اس لمحے اسے ماؤنٹ کسینو فتح کر لینے پر اتنی ندامت محسوس ہوئی کہ اینا کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ماؤنٹ کسینو فتح ہو چکا ہے اور اب بنکروں میں پناہ گزین فوجیوں میں ایک دوطرح کی بغاوت ابھر رہی ہے۔ وہ ڈسپلن توڑ رہے ہیں۔ اور حوالدار میجر لکھن سنگھ کہہ رہا ہے۔

''لام تو ختم ہو گئی۔ شیروں کو پنجرے میں کب تک بند رکھا جا سکتا ہے..... جوان کو بنکر سے نکلنے کی اجازت ملنی چاہیے بے چارہ کب سے اپنی بیوی سے بچھڑا ہوا ہے۔'' اس مرحلہ پر جب بنکروں میں پناہ گزین سپاہیوں کی شکایتیں بڑھنے لگیں اور اٹلی کی عورتیں بھی بنکروں تک پہنچ گئیں اور سپاہی عورتوں کی تلاش میں وادیوں کو کھنگالنے لگے تو شیر زمان نے سوچا۔

''کوئی ہاتھ اینا کے سکرٹ تک بھی پہنچ سکتا ہے۔''

کرب کے اس شائیں شائیں کرتے لمحے میں شیر زمان نے پاکٹ سے اپنی بیوی اور بیٹے کی تصویر نکال کر دیکھی اور کہا ''تھینک گاڈ! ہم ہاری ہوئی قوم کا آدمی نہیں'' اور شیر زمان کے باطن سے اس کی اخلاقیات نے آواز دی۔ ''میں اٹلی کی ایک اینا کو شکست کی ذلت سے بچا سکتا ہوں۔''

اندرونی جیب میں ایک بھرا ہوا پستول تھا اور دوسری جیبوں میں دودھ چائے اور بسکٹوں کے ڈبے ٹھسے ہوئے تھے۔ ایک جیب لیروں سے بھری ہوئی تھی لیکن اس وقت شیر زمان وقت سے

مات کھا چکا تھا۔ اس نے بوڑھے اطالوی اور اینا کے گھر تک پہنچنے میں دیر کر دی۔ اس نے اندر سے چیخ کی آواز سن کر دروازے کو دھکا دیا اور پستول تان کر "ہینڈز اپ" کہا تو سامنے حوالدار میجر مکھن سنگھ تھا۔ اینا کی سکرٹ جگہ جگہ سے پھٹ چکی تھی اور دھجیاں لٹک رہی تھیں۔ سب کچھ لٹ چکا تھا۔ لیکن زندگی باقی تھی۔ شیر زمان نے بوڑھے اطالوی اور اس کی پوتی کو محفوظ مقام پر پہنچا کر ان کی زندگیوں کو تحفظ دیا لیکن درد کی ایک لہر اس کے دل میں موجزن تھی اور ہوا کا ایک جھونکا اس کے کان میں سرگوشی کر رہا تھا۔ "شیر زمان! اب مارچ کرو، اینا بھی چلی گئی جس طرح ریشم جان چلی گئی تھی۔"

ناولٹ "شیر زمان" جنگ کے دو محاذوں کو منظر پر ابھارتا ہے۔ لیکن میری نظر میں یہ شیر زمان کا ایک کرداری ناولٹ ہے۔ جس کی رگوں میں ایک فوجی کا خون دوڑ رہا ہے۔ اٹلی میں اس نے دشمن کے خلاف جنگ لڑی اور بے جگری کا ثبوت دے کر ترقی حاصل کی، اس دوران سنبل گاہ میں اس کی بیوی ریشم جان اور معصوم بیٹا موت کے منہ میں چلے گئے لیکن شیر زمان نے اپنی قوت میں کمی نہ آنے دی اور اپنے اخلاق کے بندھن کو مضبوطی سے قائم رکھا اس محاذ پر بارود کی بو سے اینا نمودار ہوتی ہے جو شکست گزیدہ قوم کی دختر ہے۔ اور انگریزی فوج کے ایک سپاہی کی ہوس کا نشانہ بھی بنا دی جاتی ہے۔ یہاں شیر زمان کی ہمدردانہ لطافت ایک خاص کیفیت سامنے لاتی ہے وہ اینا کو ریشم جان کے روپ میں دیکھتا ہے لیکن اس کا ہاتھ ڈگمگاتا نہیں اس کی اخلاقی ثابت قدمی ہی اس کے کردار کی بلندی کی ضامن ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے گاؤں سنبل گاہ میں واپس آنے پر جب کشمیر کا محاذ اسے آواز دیتا ہے تو اپنا گھر آباد کرنے کی آرزو پر وہ اس آواز کو ترجیح دیتا ہے۔ منظر نامے میں بھی حوالدار پائندہ خان کی بیٹی نیلم نے شیر زمان کے دل میں محبت کی آنچ پیدا کی ہے۔ نقوی صاحب نے اس لطیف آنچ کو حسب ذیل اقتباس میں بڑی فنکارانہ بصیرت سے پیش کیا ہے۔

"اس نے دروازہ کھولا تو نیلم ٹرے میں چائے لے کر اندر آ گئی، وہ نیلم کو آنکھ بھر کر نہیں دیکھنا چاہتا تھا کہ اعتماد میں رخنہ آ جاتا لیکن ایک جھلک نے اسے بہت کچھ دکھا دیا۔ اتنے قریب سے اس نے نیلم کو پہلے کہیں نہیں دیکھا تھا۔ اور اس دن جب سنبل گاہ کی نیلی دیواروں والے بڑے کمرے میں پلنگ بچھا میز اور کرسیاں لگیں تو جانے

کس لمحے نے انگیٹھی کے ڈبے پر سفید موتیوں کی جھالر والا نیلا رومال ڈال دیا اور پلنگ پر نیلی چادر بچھا دی، اور خود ریشم جان کا سراپا اختیار کر لیا۔ ریشم جان جسے نیلے رنگ سے بہت پیار تھا۔ پھر اسی لمحے نے اٹلی والی ایما کو اس پلنگ پر لا بٹھایا جس نے اپنی پھٹی ہوئی نیلی سکرٹ پر پرانی شال اوڑھی ہوئی تھی۔ اس لمحے میں ریشم جان اور ایما سما گئیں تو صوبیدار شیر زمان یکدم اداس ہو گیا، جیسے وہ قبرستان میں پھر سے جا کھڑا ہوا ہو۔"

اس نوع کے رومانوی مقامات پر شیر زمان کی داخلی کیفیت اور اس کی نفسیات کا جذر و مد سامنے آتا ہے اور ناولٹ میں دلچسپی کے عناصر کو ابھارتا ہے۔ لیکن بنیادی حقیقت یہی سامنے آتی ہے کہ زندگی کے کسی مقام پر بھی شیر زمان ڈگمگاتا نہیں اور قدموں کا تحفظ کرتا ہے جو سنبل گاہ اور اس کے گرد و پیش کے اجتماعی معاشرے نے پروان چڑھائی تھیں۔ وہ ایک سچا اور مخلص فوجی ہے جس کی سوچ مستقیم ہے بلاشبہ جس کا جذبہ اس کے باطن میں بھی موجود ہے۔ لیکن اس کی بیوی ریشم جان اس کے جنسی کردار کی پاسبان ہے اور کسی مقام پر بھی اس کے حوالے سے الگ نہیں ہوتی حتیٰ کہ ناولٹ میں ایما اور نیلم کے کردار فطری انداز میں رونما ہوتے ہیں لیکن ان کرداروں پر بھی ریشم جان سایہ فگن رہتی ہے اور شیر زمان کے پائے ثبات کو قائم رکھنے میں معاونت کرتی ہے۔ میں نے چونکہ غلام الثقلین نقوی کو بہت قریب سے دیکھا ہے اس لئے میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ شیر زمان کا اخلاقی زاویہ نقوی صاحب کے اپنے کردار کا ہی عکس ہے۔

غلام الثقلین نقوی کا ناولٹ ''شیر زمان'' حقیقت کو فنی خلوص سے پیش کرنے کی عمدہ مثال ہے۔ اس میں اپنی ذاتی خواہشات کو وطن کی بہبود اور آزادی کے لئے قربان کر دینے کے لئے شیر زمان کا کردار پیش کیا گیا ہے جس نے اپنی جوانی کے بہترین ایام انگریز کی جنگ لڑنے میں صرف کر دیئے تھے۔ وہ وطن واپس آیا تو کشمیر پابہ زنجیر تھا۔ اور اس پر بھارت نے قبضہ جما رکھا تھا۔ پنشن پانے کے بعد وہ اپنا گھر آباد کرنے کے لئے دوسری شادی کرنے والا تھا کہ اس کی کایا کیپٹن دلاور نے پلٹ دی اور کشمیر کی جنگ کی طرف توجہ دلائی جو پاکستان لڑ رہا تھا۔ شیر زمان نے صوبیدار وکرم سنگھ کا

مورچہ فتح کر لیا لیکن اس کا سب سے بڑا اعزاز یہ تھا کہ اس نے نقدِ جان پیش کر کے شہادت کا رتبہ حاصل کر لیا تھا۔ نقوی صاحب نے ناول اس داخلی صداقت سے لکھا ہے جیسے شیر زمان کی صورت میں خود محاذ جنگ پر پہنچے ہوئے ہوں اور کشمیر کی آزادی کے لئے اپنی قربانی پیش کر رہے ہوں۔ ناول اور افسانے واقعات اور کردار تخلیق کار کے تخیلہ کا کرشمہ ہوتے ہیں لیکن اعلیٰ پائے کا فن کار حقیقت کو ناول یا افسانے کی صورت اس طرح دیتا ہے کہ یہ زندگی کا حقیقی نقش بن جاتا ہے۔ نقوی صاحب کی خوبی یہ ہے کہ وہ کہانی کی ترتیب و تدوین اس طرح کرتے ہیں کہ الفاظ لو دینے لگتے ہیں اور کہانی ایک دور کا آئینہ بن جاتی ہے۔ ان کا ناولٹ ''شیر زمان'' کشمیر کے موضوع پر زندہ رہنے والا ادب پارہ ہے جو ہمیں ایک سچی داستان محسوس ہوتی ہے۔ جہادِ کشمیر کے موضوع پر ایسی پر اثر تخلیقات میں نے بہت کم پڑھی ہیں۔

کتاب: 'بے زبانی زباں نہ ہو جائے': حفیظ ہوشیار پوری (شخصیت و فن)

مصنف: ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ

مبصر: نوید ظفر

ناشر: اردو اکیڈمی سندھ، کراچی

قیمت: ۵۰۰ روپے

حفیظ ہوشیار پوری اردو غزل کے اُن اہم شعراء میں شمار کیے جاتے ہیں، جنہوں نے بیسویں صدی کے وسط میں نمایاں خدمات سر انجام دیں۔ وطنِ عزیز میں یہ تضاد اکثر ادیبوں کے حصے میں آیا کہ یا تو انہوں نے خود کو ملازمت کے لئے وقف کر دیا، یا ادبِ عالیہ میں ایسے گم ہوئے کہ دیگر ذمہ داریوں پر توجہ نہ دے پائے۔ حفیظ ہوشیار پوری بھی اس تضاد کا شکار ہوئے اور ریڈیو پاکستان کی ملازمت میں اس طرح غرق رہے کہ زندگی بھر اپنا دیوان شائع نہ کرا سکے، چنانچہ آج اردو غزل کے دامن میں اُن کی وہ غزلیں تو محفوظ ہیں جنہیں مغنیوں اور گلوکاروں نے سخن شناسوں تک پہنچایا تا

ہم اکثر اپنا مقام حاصل کرنے سے رہ گئیں۔ موجودہ کتاب کا عنوان بھی مصنفہ نے حفیظ ہوشیار پوری کی مشہور غزل کے مطلع سے لیا، جسے ملکہ پکھراج نے اپنی خوبصورت آواز سے امر کر دیا:

بے زبانی زباں نہ ہو جائے   راز الفت عیاں نہ ہو جائے

کتاب کے عنوان کے طور پر مصرعہ اولے کا انتخاب حفیظ ہوشیار پوری کے مداحوں کو ضرور کھلے گا کہ یہ تصنیف شاعر کی ''بے زبانی'' نہیں بلکہ ہمہ جہت صفات کی ترجمانی کرتی نظر آتی ہے۔

''بے زبانی زباں نہ ہو جائے'' قرۃ العین طاہرہ کا پی ایچ ڈی مقالہ ہے۔ اور حفیظ ہوشیار پوری پر تحقیق کا حق ادا کرتا ہے۔ حفیظ ہوشیار پوری کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ نہ صرف حلقہ ارباب ذوق کے ابتدائی ارکان میں شریک تھے، بلکہ ۲۹ اپریل ۱۹۳۹ء کو انہوں نے حلقہ ارباب ذوق کی پیشرو 'بزمِ داستان گویان' کے اولین اجلاس کی صدارت بھی کی جس میں نسیم حجازی نے ''تلافی'' کے عنوان سے افسانہ پڑھا، اور جس میں مصنف اور صاحب صدر سمیت کل سات ارکان نے شریک تھے۔

حفیظ ہوشیار پوری کو تاریخ گوئی میں خاص کمال حاصل تھا۔ اس فن میں ان کا مقام آج بھی منفرد ہے، افسوس اب تاریخ کی روایت سمجھنے والے لوگ بھی محدود ہو گئے اور اس فن کا ادراک جاتا رہا کہ کس طرح ایک ایک مصرعہ سے تاریخ نکالی جاتی تھی اور پھر اسے قطع بند کر کے اہل سخن سے خراج حاصل کیا جاتا تھا۔ قرۃ العین طاہرہ تحریر کر رہی ہیں:

''قائد ملت لیاقت علی خان کی وفات پر علامہ اقبال کے مصرعہ 'صلۂ شہید کیا ہے تب و تاب جاودانہ'' سے تاریخ نکالی جو خود تاریخ کے فن میں نقشِ دوام ہے۔'' علامہ اقبال کی تاریخ وفات خود ان کے مصرعہ ''صدق و اخلاص و صفا باقی نماند'' (۱۳۷۵ھ) سے نکالی اور اہل دانش سے خراج تحسین وصول کیا۔

۱۹۵۶ء میں پاکستان کے پہلے دستور کے نافذ ہونے پر انہوں نے ''دستورِ خداوندی'' کے الفاظ سے ۱۳۷۵ھ تاریخ نکالی اور اسے یوں قطع بند کی۔

ملتِ پاک کے جمہور کا دستور حفیظؔ عین آئین خداوند کی پابندی ہے
رفعتِ عرشِ بریں سے لئے تائید آئی ایک آواز ''یہ دستورِ خداوندی'' ہے

زیرِ نظر تصنیف میں مصنف نے حفیظ ہوشیار پوری کے ایک اور اہم اور اردو ادب کے اکثر قارئین کی آنکھوں سے نہفتہ پہلو کی طرف روشنی ڈالی ہے، یہ موضوع ہے حفیظ ہوشیار پوری کی صنعت مضمون نگاری۔ اس حوالے سے لکھے گئے ان کے مضامین ''جوش ملیح آبادی''، ''فلسفۂ اقبال پر ایک اجمالی نظر'' اردو غزل کے پچیس سال'' ''دہلی کا محلِ وقوع''، ''شیخ عبدالقادر کی حیات و خدمات'' اور ''ارمغانِ ایران'' آج بھی محققین کے لئے اہم مواد لئے ہوئے ہیں۔ حفیظ ہوشیار پوری کا ایک مضمون ''تاریخ گو اقبال'' ۲۱ اپریل ۱۹۵۲ء کو روزنامہ ''آفاق'' لاہور میں شائع ہوا۔ جس میں حکیم الامت کی تاریخ گوئی کے نادر نمونے درج تھے۔ سرسید، امیر مینائی، شاہ دین ہمایوں اور دیگر احباب کی وفات پر اقبال کی تحریر کردہ تواریخ کا سراغ اب اسی مضمون سے لگایا جا سکتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ مصنف نے اس مضمون کے حوالے سے اقبال کی تاریخ گوئی کے فن کو نئی جلا بخشی ہے۔ حفیظ ہوشیار پوری کے فن کا ایک اور گمنام گوشہ علاقائی زبان کے تراجم بھی زیرِ نظر کتاب کے حوالے سے قارئین پر کھلتا ہے۔ انہوں نے سندھ کے چار فارسی شعراء کی تحریروں میں مثنوی ''ہیر رانجھا'' تلاش کر کے ۱۹۵۷ء میں سندھی ادبی بورڈ سے شائع کرائی اور دیباچہ کے طور پر ایک سو صفحات پر محیط سیر حاصل اظہارِ رائے کیا، جو ہیر رانجھا پر کسی بھی زبان میں تحقیق کرنے والے طالب علم کے لئے ایک نادر تحفہ ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے شاہ لطیف، سچل سرمست اور شاہ عنایت کی کافیوں کو سہل اردو سے متعارف کیا۔

تحقیقاتی مقالے کے آخر میں مصنف نے غزل گوئی کے حوالے سے حفیظ ہوشیار پوری کی شاعری میں مختلف موضوعات کی نشاندہی کی ہے، اس حوالے سے انہوں نے حفیظ ہوشیار پوری کے بعض اشعار کا فنی مقابلہ ان کے معاصرین اور اساتذہ سے بھی کیا ہے۔ آخر میں انہوں نے حفیظ ہوشیار پوری کی تین فارسی غزلیں بھی شاملِ تحقیق کیں، جن سے شاعر کی فارسی زبان پر دسترس کی

بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ چھ سو صفحات سے زائد اس تحقیقی مقالہ کے آخر میں حفیظ ہوشیار پوری کی چند تصاویر بھی شائع کر دی گئی ہیں تا کہ وہ نسل جسے حفیظ کو دیکھنے کا موقع نہ ملا، ان کی شبیہ سے ان کی ذات اخذ کر سکیں۔

تحقیق کے اس طویل سفر میں قاری پر دو باتیں کھلتی ہیں، تحقیقی مقالہ میں حوالہ جات کی تکرار بعض اوقات ایک ضروری روایت بن جاتی ہے، تاہم کتاب کی اشاعت میں ایسے تمام حوالہ جات جن کی نفس مضمون میں تکرار ہو کم کئے جا سکتے ہیں۔ دوئم یہ کہ چونکہ موصوف شاعر کا دیوان مارکیٹ میں موجود نہیں، اس لئے مناسب تھا کہ کتاب کے آخر میں حفیظ ہوشیار پوری کے کلام کا ایک منتخب حصہ شائع کر دیا جاتا۔ مختصر الفاظ میں ''بے زبانی زباں نہ ہو جائے'' اردو تحقیق میں ایک گرانقدر اضافہ ہے۔ جس کے سبب اردو ادب کی ایک قدآور شخصیت دوبارہ اپنے قاری سے متصل ہوتی ہے۔

کتاب: نفسِ جبرئیل (شعری مجموعہ)

مصنف: پروفیسر خیال آفاقی

مبصر: نوید ظفر

ناشر: مکتبہ المنیر ۵، نوید آرکیڈ، دستگیر سوسائٹی نمبر ۹، ایف بی ایریا، کراچی

قیمت: تین صد روپے

''نفسِ جبرئیل'' پروفیسر خیال آفاقی کا چھٹا شعری مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے ان کے پانچ شعری مجموعے ''شب نامہ''، ''درود خیال''، ''آبدیدہ''، ''خوابدیدہ'' اور ''عودِ سخن'' کے نام سے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ پروفیسر خیال آفاقی کے تمام مجموعہ ہائے کلام کی اشاعت ان کے برادر خورد پروفیسر مقصود پرویز کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ موجودہ شعری مجموعہ شاعر کی نسبت حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ سے مزید واضح کرتا ہے۔ مجموعے کا عنوان حکیم الامت کے درج ذیل شعر سے اخذ کیا گیا ہے۔

وہ حرفِ راز جو سمجھا گیا ہے مجھ کو جنوں☆ خدا مجھے نفسِ جبرئیل دے تو کہوں

نفسِ جبرئیل کا حوالہ شاعرِ مشرق کے مجموعۂ کلام بالِ جبریل کی بازگشت ہی نہیں خود پروفیسر خیال آفاقی کے اکثر اشعار فکرِ اقبال میں ڈوبے نظر آتے ہیں۔

ہونے کو ہے مغرب کا افق مطلعِ خورشید — رکھتا ہوں میں اس منظرِ اعجاز کا ادراک

بہتر ہے کھلے جسم کو مٹی میں چھپا دے — تن پر نہ سجا غیر کی اتری ہوئی پوشاک

مجموعہ کے آغاز میں ''درِ مقصود'' کے عنوان سے خیال آفاقی کے برادرِ خورد اور مرتب پروفیسر مقصود پرویز اور ڈاکٹر فاروق جوبش نے شاعر کے شعری میلان اور حکیم الامت حضرت علامہ اقبال سے ان کی نسبت کے بھرپور حوالہ جات دیئے ہیں۔ ''نفسِ جبرئیل'' کا آغاز ایک دعائیہ حمد سے ہوتا ہے۔

میں جلتا ہوا صحرا، تو ابرِ کرم ٹھہرا — چھم چھم نہ سہی مجھ پر، دو بوند ہی برسا دے

وہ ذوقِ سخن مجھ کو درکار ہے اے مالک — ہر شعر مرا مجھ کو اک مژدۂ فردا دے

خیال آفاقی نے روایت نبھاتے ہوئے حمد کے بعد نعت کے اشعار شاملِ مجموعہ کئے ہیں:

کیسا خودی شناس، کہاں کا خدا شناس — وہ دل نہ ہو سکا جو دلِ مصطفیٰؐ شناس

مرتب نے خیال آفاقی کی شاعری ترتیب دیتے ہوئے یہ اہتمام رکھا کہ غزل اور نظم کے اختتام پر خالی جگہیں شاعر کی رباعیات اور قطعات سے مزین کر دیں۔ ترتیب کا یہ اہتمام اشعار کی تخلیق کے ساتھ مرتب کے ذوقِ سخن کا پتہ دیتا ہے۔

☆ کتاب میں یہ مصرع درست نقل نہیں کیا گیا۔ اصل مصرعہ اس طرح ہے:

''وہ حرفِ راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں'' (ص ۳۱۹ کلیاتِ اقبال۔ اردو۔ شائع کردہ سرور کلب ۱۹۹۹ء) (ادارہ)

حمد و نعت کی روایت نبھانے کے بعد "نقشِ جبریل" میں ۹۷ غزلیات اور ۲۹ نظمیں شامل ہیں، مجموعہ کا اختتام، آغاز کی مانند حمد اور نعت کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ جو شاعر کی فکری اور ذہنی نسبت کی نشاندہی کرتا ہے۔ غزلیات تحریر کرتے ہوئے شاعر نے ہر بحر میں اشعار کہے ہیں، مختصر ترین بحر میں تحریر کیے گئے یہ اشعار سہلِ ممتنع کی نشاندہی کرتے ہیں:

عشق میں اعتدال کیا معنی — خواب میں بھی خیال، کیا معنی
چشمِ تر کو بھی دیکھ کر ہمدم — تیرے لب پر سوال، کیا معنی

بے تکلف وہ کب نہیں ہوتے — میں نہیں ہوتا، جب نہیں ہوتے
میں بھی ہوتا نہیں ہوں اپنے پاس — وہ مرے پاس جب نہیں ہوتے

مختصر بحروں میں شاعری کرنے والے شاعر نے طویل بحروں کو بھی اپنا پیرایۂ اظہار بنایا اور ان میں بھی حقِ سخن بخوبی ادا کیا:

کوئی جادہ نہ منزل نہ ہو ہم سفر، چلتے چلتے پہنچ جاؤں اس راہ پر
واپسی کا سبب نہ کوئی راستہ، پھر کہیں پوچھنا مجھ سے میرا پتا
مجھ کو پہچانتے جب لگے زندگی، مجھ کو اپنا سمجھنے لگے ہر کوئی
مجھ کو دشمن بھی دینے لگے جب دعا، پھر کہیں پوچھنا مجھ سے میرا پتا

نہ میں اپنے کام ہی آ سکا، نہ کسی کے ناز اٹھا سکا
ہے خرد بھی مجھ سے خفا خفا، ہے جنوں بھی مجھ سے کشاں کشاں
یہ نہیں کہ کھل ہی نہ کھل سکے، مجھے چار تنکے نہ مل سکے
رہیں جس میں آن کے بجلیاں، نہ بنا سکا میں وہ آشیاں

خیال آفاقی کے اشعار ان کی ندرتِ فکر کا پتہ بھی دیتے ہیں۔

کسی کی جنبشِ لب کا ہے انتظار مجھے — نہ بولنے لگیں دیوار و در تو پھر کہنا

اللہ تجھے بخشے اگر عشق کی توفیق — پھر کرنا کسی وقت مرے کرب کی تحقیق

عشق کی بارگاہ میں شمس و قمر بھی سجدہ ریز — آقا و بندہ صف بہ صف، کیسا نسب کہاں کی ذات

وہ آنکھ ہی پا سکتی ہے اس پار کا منظر — بن جاتی ہے جو آنکھ کہ شب دار و سحر خیز

میں جس کے قتل کے الزام میں ہوا مصلوب — وہ آدمی بھی سرِ دار تھا وہیں موجود

وطن سے دردمندی کا حوالہ خیالؔ کی نظموں میں اور بھی عود کر آتا ہے۔ ۱۲۸ اشعار کی نظم ''اک خوابِ پریشاں'' کے اختتام پر تحریر کرتے ہیں۔

نہ شبلی کی جھلک تجھ میں، نہ حالی کی کسک تجھ میں — نگینہ اشک کا گم ہو گیا ہے چشمِ خاتم سے
مرے ذوقِ سماعت کو نہ کر مجروح، رہنے دے — مری بزمِ سخن آباد ہے، اقبالؔ کے دم سے

''محمودِ سخن شیخ ایاز'' پر ۱۳۳ اشعار کا طویل مرثیہ خیالؔ کی آفاقی سوچ پر ایک اور مہرِ استناد ثبت کرتا ہے۔

حصارِ شب سے مثالِ سحر نکل آیا — وہ خود شناس، خدا یافت، خودنگر، خودساز
دلوں میں زندہ رہے گا وہ ایک مدت تک — نہ کر سکے گا زمانہ اسے نظر انداز

''نقشِ جبریل'' میں ایک نظم بچوں کے انداز میں ''جگنو اور ستارا'' کے عنوان سے ۳۰ اشعار میں رقم کی گئی۔ بنیادی خیال اقبالؔ کی مشہور نظم ''جگنو'' ہی سے اخذ کیا گیا ہے۔ اور نظم کا اختتام

بھی اقبال ہی کی سوچ سے ماخوذ ہے۔

جو لوگوں کے کام آئے وہی شخص ہے جگنو   اقبال اسے کہتے ہیں "ملت کا ستارا"

اس شعری مجموعے کا اختتام ایک دعائیہ حمد اور نعت کے ساتھ ہوتا ہے۔

بچا کے رکھ مجھے نفرت کی آگ سے یارب   مرے جنوں کو محبت کے ساتھ زندہ رکھ

عروج صاحب اسریٰ کا ہے وہاں آغاز   خیال ہوتا ہے جا کر جہاں خیال تمام

کتاب: ڈوبتی ہوئی پہچان

مصنفہ: حسانہ انیس

مبصر: نعیم فاطمہ علوی

ناشر: احمد برادرز پرنٹر۔ ناظم آباد، کراچی

قیمت: ۱۵۰ روپے

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم   تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

"ڈوبتی ہوئی پہچان" حسانہ انیس کے گیارہ افسانوں کا مجموعہ ہے جو اُنکی وفات کے بعد چھپا۔۔۔ پہچان تو جاننے کے عمل کو کہتے ہیں۔ جاننے کا عمل ڈوبنے کے عمل سے نکل کر اپنا آپ منواتا ہے۔ حسانہ بھی غروب ہونے کے بعد اس کتاب کی روشنی میں طلوع کا منظر پیش کرتی نظر آتی ہیں۔ کہانی کے موضوعات میں انہوں نے زندگی، بڑھاپا۔۔۔ ڈھلتی عمر کے مسائل، محبت، معاشرتی مسائل، ذہنی کشمکش غرض کئی قسم کے موضوعات کو چھوا ہے۔ ہمیں اُن کے افسانوں میں محبت کے کئی رنگ نظر آتے ہیں۔ کہیں انسانوں سے محبت، کہیں پرندوں سے محبت، کہیں مٹی سے محبت سب سے زیادہ

نمایاں پہلو محبت کا جو اُن کے تقریباً ہر افسانے سے چھلکتا ہے۔ وہ فطرت سے محبت ہے... وہ دریاؤں، ندیوں، درختوں، پھولوں کا ذکر کرتے کرتے ایک اور ہی دنیا میں چلی جاتی ہیں اور وہ اس دنیا میں اکیلی نہیں جاتیں بلکہ قاری کو بھی ساتھ ساتھ لے کر چلتی ہیں۔ بنگال کا حسن اُن کے افسانوں میں جا بجا جھلکتا نظر آتا ہے۔ روانی، تسلسل، شاعرانہ تخیل، نثر میں شاعری کے ساتھ ساتھ منظر کشی کے ایسے ایسے نمونے ملتے ہیں کہ کچھ دیر کیلئے انسان اُن خوبصورت مناظر میں کھو جاتا ہے۔

"ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے، دوڑتے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے، ناچتے تھرکتے، پتنگ اڑاتے ہوئے اُس کے بال پھاگن کی ہواؤں میں پیچھے پیچھے اڑتے جاتے اور وہ اُس کی چرخی سنبھالے اُس کی اڑتی ہوئی پتنگ پر نظریں جمائے اُس کے پیچھے پیچھے ہوتی۔ زندگی کے کئی خوبصورت موسم، ڈور، پتنگ، چرخی، کھلی ہوا اور چمکیلی دھوپ۔ تمتماتے چہرے اور بکھرے بالوں کے ساتھ آسمان پر ہلکے ہلکے تیرنے والے بادلوں کیطرح گزر گئے۔"

اس طرح کے بے شمار جملے اُن کے ہر افسانے میں تشبیہیں بناتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کہانی پر اُن کی گرفت بہت مضبوط اور یقیناً وہ ایک سلجھی ہوئی افسانہ نگار ہیں۔ جن کا خمیر افسانہ نگاری کے ماحول میں گندھا گیا اور افسانہ نگاری انہیں ورثے میں ملی۔

"نائٹ میٹرن کی کہانی"۔ ایک خوفناک سچائی۔ انسان کا المیہ۔ اولاد کی محبت۔ ہولناک تنہائی۔ زندگی کی حقیقت۔ محنت۔ لگن۔ محرومی۔ ذمہ داریوں میں بٹی ہوئی عورت کی کہانی ہے۔ ایسی جگ بیتی جو ایک خوفناک حقیقت کے روپ میں انسان کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ ایک کرب۔ ایک چیخ۔ ایک اسٹیج۔ ایک ڈرامہ اور پھر ڈرامے کا ڈراپ سین۔

"سنگ ساز" ایک ذہنی کشمکش کی کہانی جو بہت عمدگی سے بیان کی گئی ہے۔ "بے بال و پر" میں بہت ہی باریک بینی سے واقعات کا مشاہدہ کیا گیا ہے۔ فطری مناظر سے بھی ایک تلخ حقیقت جسے مصنفہ نے اپنے دلنشیں انداز میں بیان کیا ہے۔ اس کہانی میں یہ بھی بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ مقصدیت۔ محبت۔ لگن اور بھروسہ ہی انسان کو زندہ رکھتا ہے۔ اگر زندگی میں ان چیزوں کا فقدان ہو

تو زندگی بوجھ لگنے لگتی ہے۔

''اس کے اشتیاق کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے جوڑوں کے درد سے بھی بے نیاز ہو گیا اور جو کسی سہارے کے بغیر کھڑا بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اب پنجوں کے بل کھڑا ہو کر گھونسلے میں جھانکا کرتا...... اور پھر ایک دن لوگوں نے حیرت سے دیکھا کہ وہ جو تقریباً مفلوج سا ہو کر اپنے کمرے تک محدود ہو گیا تھا۔ اپنے پیروں سے سیدھا چل کر پنساری کی دکان تک گیا۔''

مقصدیت انسان کو توانائی عطا کرتی ہے۔ مایوسی، محرومی اور بے مقصدیت زندہ درگور کر دیتی ہے۔ 'بے بال و پر' اور 'نائٹ میئر' ملتا جلتا خیال ہے۔ جسے مصنفہ نے بڑی مہارت سے بیان کیا ہے۔ ان کی کہانیاں سوچ کے در کھولتی ہیں۔ اور انھیں ہم ایسی کسوٹی کہہ سکتے ہیں جن پر انسان اپنے آپ کو پرکھ سکتا ہے۔

'ڈوبتی ہوئی پہچان'، اداسی، محبت، تنہائی اور فرائض کی لاجواب داستان دو کہانیاں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ ایک لڑکی کی کہانی اور دوسری مسز یادور کی کہانی اور پھر دونوں کہانیاں آپس میں گھل مل جاتی ہیں اور پڑھنے والے پر ایسا تاثر چھوڑتی ہیں جو بھلائے نہیں بھولتا۔

''گداں'' سقوط ڈھاکہ کے گرد گھومتی کہانی جس میں تلخ یادیں بھی ہیں اور معاشرتی حقائق بھی۔ حالات کا آنکھوں دیکھا حال بھی اور خوابوں کی کرچیاں بھی۔

ان کے افسانوں میں زندگی کی تلخ حقیقتیں ہیں مگر مایوسی نہیں یہ اُن کا اندازِ بیان ہے جو قاری کو فطری حسن کی رنگینیوں کی سرشاری، سرمستی، بچوں، پھولوں، تتلیوں اور اشاروں کے بیچ زندگی کے تلخ حقائق سے بھی روشناس کرا دیتا ہے۔ اور یہ سچ کڑوا ہونے کے باوجود ایک مثبت تاثر قائم کرتا ہے۔ وہ منہ چھپاتا ہوا یا اس کڑوے سچ کو نظر انداز کرتا ہوا نظر نہیں آتا بلکہ اپنا محاسبہ کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

''رات سے پہلے'' بنگال کی خوشبو میں گندھا ہوا یہ افسانہ محبت میں رچی ہوئی ایسی کہانی ہے۔ جو عورت کے اندر وفا شعاری، محبت، خلوص کے جذبے کو اجاگر کرتی ہے۔

حسانہ انیس اگر زندہ ہوتیں تو نجانے کتنے خوبصورت افسانے اُن کی نوکِ قلم سے تخلیق کا

مرتبہ پاتے۔ مگر انہوں نے جو لکھا وہ بھی کچھ کم نہیں۔۔ اُن کے افسانے ہمیں بنگال کی سرزمین میں لیجا کر فطرت کا وہ حسن دکھاتے ہیں جہاں پدما اور برہم پترا کی لہریں، کرشنا چورا کے پھول، ناریل اور کیلے کے درخت، دھان اور پٹ سن کے ہرے بھرے کھیت، بانس کے لہلہاتے جنگل، بہتی ندیاں، ابھرتی ڈوبتی کشتیاں، بادبان، آم اور کٹہل کے باغات، دولجن، چمپا اور گندھوراج کے پودے، موتیا اور گلاب کی کیاریاں، سانکھو اور ڈھاک کے لمبے اور سیدھے درخت ہمارے تخیل میں رچ بس جاتے ہیں اور مدتوں ہم ان کے سحر میں کھوئے رہتے ہیں۔

کتاب: تصویر خانہ
مصنف: ممتاز رفیق
مبصرہ: نیم فاطمہ علوی
ناشر: پاکستان رائٹرز گلڈ، سندھ
قیمت: ۲۵۰ روپے

سوانح نگاری اور طنز و مزاح سے جنم لینے والی صنفِ سخن جسے خاکہ نگاری کا نام دیا گیا ہے۔ ایک مشکل صنفِ سخن ہے۔ خاکہ لکھنے کیلئے ایمانداری، خلوص، بے پناہ قوتِ مشاہدہ، ممدوح کی شخصیت میں اتر جانے کا فن اور ایک ماہرِ نفسیات ہونا بہت ضروری ہے۔ خاکہ نگار کو خاکہ لکھتے ہوئے اپنے جذبات پر قابو رکھنے اور غیر جانبدار ہونے کیلئے بھی شعوری کوشش کرنی پڑتی ہے۔ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے جس طرح ہر انسان کو دوسرے انسان سے اشکال کے اعتبار سے مختلف بنایا ہے۔ اسی طرح رنگا رنگ شخصیت سے بھی نوازا ہے۔ خاکہ پڑھنا اور لکھنا گویا انسان کو جاننے، سمجھنے اور پرکھنے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ انسان کی زندگی نہ تو شاخ پر کھلا ہوا گلاب ہے اور نہ ہی ساکت و جامد پانی ...... وہ بھی اونچے نیچے راستوں سے گزرتی ہوئی اپنی منزلِ مقصود کی طرف رواں دواں رہتی ہے۔

ممتاز رفیق صاحب کے منہ زور قلم کی طاقت ہر خاکے میں سر چڑھ کر بولتی ہوئی نظر آتی ہے۔ انداز بیان ایسا جیسے آپ کوئی داستانوی ادب کا مطالعہ کر رہے ہوں۔ ...تشبیہات کا استعمال بھی خوب کیا ہے۔ بعض جگہ تو تشبیہات سے تصویر خود بخود آنکھوں کے سامنے فلم کی طرح چلنے لگتی ہے۔

"بادام بوٹے کا سا قد، گہری سانولی رنگت، کسی بخیل کی جیب جیسی تنگ پیشانی اور ستھی سی ناک سے جڑی دو چھوٹی چھوٹی بے حد چمکدار اور پراسرار آنکھیں، مختصر سا دہانہ، پتلے پتلے ہونٹ اور کیڑا لگے خربوزے جیسے بجھی سفیدی ایسی رنگت کے دانت۔"

خاکہ نگاری جیسا کہ میں پہلے کہہ چکی ہوں ایک مشکل فن ہے۔ سچ کہنا اور سچ بھی ایسا کہ جس میں دلآزاری کا پہلو نہ ہو۔ جھوٹ ملمع سازی بے جا تعریف یا تنقید سے دامن بچا کر شخصیت کے سمندر میں کود کر حقیقت تلاش کرنا اور اُسے خوبصورت انداز تحریر سے مزین کرنا ان کا خاصا ہے۔......مگر جہاں تک دلآزاری کا تعلق ہے، سچ یقیناً کڑوا ہوتا ہے۔ بعض حقیقتیں ایسی ہوتی ہیں جو انسان جانتے ہوئے بھی سننا نہیں چاہتا۔ مگر سچ بولنے والا خاکہ نگار مصلحتوں کے دبیز پردوں کو ہٹا کر اُس کی نشاندہی کرتا ہے۔ اُن کے خاکے شخصیت کی من و عن تصویر کھینچتے ہیں۔ خاکہ پڑھنے کے بعد دماغ پر کوئی بوجھ محسوس نہیں ہوتا۔

"تصویر خانہ" ایسے شخص کے لکھے ہوئے خاکے ہیں جو خاکوں کی ہئیت اور ہیئت پر گہری نظر رکھتا ہے۔ خاکوں کی دنیا میں خوشگوار اضافے کے ساتھ داخل ہونا چاہتا ہے۔ خاکہ نگاری گردو پیش میں لکھے جانے والے خاکوں پر بھی ناقدانہ نظر ہے اور ہم عصر دوستوں کے خاکے لکھ کر منفرد حیثیت سے اپنی پہچان بھی رکھتا ہے۔ پیش لفظ میں ایک جگہ لکھتے ہیں: "بعض خاکے میں نے اپنے دوستوں کی زندگی میں تحریر کیے اور اُن میں اکثر دوستوں نے نہ صرف ان کا مطالعہ کیا بلکہ مجھے اپنے ردِ عمل سے بھی سرفراز کیا۔" ردِ عمل میں لوگوں کا ناقدانہ اور معترفانہ رویہ ہی کسی ادب پارے کی عظمت اور سچائی کا تعین کرتا ہے۔

خاکہ نگاری کا فن مولانا محمد حسین آزاد کی کتاب "آب حیات" سے شروع ہو کر خواجہ حسن

غلامی، فرحت اللہ بیگ، مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، چراغ حسن حسرت، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، شوکت تھانوی، ضمیر جعفری اور مختار مسعود سے موجودہ دور میں داخل ہوتا ہے۔
خالی آدمی کی کوشش اور کاوش توانائیوں کی شمع جلاتی ہوئی یقیناً اس صف میں شامل ہوتی نظر آتی ہے۔

کتاب کا عنوان اور اپنے ممدوح کو دیے ہوئے نام لاجواب ہیں۔ خاکہ پڑھنے کے بعد وہ نام کوزے میں دریا بند ہوتا ہوا دکھائی دیتے ہیں۔ جوں جوں آپ خاکہ پڑھتے ہیں۔ اُن ناموں کے اوصاف کھلتے چلے جاتے ہیں۔ مثلاً 'اُدکھا منڈا'، 'شعلے پر صافہ'، 'جاسی لڑکی'، 'مجید بھری'، 'بوڑھا بالک'... یہ ایسے نام ہیں جن کا مزا اور لطف خاکہ پڑھنے کے بعد ہی لیا جا سکتا ہے۔ 'اُدکھا منڈا' میں منیر نیازی کی شخصیت سراپا نگاری اور دنیائے ادب میں اُن کی حیثیت متعین کر کے اُن میں ایک حساس طبیعت شاعرانہ خیالات کی بلندی اور نفسیاتی الجھنوں کا تجزیہ اپنے تجربے کی روشنی میں بہت ہی عمدہ کیا ہے۔ نفسیاتی الجھنوں کی تصویر کشی ملاحظہ فرمائیں:

''نیرنگیٔ زمانہ بھی خوب ہے یہ وہی شخص ہے جو مخالف سمت سے آنے والے ہوا کے جھونکے پر بھی تلوار سونت لیتا تھا اور آج اُس کے آس پاس موت اور بیماریاں ہیں، وہ تھکن سے چور فریاد کناں ہے میرے عذابوں کو شیئر کرو۔''

منیر نیازی جیسے شاعر کا خاکہ لکھنے کیلئے اُس کے ذہن تک رسائی حاصل کرنا، وقت کے صحرا میں ہواؤں سے مدوجزر بناتے ہوئے اتار چڑھاؤ کے ساتھ شخصیت اور کردار کے ہر رخ کو قاری کے سامنے ایک ہمدرد اور دوست سرجن کی طرح لفظوں کے پیکر میں ڈھالنا کوئی آسان بات نہیں۔
منیر نیازی کا خاکہ ایک شاعر کی آپ بیتی محسوس ہوتی ہے جو اپنے تھیں کسی اور کے قلم سے لکھی گئی۔
'بوڑھا بالک' کو دیکھیے۔ وہ بہت ہی خوبصورتی سے بات کہتے ہوئے گزر جاتے ہیں اور قاری لفظوں اور جملوں کی تہوں میں چھپے ہوئے تہہ در تہہ معنی تلاش کرتا، مسکراتا اور ذہن کے کینوس پر تصویر بناتا حظ سے لوٹتا رہتا ہے۔

''اُس کے بالکوں جیسے حلیے اور نوجوانوں کی سی ترنگ سے شاید اُسے بھی اس وہم

میں مبتلا کر رکھا ہے کہ اُس کی زندگی میں وقت ایک خاص عمر پر پہنچ کر منجمد ہو گیا ہے۔''

بہر حال خاکہ نگاری کسی بھی شخصیت کی مکمل اور جامع تصویر نہیں ہو سکتی کیونکہ ہر انسان کا دوسرے انسان کو پرکھنے کا اپنا انداز اپنا طریقہ اور اپنا سلیقہ ہوتا ہے۔ انسان کتنا بھی سچا اور کھرا ہونے کی کوشش کرے، بہر حال بشری کمزوریوں سے بچ کر نکلنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ جامنی لڑکی کا خاکہ پڑھتے ہوئے ایک دبی دبی سی کسک محسوس ہوتی ہے۔ اس کو کسی بشری کمزوری کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ اور دیکھنے پرکھنے کا بے باک انداز بھی۔ شخصیت کا باریک بینی سے جائزہ عمدہ ہے مگر کہیں کہیں یہ طبیعت پر گراں بھی گزرتا ہے۔

''میں نے پہلی بار اُسے دیکھ کر سوچا تھا کہ لڑکیوں کو کم از کم اپنا آپ سنوارنے کا سلیقہ تو آنا چاہیے۔''

''پہلی ملاقات میں ہم بے مکالمہ رہے تھے اور یوں بھی ایسے بے رس لوگوں سے مکالمہ میرے لئے کچھ زیادہ مرغوب عمل نہ تھا۔''

''اس کی آواز سے چبھن کا احساس ہوتا تھا جیسے حلق میں نوکیلی ہڈی آ پھنسی ہو۔''

''روٹی کے ایک لقمے اور شوربے کی تلچھٹ کے عوض انہیں اپنی خواہش کے مطابق ہانکنا ممکن تھا۔''

خاکہ لکھتے ہوئے بیباکی، خود اعتمادی اور مضبوط قوت ارادی تمام حجابات سے نکل کر دھم سے سامنے آ جاتی ہے۔ بہر حال نوک قلم کی زد میں آنے والے اُن کے تمام کردار مسلط نہیں ہوتے بلکہ حیرانگی کے در کھولتے ہوئے، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو گدگداتے، چھیڑتے، جھنجوڑتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔

مراسلات

پروفیسر محمد اویس جعفری۔ سیاٹل (امریکہ)

آپ کا اداریہ ہماری معاشرتی تنزلی کے مرض کی صحیح تشخیص کرتا ہے۔ گزشتہ چند دہائیوں میں تعلیم کے ضمن میں جو خلیج واقع ہوئی ہے اس کو پُر کرنا خاکم بدہن ناممکن ہے البتہ ابتدائی تعلیم کے اور اساتذہ کی تربیت گاہوں کے نصاب میں انقلابی تبدیلیاں اگر آج بھی لائی جائیں تو اُس کے ثمرات آئندہ دس پندرہ سالوں میں مرتب ہو سکتے ہیں۔ وحیِ الٰہی کا آغاز "اقراء" سے ہوا۔ حضورؐ کی ذات اُمّی لقب ؐ نے تحصیل علم کو ہر مسلمان مرد اور عورت پر لازم فرمایا اور تاکید فرمائی کہ علم و حکمت مومن کی گمشدہ میراث ہے جہاں بھی ملے اُسے اخذ کر لیا جائے۔ ان واضح ترین اشارات و احکام کے باوجود تعلیم سے صرفِ نظر کرنا ایک ناقابلِ معافی جرم ہے جس کی تلافی بہرحال کرنی چاہیے اور کرنی پڑے گی۔

سید مودودی مرحوم پر جناب ڈاکٹر معز الدین کا مضمون ایک نئے زاویۂ نظر کا حامل ہے۔ قدرت نے مولانا کو ایک خاص اسلوب نگارش عطا کیا تھا۔ وہ عالمانہ اصطلات کی گنجلک اور فلسفہ و منطق کی گتھیوں سے آزاد دریا کی روانی کی طرح آسان و دلنشین تحریر سے دل و دماغ کو مسحور کرنے کا فن جانتے اور اُس میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔ مولانا کی تصنیفات کا کم و بیش ۲۵ زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ بطور خاص عرب دنیا میں اُن کا سکہ چلتا ہے۔ ترکی کی درسگاہوں نے مولانا پر تحقیق کرنے والے طلبا کو ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں عطا کی ہیں۔ اُنؒ کی انشا پردازی پر پروفیسر رضا احمد بدایونی، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی، ماہر القادری، ڈاکٹر احسن فاروقی، ڈاکٹر محمد یوسف اور جناب ابو الخیر کشفی جیسے مشاہیر نے جو کچھ لکھا ہے، خورشید احمد صاحب نے اُسے "ادبیات مودودی" میں یکجا کر دیا ہے۔ علما وارث انبیاء ہوتے ہیں، معصوم نہیں ہوتے، اس لئے اختلاف کی گنجائش ہمیشہ رہتی ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا مفتی محمد یوسف صاحب کی دو جلدوں پر تصنیف "مولانا مودودی پر اعتراضات کا علمی جائزہ" ایک بہت کامیاب کاوش ہے۔ مولاناؒ ایک حقیقت پسند مورخ تھے جو تاریخ کو جذبات

سے بالا تر ہو کر دیکھتے تھے۔

ڈاکٹر شاہد کامران اقبال صاحب کا ترجمہ و تجزیہ ایک اچھا مطالعہ ہے۔ جس طرح معروف اور قابل قدر کتابوں کے نئے ایڈیشن شائع ہوتے ہیں اسی طرح اگر اللہ تبارک و تعالیٰ شخصیتوں کے دوسرا ایڈیشن نہ تخلیق فرماتے تو ہر مسلمان ملک کو ایک سرسید کی اشد ضرورت پہلے بھی تھی اور آج بھی ہے۔

پیش نظر شمارہ میں جناب حسرت کاسگنجوی، جناب انتخاب علی کمال، جناب رشید درانی، جناب عزیز الدین خاکی کے مضامین نے اُس مردِ درویش، رفیق عزیزی کی بہت سی خوبیوں کی نقاب کشائی کی ہے۔ اپنے ہم عصر اور ہم ارادت جناب بابا ذہین شاہ تاجی مرحوم کے کلام کی املا کی منزل سے لے کر "آیاتِ جمال" کی اشاعت کی منزل تک پہنچانے کا سہرا بھی جناب رفیق عزیزی مرحوم کے سر ہے۔ اسی قبیلۂ عشاقانِ رسولؐ کے ایک اور نامور بزرگ جناب حشمت یونس گزرے ہیں۔ جو خلوت پسندی کے شیدا اور نفی ذات کے مسلک پر شدت سے کاربند تھے۔ کیف و سرمستی اور سوز و درد میں ڈوبا ہوا صرف کچھ کلام اُن کے ارادتمندوں نے بشکل جمع کر کے ۱۱۲ صفحات پر مشتمل "جمالِ الہام" کے نام سے شائع اور محفوظ کر لیا ہے۔

چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

پروں کو منہ میں چھپائے قفس میں بیٹھا ہوں　　　قفس میں چھیڑنے آتی ہے کیوں بہار مجھے

ہو دوئی کا شائبہ دل میں تو حشمت شرک ہے　　　تیرے ہی جلوے ہیں ہر سو تو ہی تو ہے ہر طرف

حجاب اُٹھے تو روح الامین حیراں تھے　　　کہ پہلی بار جمالِ بشر کو دیکھا تھا

کیا خوب شعر ہے:

کریم بھی ہے، رؤف و رحیم بھی ہے جو ذات　　　چلو خدا نہ سہی وہ خدا خصال تو ہے

ذرا ایک نعت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جو حضرت امیر خسروؒ کے مزاج شاعری سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں:

اُس انساں کے مَل مَل جاؤں جو انساں رب شان ہوا
زوپ سروپ خسرو کے سے وہ جھانکا تو بھگوان ہوا

مَل میں جو آکاش پہ پہنچا، جا کے رب سے باتیں کیں
ایسا اشرف، ایسا اعلیٰ، ایسا چتر انسان ہوا

چڑھتے چاند کے دل کو چیرے اُترے سورج کو لوٹالے
سَج ہو ایسے نہالی کی :: ایسا ملوان ہوا

جناب خواجہ منظر حسن منظرؔ، جناب احمد شکیل، جناب ضیاء الحسن ضیاؔ اور جناب ع ۔ق آور کا شعری نذرانہ رفیق عزیزی صاحب سے اُن کے تعلق کا مظہر ہے۔ انھیں صفحات میں جناب عبدالرحمٰن عبیدؔ کا ایک قطعہ بھی دمک رہا ہے۔ اگر موقع ملے تو اُن کا شعری مجموعہ ''جب زرد ہو موسم امرد کا'' ملاحظہ فرمایئے، مجھے یقین ہے الاقربا کے قارئین کو پسند آئیگا۔ وہ افسانہ نگار بھی ہیں۔ میں الاقربا میں اُن کا افسانہ دیکھنے کا آرزومند ہوں۔ حمد ونعت، نظم وغزل کا حصہ ہمیشہ کی طرح پُر بہار ہے۔ جناب ڈاکٹر عاصی کرنالی کی نعت سُبک، رواں، پُر تاثیر ہے۔ بار بار پڑھنے کو دل چاہتا ہے۔

جناب ابوالخیر کشفی کی تحریر نے نومبر ۱۹۹۳ء میں، صہبا اختر صاحب سے ملاقات کی یاد تازہ کردی۔ وہ بین الاقوامی مشاعرہ میں شرکت کے لئے سیاٹل تشریف لائے تھے۔ ملک زادہ منظور احمد، جناب منظور حسین یادؔ اور جناب ساغر خیامؔی کے علاوہ دیگر شعرا بھی اس قافلہ میں شامل تھے۔ چند یوم کے قیام میں صہبا مرحوم سے اچھی ملاقات رہی اور ''رہ وادیٔ خیال''، ''نگار وطن کے نام''، ''خراج'' و ''عقیدت'' جیسی تصنیفات کے خالق کو قریب سے دیکھنے اور سُننے کا موقع ملا۔ وہ اپنے آپ کو ''فقیر'' اور ''مسافر'' کہنے میں بہت فرحت محسوس کرتے تھے۔ وہ عجز کے اظہار کے لئے کبھی کبھی دست بستہ ہو جاتے۔ چہرہ کے تاثر انگلیوں کی جنبش اور الفاظ کی ادائگی سے اشعار کے معنی کی وضاحت کرتے اور لب ولہجہ میں جذبات کی گھن گرج صاف سنائی دیتی۔ جن لوگوں نے صہباؔ کو سنا ہے وہ میرے اس قطعہٴ تعارف کے آئینہ میں صہباؔ اختر کو دیکھ سکتے ہیں۔ جو مشاعرہ میں، میں نے ارتجالاً کی نذر کیا تھا:

شورِ طوفاں گھن گرج، برق و شرر کا اژدہام — قاصدِ شبنم کی دستک، نکہتِ گل کا خرام
وادیٔ مینائے حرف و صوت کا شعلہ نوا — وہ کلیمِ لفظ و معنی صہبا اختر جس کا نام

اپنے مجموعہ کلام "سرکشیدہ" پر میرے لئے آٹوگراف کے ساتھ یہ خوبصورت شعر رقم فرما گئے۔

مسافرانہ گزر جا کسی صدا کے بغیر — کہ دیرِ پرسشِ دل ہے میرے دیار میں چپ

اِسی مشاعرہ میں انھوں نے اپنی معرکتہ الآرا نظم "اردو" بھی سنائی اور بے پناہ داد پائی۔
ایک واقعہ صہبا اختر کے میزبان کی زبانی سنیے:

"مجھے صہبا اختر صاحب کے میزبان ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ ایک شب کھانے کے بعد دیر تک شعر و ادب پر گفتگو ہوتی رہی۔ میں نے اپنے مہمان سے برسبیلِ تذکرہ کہا کہ آپ جیسے زبان و بیان پر قادر الکلام شعرا وطن کی صورتِ حال پر کیوں خاموش ہیں۔ آپ ایک انقلاب کے داعی ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ سُن کر صہبا اختر کا چہرہ یک لخت بدل گیا، کچھ دیر خاموش رہے اور پھر زار و قطار رونے لگے۔ میں سخت نادم ہوا اور اُنھیں اُن کی خواب گاہ تک جب چھوڑنے گیا تو مستقل معذرت خواہی کرتا رہا۔ کوئی نصف گھنٹہ کے بعد واپس تشریف لائے اور فرمایا کہ وطن کی صورتِ حال پر میں نے بہت کچھ لکھا ہے، مگر اُسے نہ کوئی پڑھنا پسند کرے گا اور نہ ایسے مشاعروں میں اُسے کوئی سنجیدگی سے سنے گا۔ اس کے بعد صہبا صاحب نے اپنی نظمیں اور غزلیں سنائیں اور بہت خوب سنائیں، کاش میں پہلے سے تیار ہوتا اور اس محفل نشست کو ریکارڈ کر سکتا۔ صہبا ایک بے حد حساس شاعر تھے جو ارضِ وطن سے والہانہ عشق رکھتے تھے۔"

ڈاکٹر انور سدید، لاہور

"الاقرباء" باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ میں نادم ہوں کہ کچھ عرصے سے آپ سے میرا

رابطہ کٹا رہا۔ اور میں ''الاقرباء'' کی محفل دانشوراں میں شامل نہ ہو سکا۔ قصور میرا ہے کہ میں نے
ہفت خواں عبور کرنے کے بعد سُستی کو اپنے اوپر طاری کر لیا۔ میں پہلے آج کا کام کل پر ڈالنے کی
جسارت کر لیتا تھا۔ سُستی کا غلبہ ہوا تو آج کا کام پرسوں پر ڈالنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے
کام ..... بلکہ بہت ضروری کام ملتوی ہونے لگے۔ آپ کو خط لکھنے کا ارادہ کرتا تو کبھی کاغذ دستیاب نہ
ہوتا اور کبھی قلم نہ ملتا۔ آج ''الاقرباء'' کے سرورق پر نظر پڑی تو معلوم ہوا کہ آپ نے ترشی ترشائی
پنسلوں کا تحفہ مجھے عنایت فرمایا ہے۔ میں نے اس سرورق سے لکھنے کی تحریک حاصل کی اور اب آپ
سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔

محترم منصور عاقل صاحب! آپ نے نظام تعلیم کے تہذیبی و ثقافتی مضمرات پر اداریہ بڑی
دردمندی سے لکھا ہے۔ میں آپ کے اس کرب میں شامل ہوں کہ آج کے حکمرانوں نے بانی پاکستان
کے طے کیے ہوئے نظام تعلیم کا سہ نکاتی منشور یکسر پس پشت ڈال دیا۔ قائداعظمؒ نے فرمایا تھا کہ ہمیں
ایسے نظام تعلیم کی ضرورت ہے جو (بحوالہ صفحہ نمبر ۲) اول: پاکستان کے ذہنی و فطری میلانات کا
عکاس ہو۔ دوم: ہماری تہذیب اور تاریخ سے ہم آہنگ ہو۔ سوم: جدید اور ارتقائی عوامل سے
مطابقت رکھتا ہو۔ لیکن بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ اب اکیسویں صدی میں اس منشور کو مسترد کر کے مشرق
کے مسکینوں کو مغرب کے ملکوں سے مشروب فراہم کیا جا رہا ہے۔ اور اپنے قومی تشخص کو زائل کرنے
کے لئے اس مشروب کو پینے پر مجبور بھی کیا جا رہا ہے۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ انگریزی کی تعلیم پرائمری
کے پہلے درجے سے شروع ہو گئی ہے لیکن عربی اور فارسی کو اختیاری درجہ بھی حاصل نہیں رہا ہے۔
لاہور کے ایک کالج کے عربی کے استاد میرے ساتھ نوائے وقت میں شام کی نشست میں کام کرتے
تھے۔ میں نے دریافت کیا کہ آپ کالج میں ایف اے اور بی اے کے طلباء کو پڑھانے کے بعد اخبار کا
ذہنی کام کرنے میں دقت محسوس نہیں کرتے؟ ہنس کر بولے! ''او رسدید میرے کالج میں ایک لڑکا بھی
عربی نہیں پڑھ رہا اور فارسی کے طلباء کی تعداد چار پانچ سے زیادہ نہیں'' بہت عرصہ پہلے قائداعظم
لائبریری میں ''اقبال اکیسویں صدی میں'' کے عنوان سے ایک مجلس مذاکرہ منعقد ہوئی، مرزا محمد منور
اور اس ناچیز نے اقبال کو دوامی شاعر قرار دیا۔ صدارت ڈاکٹر جاوید اقبال کر رہے تھے۔ جو فرزند

اقبال ہیں، انہوں نے ارشاد فرمایا کہ اقبال اکیسویں صدی میں زندہ نہیں رہے گا اور وجہ بیان کی کہ پاکستان میں فارسی کی تعلیم روبہ زوال ہے اور یہ سب شاید (آپ کے الفاظ میں) قوم کے ''او (O) ور'' ''اے'' (A) لیول کے حسل نامسعود کا نتیجہ ہے جسے روشن خیالی سے بھی تعبیر کیا جا رہا ہے۔ آپ نے السنۂ شرقیہ میں سے کسی ایک میں اعلیٰ سند حاصل کرنے کے بعد صرف انگریزی کے مضمون میں امتحان پاس کر کے مزید اعلیٰ اسناد حاصل کرنے کے حق کی طرف توجہ دلائی ہے افسوس کہ اب ادیب فاضل اور منشی فاضل کا تصور ہی ختم ہو چکا ہے اور بیدار بخت مرحوم کے بعد کوئی ''ایم اے'' ''ایم او ایل'' بھی نظر نہیں آتا لیکن ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کرنے والے کھمبوں کی طرح نمودار ہو رہے ہیں۔ طلب اور رسد کے تحت اب عملی صورت یہ ہے کہ ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالات مناسب اُجرت پر لکھے جا رہے ہیں۔ جب سے اس ڈگری کے ساتھ پانچ ہزار روپے ماہانہ کا ایڈوانس دینا منظور کیا گیا ہے۔ ان ڈگریوں کے امیدواروں نے منصوبہ بندی سے سرمایہ کاری شروع کر دی ہے لیکن علم کا معیار گرتا جا رہا ہے۔ اور موج تیز میں قوم ڈوبتی جا رہی ہے۔ آپ کے اداریے کو تحریک بنانے کی ضرورت ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر شاہد اقبال کامران صاحب نے ''خطبہ اسلامیہ۔ ایک عمرانی مطالعہ'' کے تحت خطبۂ علی گڑھ ۱۹۱۰ء کا ترجمہ و تجزیہ پیش کر کے انجمن حجاز کے مقام اور انجام کی اچھی وضاحت کر دی ہے۔ اس خطبے کا ترجمہ مطالب و معانی کو بڑی خوبی سے آشکار کرتا ہے۔ شاہد کامران صاحب نے حواشی بے حد قیمتی ہیں اور زیرک نگہی سے مرتب کیے گئے ہیں۔

سید ظفر صاحب ''وطن کے خدوخال'' کے عنوان سے اہل پاکستان کو دور افتادہ مقامات سے متعارف کرا رہے ہیں۔ اس مرتبہ ان کا موضوع شاہینوں کا شہر ''سرگودھا'' ہے جو میرا بھی شہر ہے۔ میں نے یہ مضمون بڑی دلچسپی سے پڑھا۔ اس مضمون میں اس شہر کے اطراف و جوانب کا ذکر زیادہ ہے۔ لیکن شہر سرگودھا کا ذکر بہت کم ہے۔ مرکزی موضوع مزید تفصیل کا تقاضا کرتا ہے☆۔ گوشۂ رفتگاں میں اس دفعہ رفیق عزیزی صاحب کو یاد کیا گیا ہے۔ اس گوشے میں ڈاکٹر

☆ فاضل مراسلہ نگار نے جس کمی کی طرف اشارہ کیا ہے اس کی تلافی کا اہتمام زیر نظر شمارہ میں کیا گیا ہے۔ سرگودھا ہی کے ایک محقق اہل قلم جناب شاکر کنڈان کا مقالہ بعنوان ''سرگودھا کی وجہ تسمیہ'' شریک اشاعت ہے۔ (ادارہ)

حسرت کاسگنجوی اور عزیز الدین خاکی کے مضامین معلومات افزا ہیں۔ پروفیسر ابوالخیر کشفی نے "صہبا اختر اور احباب" کے عنوان سے مقالہ لکھا اور خود دنیا سے کوچ فرما گئے۔ ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ نے اپنی جامعہ کراچی کی یادوں سے بڑی عقیدت سے بازیافت کیا ہے۔ طنز و مزاح کے حصے میں پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالی صاحب کا "دکن سے دلی تک۔۔۔۔ غزل کی سفر کہانی" اور جناب مشکور حسین یاد کا "انشائیہ" پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے۔۔۔ میں نے دلچسپی سے پڑھے۔

یہ احوال نے قرات اول کے حاصل کے طور پر پیش کیا ہے۔ اب اس پرچے کے باقی حصے دوسری قرأت میں اپنے دل میں اتاروں گا۔ ظاہر ہے کہ یہ کام کل ہوگا یا پرسوں۔ لیکن مناسب سمجھا کہ اپنا تاثر آپ تک پہنچا دوں۔ "الاقرباء" باقاعدگی سے نکل رہا ہے اور خطوط سے یہ حقیقت عیاں ہے کہ اہل نظر اس سے استفادہ کر رہے ہیں۔ الاقرباء فاؤنڈیشن کی اس ادبی خدمت کی جتنی تحسین کی جائے کم ہے۔ اپنی گذشتہ طویل غیر حاضری کے لئے معافی کا خواستگار ہوں۔

کلب علی خاں۔ دہلی (بھارت)

یاد نہیں آرہا ہے کہ دو ایک سال قبل کس نے الاقرباء کا ذکر کیا تھا، غالب گمان یہ ہے کہ وہ جناب آنند موہن گلزار زتشی تھے۔ اس لئے کہ وہی علمی و ادبی جرائد کا چلتا پھرتا انسائیکلو پیڈیا ہیں۔ بات آئی گئی ہوئی۔ گذشتہ دنوں مختصر قیام کے لئے امریکہ جانا ہوا تو محبی و مشفقی جناب ڈاکٹر امین قدوائی، صدر بزم ادب اردو، واشنگٹن نے نہ صرف اس مجلّہ کا تعارف کرایا بلکہ مطالعہ کے لئے چند شمارے بھی عطا فرمائے۔ انہی کی فرمائش پر آپ نے جولائی۔ ستمبر ۲۰۰۰ء کا شمارہ بھی ارسال فرمایا۔ میں دونوں کرمفرماؤں کا بے حد احسان مند ہوں کہ انہوں نے ایک معیاری جریدہ تک رسائی ممکن فرمائی۔

بعض اوقات بھول نعمت بن جاتی ہے اور مہمان تو خیر ہمیشہ ہی موجب خیر و برکت ہوتے ہیں۔ ہوا یوں کہ میں انٹرنیٹ پر الاقرباء پڑھ رہا تھا اور جناب محمد شفیع عارف دہلوی کے عالمانہ مضمون "حضرت جگر کا سرمایۂ غزل" کے مطالعہ میں غرق تھا کہ اچانک کچھ مہمان آگئے اور سلسلہ

منقطع ہو گیا۔ بعد میں، میں نے ذہن پر بہت زور ڈالا کہ کونسا شمارہ تھا مگر یاد نہیں آیا۔ چنانچہ اُس مضمون کی بازیابی کے لئے میں نے اول سے آخر تک تمام شماروں کی ورق گردانی کر ڈالی، اور مطلوبہ مضمون کو جولائی۔ ستمبر ۲۰۰۵ کے شمارہ میں جا لیا۔ اسی جستجو میں جناب اسماعیل قریشی صاحب کا مضمون ''علامہ اقبال، حضرت جگر اور مولانا مودودی نظر آیا جو بے حد معلومات افزا ہے۔ جگر مرحوم سے میرے بزرگوں کے خصوصی تعلقات تھے اور اُن کے ساتھ نجی نشستوں میں شرکت کی سعادت میرے حصہ میں بھی آئی تھی۔ بعض نشستیں تو صرف گفتگو پر مبنی ہوتیں اور جناب جگر اپنے دوسرے اکابر شعراء اور اہل علم کے ساتھ اپنی ملاقاتوں کا ذکر فرماتے۔ کبھی صالحین اور اہل اللہ کا ذکر چھڑ جاتا۔ جناب اصغر گونڈوی کا تذکرہ بہت عقیدت سے فرماتے اور کبھی کبھی اپنے میزبانوں کے اصرار پر غزل سے بھی سرفراز فرماتے، کبھی ترنم اور کبھی تحت اللفظ۔ ترنم میں ایک خاص کیفیت و مستی جھلکتی تھی جو ساری محفل پر چھا جاتی اور مدتوں اس کا نشہ باقی رہتا۔ کبھی کبھی وہ اپنی منقش ڈبیا سے پان نکال کر شوق فرماتے۔ ایک مرتبہ انہوں نے مجھے حکم دیا کہ شیروانی کی جیب سے ڈبیا لے آؤں چنانچہ میں نے حکم کی تعمیل میں ڈبیا لا کر پیش کر دی فرمایا ''آدھا کام کیا بٹوہ کہاں ہے۔'' میں دوڑ کر گیا اور دوسری جیب سے بٹوہ لا کر پیش خدمت کیا۔ اور متبسم شاباشی حاصل کی۔ بات نکلی تھی الاقرباء کی اور جا پہنچی جناب جگر تک۔ چلیئے ایک قیامت کا دوسری قیامت سے سلسلہ قائم ہوا۔ عاقل صاحب! بحیثیت مدیر ''نگار''۔ یادش بخیر، مجھے یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ اچھا معیاری اور صحت مند ادب پر مشتمل جریدہ نکالنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں اور یہ بھی تجربہ ہے کہ قطرہ پر گہر ہونے تک کیا گذرتی ہے اور تین مدیر میں ایک جریدہ کو تر لانے تک کتنا لہو صرف ہوتا ہے۔ میں آپ کو، آپ کے معاونین کو اور آپ کی محفل کے قلمکاروں کو تہہ دل سے ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں اور الاقرباء کے بتدریج ارتقائی منازل طے کرنے پر اپنی عقیدت کا اظہار کرتا ہوں۔ اللہ آپ کو نظر بد سے محفوظ رکھے اور اس مبارک اور خوش آیند سفر پر آپ کا حامی و ناصر ہو۔ آمین۔ الاقرباء اپنے دامن میں کس قدر تنوع رکھتا ہے اور اس کی صفحات پر مختلف اصناف ادب کی دھنک جھلکتی ہوئی پاتا ہوں جس کا اعتراف قارئین اور اہل قلم کے مراسلات سے بخوبی ہوتا ہے۔ میری طرف سے مکرر

مبارکباد قبول کیجئے۔ دعا کیجئے اور دعا میں یاد رکھیئے۔ ''خدا جنوں کا ترے سلسلہ دراز کرے''

جمیل یوسف۔ مری

الاقرباء کا شمارہ جولائی۔ ستمبر ۲۰۰۸ء نظر نواز ہوا۔ اس موقر جریدے کا ہر ٹائٹل خوش نما اور دیدہ زیب ہوتا ہے مگر زیر نظر شمارے کا سرورق اچھے خوبصورت رنگوں اور گلدستہ نما قلمدان کے ساتھ اپنی مثال آپ ہے۔ ''کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست''

پھر اب کے سرورق پر آپ نے جس نئے جملے کا اضافہ کیا ہے۔ ''اردو ادب میں عالمی معیار کا تحقیقی و تخلیقی مجلہ'' یہ جملہ بلا مبالغہ علمی و ادبی مجلے کی پہچان ہے۔ گذشتہ شمارے سے پتہ چلا تھا کہ امریکہ کی سب سے زیادہ موقر جامعہ ''ہارورڈ یونیورسٹی'' کے نصابی پیکیج میں ''الاقرباء'' کی متعدد نگارشات شامل ہو چکی ہیں اور یہ مجلہ نمایاں جرائد کی بین الاقوامی ڈائریکٹری کی فہرست میں جگہ پاچکا ہے۔ یونیورسٹی کے متعلقہ شعبے نے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ ارتقا پذیر ادبی رجحانات اور معاصر ادب کے مطالعے اور تحقیق کے لئے الاقرباء بہترین ماخذ میں سے ایک ہے۔ آپ کو بہت مبارک ہو، آپ کی شب و روز توجہ اور محنت نے اس جریدے کو اس مقام پر پہنچا دیا ہے کہ اردو ادبی رسائل و جرائد کی تاریخ میں اسے ایک کارنامہ قرار دیا جائے گا۔ اس سے قبل اردو ادب کی تاریخ میں اس طرح کا بین الاقوامی اعزاز کسی جریدے کے حصے میں نہیں آیا۔ اگرچہ اپنی جگہ نگار، مخزن، ہمایوں، ادبی دنیا، نقوش، اوراق اور فنون کم مقام و مرتبہ کے مجلے نہ تھے مگر ان کی گونج اس طرح عالمی سطح پر سنائی نہ دی، بہر حال آں قدح بشکست و آں ساقی نماند، اس وقت تو الاقرباء ہی ایک ایسا علمی و ادبی مجلہ ہے جس پر ہم فخر کر سکتے ہیں۔ آپ کے لئے یہی دعا کی جاسکتی ہے کہ اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے۔ ''نظام تعلیم کے تہذیبی اور ثقافتی مضمرات'' کے زیر عنوان آپ کا چشم کشا اور خیال انگیز اداریہ وطن عزیز کے ارباب بست و کشاد کے لئے راہ نما کی حیثیت رکھتا ہے۔ حضرت اکبر الہ آبادی نے فرمایا تھا۔ ''دل بدل جائیں گے۔ تعلیم بدل جانے سے'' اور ان کا یہ مشہور شعر:

افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی　　　یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا

دورِ حاضر میں حکمت و دانش کے یہ اقوال صداقت سے زیادہ بھرپور لگتے ہیں۔ ہمارے نصاب تعلیم اور جدید تعلیمی اداروں نے ہمارے قومی اور تہذیبی تشخص کو جس طرح مجروح بلکہ مسخ کیا ہے۔ اس کا جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا　　کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

الاقرباء کے اداریے، الاقرباء کی ایک اور نمایاں امتیازی خصوصیت ہیں۔ میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ قومی اہمیت کے یہ شذرے الاقرباء سے پہلے کسی ادبی جریدے میں نظر نہیں آئے۔ آپ نے بڑا اچھا کیا جو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی علمی و ادبی خدمات پر ڈاکٹر محمد معزالدین کا مضمون شائع کیا۔ مولانا کو میں بنیادی طور پر ایک بڑا ادیب سمجھتا ہوں۔ ان کے بے حل اور پر اثر اسلوب تحریر نے جس بڑی تعداد میں اپنے قارئین کی ماہیت قلب کی ہے اس کی مثال ڈھونڈنی مشکل ہے۔ مولانا کے بہت سے قارئین کا کہنا ہے کہ ان کی فلاں کتاب پڑھنے کے بعد وہ نہیں رہے جو کتاب پڑھنے سے پہلے تھے۔ یہ مولانا کے خامۂ معجز رقم کا کمال ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر شاہد اقبال کامران نے علامہ اقبال کے خطبہ علی گڑھ ۱۹۱۰ء "ملت اسلامیہ ایک عمرانی مطالعہ" کے زیر عنوان ایک نہایت قابل قدر علمی تحریر پیش کی ہے۔ یہ اس شمارے کا سب سے اہم مقالہ ہے۔ نقد و نظر کے باب میں سید مشکور حسین یاد کے تازہ مجموعہ کلام "عرض داشت" پر تبصرہ کرتے ہوئے آپ نے سلانے، جاگنے، کلانے لگانے جیسے قافیے گھڑنے پر ان کو محض "عصری سطحیت کا شکار" کہہ کر ان سے خاصی رعایت برتی ہے کافی عرصے سے سید مشکور حسین یاد کی کیفیت غزل کے حوالے سے وہی ہے جس کا اظہار غالب نے اپنے شعر میں کیا ہے۔

ہم سے کھل جاؤ بوقت مے پرستی ایک دن　　ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

ناصر شمسی۔ اقبال اکیڈمی منرو، نیو جرسی (امریکہ)

سہ ماہی مجلہ ''الاقرباء'' جولائی۔ستمبر ۲۰۰۸ء موصول ہوا۔ گذشتہ شماروں کی طرح معیاری ہے اور جواہر تحقیق وتخلیق کا امین بھی نظم ونثر کی گوناگوں رعنائیوں سے مرصع قوس قزح کے حسین رنگوں سے مربوط یہ شاہکار آپ اور آپ کے ساتھیوں کی عرق ریزی، محنت اور خلوص کا آئینہ دار ہے جو قابل تحسین ہے۔ اندھیری شب ہے یہ چراغ جلائے رکھیے، نہ جانے کتنے گم کردہ راہ منزل کی طرف لوٹ آئیں۔

آپ کا اداریہ ''نظام تعلیم کے تہذیبی وثقافتی مضمرات'' وطن عزیز میں تعلیمی نظام کی بدحالی وپژمردگی اور ارباب اقتدار کی بے حسی وبےتوجہی کی نشاندہی کرتا ہے۔ آپ نے بجا فرمایا ہے کہ نظام تعلیم کی جامعیت ہی افراد کی صلاحیتوں کو نشوونما اور متوازن ارتقاء کی سمت مہیا کرتی ہے۔ قومی تاریخ کے خدوخال سنوارتی ہے بلکہ تہذیبی وثقافتی ورثے کو بھی تحفظ فراہم کرتی ہے۔ اس شمارے میں ڈاکٹر شاہد اقبال کامران نے علامہ اقبال مرحوم کے خطبہ علی گڑھ ۱۹۱۰ء کا جو اردو ترجمہ پیش کیا۔ اس میں علامہ مرحوم نے تشکیل وتعمیر ملت اسلامیہ کے عظیم مقصد کے حصول کے لئے آخر میں دو نکات پر مسلمانوں کی توجہ دلائی ہے۔ ''تعلیم اور عوام کی مجموعی حالت میں بہتری'' اور پھر پوچھتے ہیں ''ہم نے کس قسم کے (تعلیم یافتہ) آدمی تیار کیے ہیں؟ کیا ان کی قابلیت کا معیار ایسا ہے کہ وہ اپنے طریقے سے تشکیل شدہ قوم کی زندگی کے (عمرانی) تسلسل کی حفاظت کر سکتے ہوں جیسا کہ ہماری خود اپنی قوم ہے''۔ علامہ کے نزدیک صحیح نظام تعلیم کا ہدف ''نسل درنسل حاصل ہونے والے مشترکہ تجربات کے متواتر انتقال کے تسلسل کی حفاظت ہے۔'' مسلمان طالب علم مغربی ادبیات اور جدید تصورات و نظریات کی ترقی سے استفادہ ضرور کرتے لیکن اپنے مبادیات، اپنے اخلاقی وعمرانی نظریات وتمدن سے پیوستہ رہ کر ارتقاء کی منازل طے کرتے اگر ایسا نہ ہوا تو علامہ فرماتے ہیں ''تو پھر وہ اسلامی روح جو اسلامی تمدن کے چند ایک نمائندوں میں ابھی باقی ہے، ہماری قومی زندگی میں سے بالکل ہی غائب ہو جائے گی۔''

پروفیسر شاہد کامران نے علامہ اقبالؒ کے اس عظیم خطبہ کا آسان اور سہل ترجمہ کرکے بہت

بڑا کام کیا ہے۔ اللہ اُن کو سلامت رکھے اور وہ فکرِ اقبال کو فروغ دیتے رہیں۔ جناب سید رفیق عزیزی، پروفیسر ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر افضل مرزا کیا گئے۔۔۔ گویا علم وفضل کے تین بلند و بالا روشن اور منور مینار بیک وقت بجھ گئے۔ اللہ ان پیارے جانے والوں کی مغفرت فرمائے۔ متعدد مضامین اور منظوم کلام کے ذریعہ آپ نے مرحومین کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ ذاتِ الٰہی اس کا آپ کو اجر دے۔ نعیم فاطمہ علوی کا افسانہ پسند آیا۔ بہت اچھی اور بڑی باتیں کہہ گئیں ہیں ماں جی کے ہاں تقویٰ اور علم وعقل فوقیت کا معیار ہے۔ اور وہ بجا طور پر جانتی ہیں کہ ''جس طرح بچوں کو معتبر مہمان سمجھا جائے اسی طرح بزرگوں کو بھی معتبر مہمان تصور کیا جائے۔ ان کے لاغر جسم کو بوجھ تصور نہ کیا جائے آگے جا کر انہوں نے راہِ سلوک کے متلاشی مسافروں کو ایک بنیادی اور کلیدی اصول کا پتہ دیا ہے۔ یعنی ''جب انسان اپنے آپ سے آشنائی پیدا کر لیتا ہے تو خدا کے بہت قریب ہو جاتا ہے۔''

بے شک خود آگہی خداشناسی کا ذریعہ ہے۔ حضرت علیؑ کا قول ہے (جو رسالت مآبؐ سے منسوب ہے) کہ جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا''۔ نیلم احمد بشیر نے ''نہ کسی کی آنکھ کا نور'' میں معاشرے کی دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھا ہے۔ نہ جانے کتنے معصوم بچے شمس الرحمٰن کی طرح جسمانی یا ذہنی عارضے کے شکار ہیں جن کی تربیت اور دیکھ بھال کا وطن عزیز میں کوئی انتظام نہیں۔ ایک وقت تھا، جب لوگ ذہنی طور پر معذور بچوں کے پیدا ہوتے ہی کچھ دیر بعد شاہ دولے کے مزار پر بٹھا آتے تھے۔ ضرورت ہے اس امر کی کہ ملک کے ہر ضلع اور نظامت میں معذور بچوں کے لیے فلاحی اور تربیتی ادارے قائم کئے جائیں۔ یہ کام سرکاری اور پرائیویٹ دونوں جانب سے ہونا چاہیے، دولت مندوں اور صنعت کاروں کو چاہیے کہ وہ ایسے فلاحی اور تربیتی اداروں کی معاونت اور سرپرستی کر کے اس دنیا میں نیک نام ہوں اور آخرت میں بھی۔

ہمیشہ کی طرح یہ شمارہ بھی حمد ونعت کے تقدس اور حسن نظم سے آراستہ ہے۔ عاصی کرنالی کی نعت:

جس میں تیرا رنگ ہو شام سے بڑھ کر وہ صبح   جس میں تیرا نور ہو صبح سے بڑھ کر وہ شام

بہت پسند آئی۔ جناب عبدالعزیز خالد کا کلام یگانہ اور منفرد ہے وہ قاری کو اپنے ساتھ فلک

پیمائی پر آمادہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور بسا اوقات انسان اپنے آپ کو محو پرواز محسوس کرتا ہے۔
وہ لسانیات کے مخزن اور الفاظ کی کان ہیں، اردو، فارسی، عربی یا عبرانی اور سا ہی ہر زبان کے الفاظ
ان کے نوک قلم پر رقص کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ میں نے ان کا کلام پہلی بار ۱۹۶۲ء میں انکم
ٹیکس سروس کے سہ ماہی میگزین میں پڑھا اور بے حد متاثر ہوا۔ میں اور میرے ساتھی بطور انکم ٹیکس
آفیسر ڈائریکٹوریٹ آف ٹریننگ کراچی میں تھے۔ جناب عبدالعزیز خالد اس زمانے میں اسسٹنٹ
انکم ٹیکس کراچی تھے۔ ان کے کلام میں رفعت فکر، وسعت الفاظ اور حسن بیاں جو آج آپ دیکھتے ہیں
وہ اُس وقت بھی ایسا ہی تھا۔ اویس جعفری صاحب کا کلام ہمیشہ کی طرح اس شمارے میں بھی پھول
کھلاتے ہوئے ہے۔ اُن کا یہ شعر بہت پسند آیا۔

پھول اویس ملے غیروں سے   پیاروں نے پتھر برسائے

دیگر شعرائے کرام کے منتخب اشعار درج ذیل ہیں:

بشیر بہ فیض خرد مشتری پہ جا پہنچا   مگر خطیب حرم محو اعتکاف رہا

(ڈاکٹر شیال امروہوی)

دنیا نے کیا سلوک کیا اہل دل کے ساتھ   آؤ ذرا مآل وفا دیکھتے چلو

(محشر زیدی)

ڈاکٹر عاصی کرنالی کی نظم کے آخری شعر کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں۔

میں محبت ہوں مجھے آتا ہے نفرت کا علاج   تم ہر اک شخص کے سینے میں مرا دل رکھ دو

خالد یوسف۔ آکسفورڈ (برطانیہ)

جولائی۔ ستمبر کا الاقرباء بہشت نظر ہوا۔ دلکش معلوماتی اور معیاری نگارشات سے حسب
معمول مزین ہے۔ اور ''نظام تعلیم کے تہذیبی و ثقافتی مضمرات'' پر اداریہ برمحل اور بصیرت افروز

ہے۔ دراصل ہمیں پورے ملک میں تین مختلف نظام ہائے تعلیم کے بجائے، ایک ایسے یکساں نظام تعلیم کی ضرورت ہے جو ہماری ترقی وخوشحالی کا ضامن اور قومی امنگوں کا آئینہ دار ہو۔

سید رفیق عزیزی کے سانحۂ وفات کا سن کر بہت افسوس ہوا۔ میری ان سے ایک بار ۱۹۶۰ء میں حیدر آباد (سندھ) میں ملاقات ہوئی تھی جب میں یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔ عمدہ فنکار اور اعلیٰ انسانی اقدار کے حامل تھے۔ خدا مرحوم کی مغفرت فرمائے۔ سید انتخاب علی کمال نے ان کے فن اور شخصیت پر عمدہ روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کا مضمون ''صہبا اختر اور احباب'' بھی بہت خوب ہے۔ صہبا اختر میرے بڑے بھائی کے دوست تھے اور میری بھی ان سے شناسائی تھی۔ ڈاکٹر عاصی کرنالی کا مضمون ''اردو شاعرات میں حمد ونعت گوئی کی روایت'' ایک بیحد معلوماتی تحریر ہے۔ ڈاکٹر شاہد اقبال کامران نے ''ملت اسلامیہ، ایک عمرانی مطالعہ'' لکھ کر اور خطبۂ علی گڑھ کا ترجمہ پیش کر کے ہمیں اقبال کے افکار کی کئی پوشیدہ جہتوں سے روشناس کرایا ہے۔ ڈاکٹر عاصی کرنالی کا انشائیہ مضمون ''دکن سے دلی تک، غزل کی سفر کہانی'' ایک دلچسپ تحریر ہے۔ نوید ظفر کے تاریخی سلسلے کا مضمون ''سرگودھا'' پڑھ کر میرے بچپن کی یادیں تازہ ہو گئیں کہ پاکستان فضائیہ پبلک اسکول میں، میں نے بھی عمر عزیز کے تین سال وہاں زیر تعلیم گزارے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے مضمون میں ''راجدھانی'' بمعنی ''سلطنت'' استعمال کیا ہے جو درست نہیں کہ یہ ہندی لفظ دارالحکومت کے مترادف ہے۔

میں پروفیسر کلیل اختر کا بیحد ممنون ہوں کہ انہوں نے اپنے مکتوب میں میرے کلام کو سراہ کر میری ہمت افزائی فرمائی۔ خلیم احمد بشیر کا افسانہ ''نہ کسی کی آنکھ کا نور'' ۔۔۔ بیحد کرب آمیز اور سبق آموز ہے اور مغرب کی چکا چوند سے مرعوب تمام اہل ہند و پاک کی آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہے۔ خواجہ مشتاق حسین کی کتاب ''شعروں کے انتخاب'' پر آپ کا تبصرہ عمدہ ہے۔ جن اشعار پر انہوں نے نامعلوم لکھا ہے ان میں ایک کے خالق ڈاکٹر تاثیر ہیں (داور حشر مرا نامۂ اعمال نہ دیکھ۔۔۔) اور دوسرے کے پروفیسر اختر انصاری (یاد ماضی عذاب ہے یارب۔۔۔) پروفیسر اویس جعفری کی نظم ''الیکٹرونک میل'' سید محمد حسن زیدی کی نظم ''تیشۂ بے رحم'' دل آویز ہیں۔

غزلیات میں مندرجہ ذیل اشعار خصوصیت سے لائق ستائش ہیں۔

دوستو ظلمتِ شب کا تمہیں اندازہ نہیں　　جتنی شمعیں ہوں میسر سرِ محفل رکھ دو

(عاصی کرنالی)

آخری آس نے بھی توڑ دیا دم آخر　　رہ گیا بجھ کے چراغ شب تنہائی بھی

(مضطر اکبرآبادی)

بشر بہ فیضِ خرد مشتری پہ جا پہنچا　　مگر خطیب حرم کو اعتکاف ملا

(خیال امروہی)

پروفیسر جمیل احمد۔ صدر شعبۂ اردو یونیورسٹی آف واشنگٹن سیاٹل (امریکہ)

: الاقرباء کے پچھلے ایک سال کے شمارے نظر سے گذرے۔ آپ کی عنایتوں کا بہت بہت شکریہ۔ یہ پہلا اتفاق ہے کہ پاکستان سے کوئی ادبی سوغات آئی اور خواہش ہوئی کہ آپ کو تشکر و تاثر کا ایک خط لکھوں لیکن مصروفیت آڑے آجاتی۔ اسی پس و پیش میں اگلا شمارہ آجاتا تھا اور دیکھتے دیکھتے ایک سال گذر گیا۔ اس کوتاہی و تاخیر کے لیے شرمندہ اور معذرت کا طلبگار ہوں۔

اس ایک سال کی مدت میں سب سے زیادہ متاثر کرنے والی چیز ہے رسالے کے معیار اور اس کی زینت میں بتدریج ارتقا! اس کے لیے آپ اور الاقربا کا پورا عملہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ غالباً اسی دوران الاقربا نے اپنے پچھلے شمارے ۲۰۰۱ء کے بعد سے لے کر تازہ ترین شمارے تک آن لائن بھی مہیا کر دیے ہیں۔ یہ کار نیک وجدید اس معیاری ادبی رسالے کے لئے خوش آئند مستقبل کی ضمانت و بشارت ہے۔ یہ قابلِ ستائش عمل اردو زبان و ادب کے لیے ایک قابلِ تقلید چیز دیگر اردو رسالوں کے لیے ایک مثال ہے۔ شائقین اردو اور خصوصاً طلباء کے لئے یہ نہایت مفید ہے کہ ان کو مطلوبہ مضامین ہر وقت اور ہر جگہ دستیاب ہوسکتے ہیں۔

الاقربا کے اداریے سب سے پہلے متوجہ کرتے ہیں ان کے خیالات بلند، موضوعات برمحل اور زبان معیاری ہوتی ہے۔ رسالے کے تحقیقی مضامین میں حواشی اور حوالے دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے

کہ الاقربا نے تحقیق وتنقید کے معیار کو بنائے رکھا ہے۔ دیگر رسالوں میں شائع ہونے والے بیشتر مضامین اس بنیادی معیار بندی سے عاری ہیں۔ ایک گذارش یہ کہ الاقربا میں شامل مضامین نگار کے متعلق اگر کچھ تعارفی جملے بھی شائع ہو جایا کریں تو کیا ہی اچھا ہو۔ کبھی کبھی اس کے لئے اور دور کی خاک چھاننا پڑتی ہے۔ اپریل تا جون کے شمارے میں ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد کا مضمون ''علم عروض: تفہیم و تجزیہ قابل ستائش ہے۔ سالنامہ ۲۰۰۸ء میں شامل مضمون ''محاورے کا لسانیاتی مطالعہ'' بھی بہت معلوماتی ہے۔ اسی سالنامے میں شامل اقبالیات کا گوشہ قابل تعریف ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر نسیم ہاشمی، ڈاکٹر محمد معز الدین، پروفیسر فتح محمد ملک، ڈاکٹر حقانی القاسمی، محمود اختر سعید وغیرہ کے مضامین قابل تحسین ہیں۔

مضامین کے علاوہ رسالے میں شائع ہونے والے افسانے، خاکے اور رپورتاژ دلچسپ اور معلوماتی ہوتے ہیں۔ دوسری زبانوں سے اردو میں مترجمہ افسانوں کو بھی الاقربا اپنے دامن میں جگہ دیتا ہے جو قابل ستائش ہے۔ اسی طرح دوسری علاقائی زبانوں کے ادب سے بھی اردو قاری کو متعارف کرایا جا سکتا ہے۔ الاقربا فاؤنڈیشن کی خبروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ادارہ کتنے نیک کاموں میں سرگرم عمل ہے۔ اگر ممکن ہو تو ایک ایسا ہی خبرنامہ اردو ادب کی سرگرمیوں کے متعلق شائع ہو جایا کرے تو بہت لوگوں تک رسالے کے توسط سے خبریں پہنچ جایا کریں گی۔ اردو کتابوں پر تبصرہ کا گوشہ معلوماتی ہے۔ رسالے میں غزلوں اور نظموں کے ساتھ ساتھ رباعی، حمد، نعت اور قطعات کو بھی جگہ دی جاتی ہے، جو شعری گوشے کو بہت متنوع، دلچسپ بناتے ہیں اور سنجیدگی بھی عطا کرتے ہیں۔ ادلیس جعفری صاحب کی سالنامے جنوری۔ مارچ ۲۰۰۸ میں ص ۲۴۰ پر شائع ہونے والی ایک غزل اعجاز ہے، تخلیقی اور کیفیاتی دونوں اعتبار سے اس غزل کا ہر شعر اپنے آپ میں منفرد ہے۔ یہ اشعار دنیائے غزل کے استعاروں کے خوبصورت موتیوں کے ہار ہیں۔

اکبر حیدر آبادی۔ آکسفورڈ (برطانیہ)

الاقرباء کا جولائی تا ستمبر کا شمارہ موجۂ بہاراں کی طرح نمودار ہوا۔ اداریہ میں آپ نے

ایک نہایت اہم عصری موضوع پر سیر حاصل روشنی ڈال کر مروجہ نظام تعلیم کے مثبت و منفی پہلوؤں کو بڑی خوبی سے اجاگر کیا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالی کی تحقیقی کاوش قابلِ صد ستائش ہے کہ انہوں نے اردو کی اتنی بہت سی نعت گو شاعرات کو گوشۂ گمنامی سے ڈھونڈ نکالا اور ہمیں اُن کی خوبصورت تخلیقات سے لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کیا.....ملت اسلامیہ ایک عمرانی مطالعہ کے تحت پروفیسر ڈاکٹر شاہد اقبال کامران نے ایک فکر افروز مقالہ تحریر کیا.....ڈاکٹر محمد معز الدین نے مولانا مودودی جیسی فخر روزگار شخصیت کے اوصافِ عالیہ کی نشان دہی کر کے خودی عملی صالح اور کارنیک کے محرکین میں شریک ہو گئے.....ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد نے تکنیک کی پیچیدہ معنوی جہتوں کو مختلف فکری اقتباسات کے ذریعہ عام فہم بنا کر پیش کرنے کی احسن کوشش کی ہے۔ ...گوشۂ رفتگاں میں سید رفیق عزیزی کے تعلق سے صاحبانِ علم کے دقیع اور برجستہ افکار و تاثرات مطالعہ نواز ہیں ...حصہ منظومات ہمیشہ کی طرح معیاری ہے۔

عبد السلام المکی۔ نگارڈ اور یگن (امریکہ)

تازہ شمارہ ملا، نوازش۔ اس عزت افزائی کے لئے آپ کا ممنون ہوں۔ اظہار تشکر میں اس لئے تاخیر ہوئی کہ میں ابھی 'الاقرباء' کے مطالعہ سے فارغ نہیں ہو پاتا کہ یہ میری میز سے غائب ہو کر نئے ہاتھوں میں چلا جاتا ہے۔ اور بالآخر زود یا بدیر واپس مل جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں کبھی مختصراً اور کبھی طویل وقفوں کے بعد اس کی قرأت سے مستفید ہوتا ہوں۔ جگر سوزی کے مظہر آپ کے اداریے کرب آگہی کو دوآتشہ کر دیتے ہیں مگر آپ جس گرو دیدہ وراں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُن کی لغت لفظ ''مایوسی'' سے عاری ہے۔ اور آپ ہی جیسے اہلِ قلم کی مثبت فکر یاد دہانی اور تحریر و تقریر ہی چارہ گری کا کام کر سکتی ہے اور کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ پاکستان کے باشعور اور باضمیر صحافیوں اور اہل قلم حضرات کو قائم و دائم رکھے۔ اس لیے کہ یہی جمہوریت کا ایک عظیم اور معتبر ستون ہیں۔ آمین

نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے　　　اُمیدِ مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں

مولانا مودودی پر جناب ڈاکٹر صفدر الدین کا مقالہ میری ہی نہیں اکثر مسلمانوں کی ترجمانی کرتا ہے۔ آپ معارف القرآن کو پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ کسی جید فقیہہ کی محفل میں شریک ہیں، تدبر القرآن کا مطالعہ کیجئے تو ایک ماہر لسانیات کو اپنا مخاطب پاتے ہیں لیکن جب آپ تفہیم القرآن سے رجوع کرتے ہیں تو آپ اس کے مفسر کو اپنی سطح پر پاتے ہیں اور آپ کے ذہن کو کسی بلند سطح تک رسائی کے لیے تگ و دو نہیں کرنی پڑتی اور نہ اپنی علمی تنگ دامانی کا احساس ہوتا ہے۔ اللہ ان سب مفسرین کی قبروں کو نور سے منور فرمائے۔ مولانا مودودیؒ ایک عام قاری کی ذہنی استعداد سے باخبر ہیں اور اُس سے اُسی کی سادہ اور بے تکلف زبان میں گفتگو فرماتے ہیں اور اپنے مخاطب کی توجہ کو گرفتار کرتے اور اس کے دل پر گہرے نقوش چھوڑتے ہیں۔ مرحوم کی سلاست زبان، شفاف فکر اور تفہیمی صلاحیت کے حامل عالمی سطح پر بھی ملنا مشکل ہیں۔

حالیہ شمارہ میں حمد و نعت کا انتخاب بطور خاص اس ماہ رمضان میں لطف دے گیا۔ یہ خط آپ کو عید کے بعد ملے گا، میری اور یہاں کے قارئین الاقربا کی جانب سے عید کی مبارکباد قبول فرمایئے۔ میں نے تفسیر کے ضمن میں لسانیات کا حوالہ دیا ہے۔ میں جناب عبدالعزیز خالد صاحب کی شعری تحریریں پڑھتا رہا ہوں اور حیران ہوں کہ یہ الفاظ کی ایک بے انتہا گہری کان ہیں کہ نت نئے الفاظ پڑھنے میں آتے ہیں اور چونکہ وہ مختلف زبانوں کے ہیں اس لیے فیروز اللغات میں بھی خال خال ہی نظر آتے ہیں۔

نوید ظفر صاحب کی نظم ''غارِ ثور کے باہر'' نے ماضی کے اُس دور میں پہنچا دیا جب مجھے حاضری کی سعادت میسر آئی تھی۔ اُن کبوتروں کو رشک کی نگاہ سے دیکھتا ہوں جو ویزا یا پاسپورٹ اور زادِ راہ کے تکلفات سے آزاد مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی آزاد فضاؤں میں پر آں پاکیزہ ماحول میں سانس لیتے اور اپنی آنکھوں کو روح پرور مناظر سے سیراب کرتے رہتے ہیں۔ طنز و مزاح کے پیرایہ میں ''غزل کی سفر کی کہانی'' مسکراہٹیں لٹاتی نظر آتی ہے۔ اس صنفِ ادب کا مضمون الاقربا جیسے سنجیدہ رسالہ کے لیے بہت خوش آیند ہے۔ اس سے قبل ''دلی کا آخری مشاعرہ'' بھی بہت ہی خوب تھا۔

''نقد و نظر'' کے توسط سے نئی مطبوعات میں جھانکنے کا موقع میسر آتا ہے اور نئی تصانیف

سے آگہی حاصل ہوتی ہے۔

محشر زیدی۔ فیصل آباد

الاقرباء ملا پہلے سے زیادہ خوبصورت، ادبی سلیقے کی منہ بولتی تصویر محترم ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد کے مضمون نے شوق مطالعہ کے گرد سحر حصار قائم کر دیا۔ حقیقتاً یہ لوگ گلشنِ ادب کی آبیاری کر رہے ہیں۔ ایک ایک نقطہ ٹھہر ٹھہر کر سمجھ کر پڑھنے کی چیز ہے۔ جی خوش ہوا اور میرے ادبی سرمائے میں ایک گراں قدر اضافہ۔ تبصرۂ کتب کا سیکشن مطالعہ کیا مشکور حسین یاد کے کلام کی زیارت بھی آپ کی وساطت سے ہوئی۔ اتنا کہنے کی جسارت ضرور کروں گا کہ بعض شعر ''سکوتِ سخن شناس'' کا تقاضہ کرتے بھی نظر آئے۔ ایک شعر نقل کرتا ہوں۔

شام و سحر کے جوشِ نمو میں اُتر گیا   میں مسکرا کے اپنے لہو میں اتر گیا

خواجہ مشتاق حسین کے شعری انتخاب کو دیکھا صفحہ ۲۱۱ پر آپکا تبصرہ کہ مرتب صرف صاحب ذوق ہی نہیں صاحب مطالعہ بھی ہیں۔ اور اس سے دو سطر اوپر غالب سے موسومہ شعر جو درست لکھا بھی نہیں گیا۔ شعر یوں ہے:☆

کوئی پردہ نشین سرگرم غسل ناز ہے شاید   کہ چلمن ڈالدی ہے آسماں نے ابر باراں کی

غالب کے دیوان میں کم و بیش اٹھارہ سو شعر، قطعات، قصائد، غزلیات ملا کر مکتب شیشے سے بھی جائزہ لیا تو یہ شعر کہیں نظر نہیں آیا۔ ۱۹۴۰ء میں جب میں ساتویں جماعت میں تھا۔ علم بیان و بدیع کی ایک مختصر کتاب میں یہ شعر میں نے پڑھا تھا۔ شاعر کا نام اتنی مدت گزرنے پر ذہن سے محو ہو

☆ صرف مصرعۂ ثانی میں لفظ ''چھوڑ دی'' یا ''ڈال دی'' پر اختلاف ہے۔ ہر چند لفظ ''ڈال دی'' ہی درست ہے لیکن اس سہو کی کے باعث مرتب کا ''صاحب مطالعہ'' ہونا محلِ نظر نہیں ٹھہرتا (ادارہ)

گیا۔ مگر وہ شاعر غالبؔ ہرگز نہیں تھا اگر صاحب مطالعہ ایسے ہوتے ہیں تو خوب ہیں۔ دوسرا شعر جس میں خواجہ صاحب کا قصور نہیں، وہ بھی غلط شاعر سے منسوب ہے اور یہ اہل لاہور کی کاریگری ہے۔ جنھیں یہ یقین ہے کہ ساغرؔ تخلص کا پہلا شاعر ساغر صدیقی ہی تھا۔ حالانکہ ساغر نظامی کی کتاب ''بادۂ مشرق'' کا دیباچہ مسز سروجنی نائیڈو نے تحریر کیا ہے کتاب کے آخری حصے میں ایک باب ''ساغرستان'' جس کے نیچے درج ہے ۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۳ء تک اسی باب کے صفحہ ۲۰۶ اور ۲۰۷ پر ساغرؔ نظامی کی یہ غزل درج ہے جس کا ایک شعر اور مطلع یوں ہے:

وشت میں قیس نہیں کوہ پہ فرہاد نہیں ہے وہی عشق کی دنیا مگر آباد نہیں
لاؤ اک سجدہ کروں عالمِ بدمستی میں لوگ کہتے ہیں کہ ساغر کو خدا یاد نہیں

''میرؔ کا یہ شعر غلط کمپوز ہو گیا ہے صفحہ ۲۱۱ دوسرا شعر ''کرامات ہوگی''۔ سند نہیں کہ جو میں کہوں وہ سب درست ہو لیکن یہ شعر ان دو حضرات میں سے کسی کا ہے، بشیر بدر کا ہرگز نہیں۔ ''اُجالے اپنی یادوں کے'' معین احسن جذبی یا اختر الایمان۔ صفحہ ۲۱۷ پر نیچے سے اوپر کی طرف پڑھیے۔ داورِ حشر مرا...... ڈاکٹر تاثیر کا مشہور شعر ہے۔ شیفتہؔ کا شعر بھی حرف بحرف درست نہیں لگا۔ مرتب کے صاحب مطالعہ ہونے کا ایک اور منظر بھی قابل دید ہے☆۔ فانیؔ بدایونی کی غزل کا مقطع پہلے اور مطلع بعد میں لکھنا ان کی نفاستِ طبع کا بھی مظہر ہے۔ میں جہاں بیٹھ کر خط لکھ رہا ہوں یہ ایسی جگہ ہے بقول شاعر

گلشن میں کہیں بوئے دمساز نہیں آتی اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی
(فناؔ بدایونی)

کسی سے کوئی بات پوچھ نہیں سکتا البتہ آپ کے اخلاقِ عالیہ کی داد نہ دینا زیادتی ہوگی لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔

☆ ہم سپاس گزار ہیں کہ فاضل مراسلہ نگار نے پوری دقتِ نظر سے متعلقہ تحریر کا مطالعہ فرمایا اور تسامحات کی نشان دہی فرمائی تاہم محدود تفاوت کی مثالوں سے قطعِ نظر مرتب کا ''صاحب مطالعہ'' ہونا ناقابلِ انکار ہے ورنہ شعرائے قدیم و جدید کے سیکڑوں اشعار کو معرضِ تحریر میں لانا ہرگز ممکن نہ ہوتا (ادارہ)

عبدالقادر حکیم ۔ بیلا یو، واشنگٹن (امریکہ)

الاقربا کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ شکریہ! بے حد خوشی ہوئی۔ میں مجلّہ کے اداریوں کا اس لئے معترف ہوں کہ وہ انتہائی اہم موضوعات پر جامع، وزنی، جاذب توجہ اور شعور کو جھنجھوڑنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور میں انہیں علمی اصلاحی تحریک کی ایک نمایاں کڑی تصور کرتا ہوں۔ آپ بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ میں دعا گو ہوں کہ ذمہ دار طبقہ آپ کے اداریوں کی روشنی میں ایک ایسا لائحہ عمل ترتیب دے جس پر کامزن ہو کر زبان، تعلیم اور ثقافت کو وہ مقام عطا کر سکے جو ملک و قوم کی ترقی اور تشخص کے لئے لازمی ہے۔

الاقربا اپنے دامن میں ایسے پر مغز مقالے، انشائیے اور مضامین رکھتا ہے کہ ہر تحریر علم میں اضافہ کا موجب ہوتی ہے۔ اس کے صفحات پر چاندنی چھٹک رہی ہے، خوشی کی بات ہے کہ اس میں دیار مغرب کے اہل قلم کی روشنی بھی شامل ہے جن کی ہجرت کا ایک مثبت پہلو اس شعر نے واضح کیا ہے۔

انتشار اہل معنی فیض سے خالی نہیں ۔۔۔ بوئے گل پھیلی کہ جب غنچہ پریشاں ہو گیا

اس شمارہ سے ڈاکٹر افضل مرزا کی رحلت کا بھی علم ہوا۔ مرحوم ایک اچھے اہل قلم تھے۔ یاس یگانہ چنگیزی اور سیف الدین سیفؔ پر بھی ان کے مضامین پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ہفتہ وار امریکی اخبار "پاکستان لنک" میں الاقرباء پر ان کا تبصرہ ممکن ہے آپ کی نظر سے گزرا ہو، بہت خوب تھا۔ عاقل صاحب! ہم لوگ جس نسل سے تعلق رکھتے ہیں وہ مغرب میں اس طرح رہتے ہیں کہ مشرق اپنے دلوں میں آباد رکھتے ہیں، ہمیں اپنے بزرگوں جیسی وہ محفلیں میسر نہیں کہ حقّہ کے کش اور چائے کے دور چل رہے ہیں اور فارسی، اردو شعر و ادب پر گفتگو ہو رہی ہے، مگر جب بھی معروفیت مہلت دیتی ہے ایک بیٹھک سجا لیتے ہیں۔ بھلا ہو سیاٹل کے منظور جونیجو صاحب کا اور مظہر الحق خسرو جیسے ہم خیال و پاکیزہ ذوق رکھنے والے چند دوستوں کا کہ جب بیٹھتے ہیں تو الاقربا ہی گفتگو کا محور ہوتا ہے۔ اور اس کے مضامین اور نثر و نظم پر گفتگو ہوتی ہے۔ خدا اس دلچسپی کو برقرار رکھے اور علم و ادب سے تعلق استوار رہے۔

محمود رحیم ۔ اسلام آباد

الاقرباء کا شمارہ برائے جولائی ۔ ستمبر ۲۰۰۸ء موصول ہوا۔ اس دفعہ کا اداریہ "نظام تعلیم کے تہذیبی و ثقافتی مضمرات" نہایت قابلِ توجہ ہے، خصوصاً موجودہ نظام تعلیم کے حوالے سے کہ جس کے نتائج نے ہمیں ۶۱ سال میں ثمر مند کرنے کی بجائے مزید لاچار و غریب کر دیا ہے۔

"نقد و نظر" کے ضمن میں جناب مشکور حسین یاد کے شعری مجموعے "عرض داشت" پر آپ کے مدلل تبصرے نے نہ صرف مجموعے کے حسن کو اجاگر کیا ہے بلکہ اس کے قبح کی بھی نشاندہی کی ہے۔ شاعری میں جمالیات اور ابلاغ کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جمالیات کو پس پشت ڈالنے کے سبب شعر تخلیقی عمل سے زیادہ میکانکی عمل بن کے رہ جاتا ہے اور ابلاغ کی طرف توجہ نہ دینے کی صورت میں شاعری چیستان بننے لگتی ہے ادق ترکیب سازی، غیر مانوس الفاظ کی دانستہ بندش اور نئی لفظیات کی تشکیل میں جمالیات اور اس سے بھی زیادہ ابلاغ کو مدنظر رکھنے سے شعر میں تغزل مفقود ہونے لگتا ہے۔

شمارے میں شامل جناب مشکور حسین یاد کا انشائیہ "پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے...." انشائیے کی اعلیٰ مثال ہے۔ وہ نہایت معتبر اور ثقہ انشائیہ نگار ہیں اور انشائیے کے خدوخال واضح کرنے اور بہترین انشائیوں کی تخلیق میں ان کا قابلِ ذکر حصہ ہے۔ مذکورہ انشائیہ میں انہوں نے آدم، کائنات اور خالقِ کائنات کے درمیان جو ربط تلاش کیا ہے وہ قابلِ صد ستائش ہے۔ انشائیہ معلوم سے نامعلوم کی یافت کا عمل ہے۔ اور اس انشائیے میں یہ عمل بطریق احسن انجام دیا گیا ہے۔ جو لوگ انشائیہ کو محض مزاحیہ مضمون سمجھتے ہیں ان کے لئے انشائیے کی تفہیم کے لئے یہ تحریر درست سمت فراہم کرتی ہے۔

مسلم شمیم ۔ کراچی

جولائی ۔ ستمبر ۲۰۰۸ء الاقرباء زیرِ مطالعہ رہا اور اپنے روایتی محاسن سے خوش گوار تاثرات پیدا کئے۔ مضامین و مراسلات کا گوشہ خاص طور پر لائق توجہ رہا اور مطالعہ سے بہرہ مند ہوا۔ سبھی

مضامین و مقالات وقیع اور جامع ہیں اور ان کے لکھنے والوں کے تبحر علمی کے نمائندہ کہے جانے کے لائق ہیں۔ ''اردو شاعرات میں حمد و نعت گوئی کی روایت'' کے موضوع پر پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالی کا مضمون بہت پسند آیا، نظریاتی اختلاف کے باوجود ''سید ابو الاعلیٰ مودودی۔ ایک مجتہد الفکر سکالر اور محقق'' کے حوالے سے ڈاکٹر محمد معز الدین کا گراں قدر مقالہ کا نہ سراہنا میرے لئے ممکن نہیں۔ مولانا بے شک بیسویں صدی کے ایک نابغۂ اعظم تھے۔ میں نے تفہیم القرآن کا مطالعہ کیا ہے اور ان کے Genius کا معترف ہوں۔ تفہیم القرآن کی جلد اول کا مقدمہ اور دیباچہ میرے نزدیک بڑی گراں مایہ تحریر ہے اور ایسے مندرجات کی توقع ان جیسے عالم سے کی جا سکتی تھی۔ اس شعبہ کے دیگر مضامین جیسا کہ عرض کر چکا ہوں اپنے اپنے موضوع کے اعتبار سے بڑی قدر و قیمت کے حامل ہیں۔ گوشہ رفتگاں کا کیا کہنا گویا مرحوم رفیق عزیزی پر مکمل ایک گوشہ شائع کیا ہے۔ یہ آپ نے بڑا ہی کار خیر انجام دیا ہے۔ مرحوم رفیق عزیزی کے ساتھ صہبا اختر، ڈاکٹر ابو الخیر کشفی اور ڈاکٹر افضل مرزا کی یادیں تازہ ہو گئیں۔ ڈاکٹر ابو الخیر کشفی صاحب پر ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ کا مضمون بہت اچھا لگا۔ ''خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے'' جناب صابر عظیم آبادی کا کلام بلاغت نظام برابر الاقرباء میں چھپتا ہے۔ یہ بڑی اچھی بات ہے۔ صابر عظیم آبادی میرے جاننے والے ہیں۔ اور ان کے شعری مجموعہ میں میرا دیباچہ شامل ہے۔ وہ ایک پختہ کار تخلیق کار ہیں۔ بہر حال ان کی ایک رباعی مجھے معنوی اور فکری اعتبار سے بہت کھلی اور الاقرباء کی روایتی پالیسی میرے نزدیک محل نظر ٹھہری ☆۔ رباعی کے آخری دو مصرعے یہ ہیں:

اس دور کے انساں نے ترقی کر کے آزادیٔ نسواں کی ترقی سمجھا

☆ فاضل مراسلہ نگار اگر وضاحت فرما دیتے تو بہتر ہوتا کیونکہ قطع نظر کے اختلاف یا نظریاتی دوئی کو ہم ادبی مواد کی اشاعت میں سدِ راہ نہیں سمجھتے۔ (ادارہ)

سید حبیب اللہ بخاری ۔ بہاولپور (۱)

میں ۱۵ مئی کو عمرہ کی سعادت حاصل کرنے کی غرض سے سعودی عرب چلا گیا تھا۔ الحمدللہ یہ سفر ہر لحاظ سے بخیر و عافیت تکمیل پذیر ہوا اس دوران آپ کی روحانی رفاقت قائم رہی۔ مکہ مکرمہ میں بدوران طواف آپ کے لئے دعا گو رہا اور مدینہ منورہ میں حضورؐ کی خدمت میں صلوۃ و سلام کا نذرانہ پیش کیا۔ خدا تعالیٰ قبول فرمائے۔ ۱۹ جون کو گھر پہنچا۔ کچھ دنوں کے بعد آپ کا موقر مجلہ ''الاقرباء'' اپریل تا جون ۲۰۰۸ء موصول ہوا۔ گویا آپ کی جانب سے یہ ہدیہ تبریک تھا جس کے لیے شکر گزار ہوں۔

آپ کا تجزیاتی اداریہ پاکستان میں ''اردو ادبی تحقیق کا مستقبل'' نہایت جامع ہے اور تخلیقی عمل کو مزید موثر اور سود مند بنانے کی غرض سے آپ کی تجاویز ارباب بست و کشادگی خصوصی توجہ کی متقاضی ہیں۔ مضامین و مقالات کا حصہ ادب نواز اور صاحبان علم کی فکری و علمی جستجو و تحقیق سے مزین ہے۔ اس دور پُر آشوب میں یہ کاوشیں ''اہل جنوں'' کی صداقت عشق کا عملی ثبوت ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر سید محمد عارف نے اپنے مقالہ ''معرکہ جوش و شاہد'' میں دو عظیم علمی و ادبی شخصیتوں کے مابین ''چشمک'' کو بڑے پُر لطف انداز میں نمایاں کر کے ہمیں محظوظ ہونے کا موقع دیا ہے۔ خالد علیگ کی شاعری پر مسلم شمیم کا تبصرہ بہت پسند آیا۔ خالد علیگ کی غزل کا ایک شعر پیش ہے:

فقیر راہ گزر تھے کسی کو کیا دیتے	مگر یہی کہ وہ ملتا تو ہم دعا دیتے

انشائیہ، افسانہ، خاکہ کا حصہ بہت عمدہ نگارشات سے مزین ہے۔ تمام حضرات کی کاوشیں قابل تحسین ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالی کا انشائیہ بہر کیف ایک منفرد انداز کا مظہر ہے۔ حصہ نظم صاحبان علم و دانش کے خیال و فکر کو اجاگر کرتا ہے۔ شعراء و اُدبا کی تصنیفات پر آپ کا تبصرہ آپ کی ''مہارت مشاقگی'' کو نمایاں کرتا ہے۔ نعیم فاطمہ علوی کا تبصرہ بھی مکمل اور مدلل ہے۔

(۲)

۴ اگست کو ''الاقرباء'' کا شمارہ جولائی۔ ستمبر ۲۰۰۸ء موصول ہوا۔ ''نظام تعلیم کے تہذیبی اور

ثقافتی مضمرات'' کے عنوان پر آپ کا اداریہ بلاشبہ ان حقائق کا مظہر ہے جن کی وجہ سے ہماری نظریاتی اقدار متاثر ہوئی ہیں۔ فارسی اور عربی سے نابلد ہونے کی وجہ سے انشاء واملا میں اغلاط کا احساس رہا ہے اور نہ ہی مطالعہ کا شوق باقی رہا ہے۔ آپ نے بجا فرمایا کہ اردو ادب کا بھرم قائم ہے تو ان لوگوں کے دم سے جو اگرچہ چراغ سحری ہیں مگر اپنی نگارشات سے علمی وقار برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ آپ کا احساس آپ کے قلم کو جنبش دیتا ہے۔ کاش وہ ارباب اختیار میں وہ اضطراب پیدا کر دے جس کی کرب انگیز صورت حال آپ کو بے تاب کئے ہوئے ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالی کی جستجو سے اُن اردو شاعرات کے کلام سے مستفید ہونے کا موقع ملا جنہوں نے اپنے دور میں حمد و نعت کی روایت کو قائم رکھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ''دکن سے دلی تک... غزل کی سفر کہانی'' جس انداز سے بیان کی ہے وہ ان کی انفرادیت فکر اور جدت پسندی کا نادر نمونہ ہے۔ اُن کے انداز نگارش سے لطف اندوز ہونے کا موقع مل رہا ہے۔ ''الاقرباء'' کا ہر شمارہ صاحبانِ علم و ادب کی گرانقدر نگارشات سے مزین ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس شوقِ عرق ریزی کو ہمیشہ معطر رکھے۔ آمین

طاہر نقوی۔ کراچی

جانے والوں کے سلسلے میں گوشۂ رفتگاں شامل کر کے آپ نے نہ صرف اپنا فرض ادا کیا بلکہ دوسرے ادبی رسالوں کے مدیروں کو اس جانب متوجہ کیا ہے۔ کشفی صاحب اور قرۃ العین طاہرہ کے مضامین ماضی میں لے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر کشفی کے مرتبے کو نظر میں رکھتے ہوئے ابھی تک اُن کی یاد میں نہ کوئی قابلِ ذکر تقریب ہو پائی ہے اور نہ اُن کے فن اور شخصیت پر کوئی ٹھوس مقالہ سامنے آیا ہے۔ آپ کے پرچے میں افسانوں کی کمی ہمیشہ محسوس ہوتی ہے۔ اس معاملے میں خود افسانہ نگاروں کو توجہ دینی چاہیے۔
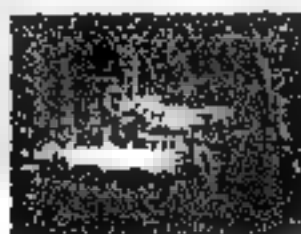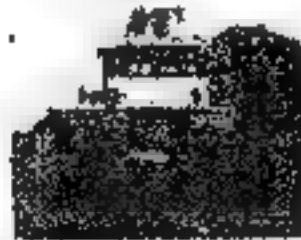
خبرنامہ

الاقرباء فاؤنڈیشن

(اراکین کے لیے)

مرتبہ
شہلا احمد

احوال وکوائف

☆ **الاقرباء فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام تخلیقی نگارشات ورکشاپ کا انعقاد**

مورخہ ۳۰ اگست بروز ہفتہ مجلس انتظامیہ الاقرباء فاؤنڈیشن نے تخلیقی نگارشات کے حوالے سے ایک ورکشاپ کا اہتمام کیا جو ای۔ ایم۔ ایس ہائی اسکول میں منعقد کیا گیا۔ اس سلسلے میں اسکول کے سرپرست اعلیٰ جناب سید منسوب علی زیدی و بیگم فیروزہ زیدی نے جو فاؤنڈیشن کے رکن بھی ہیں، بے حد تعاون کیا، انتظامات میں خصوصی دلچسپی لی۔ ورکشاپ کا بنیادی خیال ہالہ صابری نے جو جناب جی اے صابری و بیگم ماریہ صابری کی صاحبزادی ہیں، پیش کیا۔ بیگم ماریہ صابری، بیگم راشدہ زیدی اور پروفیسر ہما سالاری نے اسے عملی جامہ پہنایا اور ہالہ صابری تو تھیں ہی اس کی روح ورواں۔ اس ورکشاپ میں فاؤنڈیشن اور اسکول کے تقریباً اٹھارہ بچوں نے حصہ لیا اور نہایت جوش وخروش اور دلچسپی کا اظہار کیا۔ چار گھنٹوں پر مشتمل یہ ورکشاپ شام ساڑھے سات بجے اختتام پذیر ہوا۔ وقفہ کے دوران شرکاء اور مہمانوں کی تواضع کی گئی۔ آخر میں بچوں کو سرٹیفکیٹ دیئے گئے اور فوٹوگرافی ہوئی۔ بلاشبہ یہ بچوں کی تخلیقی صلاحیتیں اجاگر کرنے کی بہترین کاوش تھی۔

☆ **تعلیمی شعبہ میں بہترین کارکردگی:**

O جناب حسن سجاد و بیگم عالیہ سجاد اراکین مجلس انتظامیہ کے فرزند سید مزمل حسین نے اس سال بیکن ہاؤس سسٹم اسلام آباد سے O, Level "8As" کے ساتھ پاس کیا ہے۔ اسی سکول سے A, Level مکمل کرکے آئندہ میکاٹرونگ انجینئرنگ کرنے کا پروگرام ہے۔ ادارہ سہ ماہی الاقرباء اس شاندار کارکردگی پر انہیں اور والدین کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہوئے مستقبل میں اعلیٰ ترین کامیابیوں کیلئے دعاگو ہے۔

- سید غضنفر سالاری پسر جناب ظفر اللہ سالاری و نیر سالاری اپنا گذشتہ اعلیٰ ریکارڈ برقرار رکھتے ہوئے الیکٹریکل انجینئرنگ کے فائنل سمسٹر میں بہترین کارکردگی پر اسکالرشپ کے حقدار ٹھہرے ہیں۔ ادارہ اس کامیابی پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آئندہ بھی انہیں ایسی کامیابیاں عطا فرمائے۔آمین!
- ممبر الاقرباء فاؤنڈیشن جناب اطہر الاسلام احمد و بیگم مریم اطہر کے صاحبزادے اور راقم کے پوتے رمان جان اطہر نے دوئم کلاس اعلیٰ ترین اعزاز کے ساتھ پاس کر لی ہے۔ مجموعی طور پر انہوں نے ۹۵% نمبر حاصل کیے اور یوں Honour Certificate کے ساتھ ساتھ گولڈ میڈل بھی حاصل کیا۔ اس اعلیٰ ترین اعزاز پر ادارہ سہ ماہی الاقرباء انہیں اور والدین و اہل خانہ کو دلی تہنیت پیش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سدا انہیں بہترین کامیابیوں سے نوازے۔آمین!
- سیدہ شیبہ فاطمہ نے جو ممبر الاقرباء فاؤنڈیشن جناب سید منور عالم و بیگم رفعت عالم کی صاحبزادی ہیں۔ بورڈ اور اسکالرشپ کا امتحان بہترین نمبروں کے ساتھ پاس کرلیا ہے۔ بورڈ میں ان کی پوزیشن تیسری رہی۔ جبکہ اسکالرشپ کا امتحان ۸۳% نمبروں کے ساتھ پاس کیا۔ یہ سرسید ایف۔جی اسکول کی طالبہ ہیں۔ والدین اور شیبہ فاطمہ کیلئے اس پرمسرت موقع پر بہت ساری دعائیں اور نیک خواہشات۔۔۔
- مجلس منتظمہ الاقرباء فاؤنڈیشن کے رکن جناب جی۔اے صابری و بیگم ماریہ صابری کے صاحبزادے عزیزی مصعب صابری A. Level مکمل کر کے مانچسٹر چلے گئے۔ وہاں وہ مانچسٹر یونیورسٹی سے مکینیکل انجینئرنگ کریں گے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اعلیٰ ترین کامیابیاں عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین! ادارہ سہ ماہی الاقرباء کی طرف سے عزیزی مصعب و اہل خانہ کو مبارکباد۔
- وجیہہ سالاری الاقرباء فاؤنڈیشن کی ڈپٹی سیکرٹری جنرل محترمہ ہما سالاری و جناب مزمل سالاری کی صاحبزادی ہیں۔ انہوں نے اس سال کلاس نہم کا امتحان بورڈ سے ۹۳% نمبروں کے ساتھ پاس کیا ہے۔ پورے اسکول میں ان کی پوزیشن دوسرے نمبر پر رہی۔ پریزنٹیشن کونونٹ ہائی اسکول راولپنڈی کی ہونہار طالبہ ہیں۔ مستقبل میں میڈیکل کرنے کا ارادہ ہے کہ سائنس ان کا

پسندیدہ مضمون ہے۔ ادارہ اعلیٰ کارکردگی پر انہیں اور والدین کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہوئے مستقبل میں کامیابیوں کے لئے دعا گو ہے۔

☆ اراکین الاقرباء فاؤنڈیشن کا دورہ بیرونی ممالک:

O رکن مجلس منتظمہ جناب حسن سجاد و بیگم عالیہ حسن گذشتہ دنوں اپنے بچوں کے ہمراہ نجی دورے پر امریکہ تشریف لے گئے۔ جہاں انہوں نے امریکہ میں مقیم اپنے صاحبزادوں محسن حسن اور مجاہد حسن کے ساتھ کچھ عرصہ قیام کیا۔ محسن حسن کینیڈا میں ''الیکٹرونک'' آرٹس کمپنی میں سینئر سوفٹ Developer کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ مجاہد حسن مائیکروسافٹ کمپنی سیاٹل میں ملازمت کرتے ہیں۔ جبکہ ان کے داماد عامر ضیاء اٹلانٹا میں رہائش پذیر ہیں اور وہیں ایک کمپنی میں Disk Doctor کی پوسٹ پر کام کر رہے ہیں۔ جناب و بیگم حسن و اہل خانہ نے دوران قیام مختلف مقامات مثلاً ڈزنی اور یونیورسل اسٹوڈیوز کی سیاحت کی۔ کچھ وقت انہوں نے اپنی صاحبزادی نوشین و داماد عامر ضیاء کے ہمراہ اٹلانٹا میں گزارا اور وطن واپس آگئے۔

O گذشتہ دنوں راقم الحروف بھی اپنے بھائی جناب سہیل نواب جان و اہل خانہ کی دعوت پر امریکہ گئی ہوئی تھی۔ میرا مستقل قیام یوں توLwisvilie Dallas ریاست ٹیکساس میں تھا لیکن میں کئی اور شہروں کی سیاحت پر بھی گئی۔ جن میں آسٹن ہیوسٹن اور سین انٹونیو شامل ہیں۔ سب سے زیادہ لطفSan Antonio میں آیا کہ یہاں تاریخی اہمیت کے مقامات کے علاوہ جدید ترین قابل دید مقامات بھی ہیں۔ جن میںTower of America, Sea World اور Wonder World دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ میرا امریکہ میں قیام تقریباً چار ماہ کا تھا۔ اس حوالے سے بہت سی یادداشتیں ہیں جو انشاء اللہ اگلے شمارہ میں پیش خدمت کروں گی۔

O موسم گرما کی تعطیلات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جناب سید نذر علی زیدی و بیگم راشدہ زیدی نے بھی بیرون ملک سفر کا ارادہ کر ڈالا۔ وہ اپنی صاحبزادی جبینش اور داماد عزیزی عاصم کی دعوت پر گذشتہ دنوں ملائیشیا تشریف لے گئے تھے۔ ان کا وہاں قیام تقریباً دو ہفتے کا تھا۔ جس کا ایک ایک لمحہ انہوں نے گوشہ گوشہ کی سیر و سیاحت میں گزارا اور وہاں کے قدرتی حسن سے خوب خوب لطف اندوز

ہوئے۔ کیبل کار کے ذریعے پورے سنگاپور کی سیر کی۔ پنک ڈولفن شو کے علاوہ زیر آب دنیا کی سیر کا بھی لطف اٹھایا۔ اور بہت سے خوبصورت خواب آنکھوں میں سجائے ۱۳ اگست کو وطن عزیز واپس پہنچ گئے۔

☆ ECC (Early Childhood Car) کیلئے الاقرباء فاؤنڈیشن کی طرف سے عطیہ:

الاقرباء فاؤنڈیشن کے محدود وسائل کے باوجود ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ وہ کسی نہ کسی حوالے سے فلاحی کاموں میں حصہ لے جس میں فروغ تعلیم سرفہرست ہے۔ چنانچہ گزشتہ دنوں رمضان المبارک کے موقع پر FGG ہائی اسکول جگیوٹ فیڈرل ایریا، اسلام آباد اور FG پرائمری اسکول موہریہ فیڈرل ایریا، اسلام آباد کو مبلغ پچیس ہزار روپے اساتذہ کی ایک سال کی تنخواہ کی مد میں عطیہ کرنے کے علاوہ بچوں کو یونیفارم اور کتابیں بھی فاؤنڈیشن کی طرف سے دی گئیں۔ یہ اسکول پاکستان گرلز گائیڈ ایسوسی ایشن کی اسلام آباد کیپٹل ٹیریٹری (ICT) برانچ کے زیر اہتمام کچی آبادیوں کے غریب بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور اس سلسلے میں انہیں کافی حد تک کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے۔ الاقرباء فاؤنڈیشن کی اس کار خیر میں شمولیت بیگم ماریہ صابری کے توسط سے ہوئی جو PGGA- ICT برانچ کی چیئر پرسن ہونے کے علاوہ مجلس منتظمہ الاقرباء فاؤنڈیشن کی رکن بھی ہیں۔

☆ سلمان منصور، سارہ سلمان اور صباحت منصور کا آئندہ حج کی سعادت حاصل کرنے کا پروگرام

ادارہ سہ ماہی الاقرباء عزیزی سلمان منصور، سارہ سلمان اور صباحت منصور کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ حج سعید کے اس مبارک سفر میں تمام تر آسانیاں اور رحمتیں ان کے شامل حال رکھے اور جملہ ارکانِ مبارکہ بحسن و خوبی ادا کرنے کی سعادت سے سرفراز فرمائے۔ آمین ثم آمین!

☆ سیّد سلمان منصور کا اعزاز:

صدر الاقرباء فاؤنڈیشن جناب سیّد منصور عاقل کے صاحبزادے سید سلمان منصور کو جوٹی بینک اسلام آباد میں آپریشنز ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ رہ چکے ہیں اور کے۔ اے۔ ایس۔ بی سیکوریٹیز میں اہم خدمات انجام دے چکے ہیں۔ ان کے موجودہ ادارے فوجی فاؤنڈیشن کی ذیلی کمپنی فاؤنڈیشن سیکیوریٹیز اسلام آباد میں سینئر مینیجر کے عہدہ پر ترقی دے دی گئی ہے۔ نیز کراچی اسٹاک ایکسچینج نے انہیں اسلام آباد آفس کے انتظام و انصرام کا اختیار نامہ جاری کر دیا ہے۔ واضح رہے کہ ایسا اختیار نامہ پیشہ ورانہ صلاحیتوں کے اعتراف میں جاری کیا جاتا ہے۔ ادارہ عزیزی سلمان منصور کو اس اعزاز پر مبارکباد پیش کرتا ہے۔

راشدہ نذر زیدی

'سفر ہے شرط ۔۔۔!'

برسوں پہلے کوئی گیت سنا تھا جس میں سنگا پور کی دعوت دی گئی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے آپ نے لاہور کے بارے میں سنا ہوگا کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ دنیا میں نہیں آیا۔ تو خیال آیا کہ اپنے دنیا میں آنے کا ثبوت تو ہم بارہا پیش کر چکے اب ذرا اردگرد نظر ڈالی جائے شاید کم ہوتی بینائی کچھ بحال ہو جائے۔ چنانچہ اپنے پیاروں کے اصرار پر رخت سفر باندھ ہی لیا۔

سنگا پور ایئر پورٹ سے نکلے تو معلوم ہوا کہ کسی سرسبز و شاداب باغ میں داخل ہو رہے ہیں۔ نہایت صاف ستھرے راستے خوبصورت پودے' رنگ برنگ پھول اور جھومتے ہوئے درختوں کی کثرت' ہر درخت یوں لگتا تھا جیسے نہایت پیار سے اور سوچ سمجھ کر حسن ذوق کے مطابق لگایا گیا ہے اور اس کی مناسب پرداخت بھی ہوئی ہے۔ کہیں ایک پتہ یا جھاڑ جھنکار اڑتا نظر نہ آتا تھا۔ اگرچہ ساحلی ہوا اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی تھی۔ درحقیقت صرف ایئر پورٹ کا راستہ ہی نہیں بلکہ پورا سنگا پور ہی ایک آراستہ و پیراستہ باغ ہے جس کا ہر گوشہ دامن دل کھینچتا ہے۔ اور یہاں کے لوگوں کی فطرت سے محبت آشکار ہے۔

موسم برسات کا تھا' ویسے وہاں تو سارا سال وقتاً فوقتاً بارش ہوتی رہتی ہے اور موسم ایک سا ہی رہتا ہے۔ لیکن اس قدر سبزہ اور درخت ہونے کے باوجود یہ خوبصورت ملک ایک خودرو جنگل کی شکل اختیار نہیں کرتا اور بے مہار سبزہ' در و دیوار سے نہیں اُگتا بلکہ انسان نے زمین کی اس قوت نمو کو اپنی گرفت میں لا کر چار چاند لگا دیئے ہیں۔ تزئین نظر کے یہ کرشمے صرف پھول پودوں تک ہی محدود نہیں' آپ بازاروں میں چلے جائیں' سڑکوں پر گھومیں' ساحل سمندر پر جا نکلیں یا کسی جھیل کے کنارے محو نظارہ ہوں' نہایت پر فضا اور صاف شفاف ماحول پائیں گے۔ یہاں کی بندرگاہ مصروف ترین ہے۔ مگر حیرت انگیز طور پر صفائی کا معیار وہاں بھی مثالی ہے اور حسن نظر یہ کو یہ لوگ مجروح نہیں

ہونے دیتے۔ معلوم ہوا سڑکوں اور بازاروں میں کوڑا کرکٹ پھینکنے اور ماحول آلودہ کرنے پر سخت جرمانہ ہوتا ہے۔ شروع شروع میں یہ عادت مشکل سے پڑی ہوگی مگر اب تو ان کے مزاج کا حصہ بن گئی ہے اور یہی تاثر ملتا ہے کہ انہیں اپنے ملک اور ماحول سے اتنا پیار ہے کہ اس پر کوئی دھبہ برداشت نہیں کر سکتے۔

ہوٹلوں وغیرہ کی پڑتال روزانہ ہوتی ہے اور صحت و صفائی کے معیار کے مطابق ان کی درجہ بندی کی جاتی ہے اور گریڈ A اور B کے بورڈ کو سامنے لٹکایا جاتا ہے۔ سنا ہے 'C' اور 'D' کی نوبت ہی نہیں آتی۔ واللہ اعلم! ہماری پرواز آدھی رات کو لاہور سے روانہ ہوئی اور علی الصبح سنگاپور پہنچ گئی تھی۔ لہٰذا ایک دن بھی ضائع نہ کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے عاصم اور بینش نے ہماری سیر و تفریح کا مکمل پروگرام

جناب و بیگم منذر علی زیدی

مرتب کر دیا۔ یہ سن کر میری تو خوشی دوچند ہو گئی کہ سنگاپور میں گارڈن فیسٹیول ہو رہا ہے جس میں دنیا بھر سے باغ لگانے' آرائشی پودوں اور آرائشی گل کے مقابلے شامل ہیں۔ اخبار میں جو اشتہار دیا گیا تھا اس کے مطابق اس فیسٹیول کی سیر کے لئے جو ایک وسیع و عریض کنونشن کی تین بالائی منزلوں پر سجایا گیا تھا۔ کم از کم پندرہ گھنٹے درکار تھے۔

ایک منزل پر دنیا بھر سے آئے ہوئے باغات تھے۔ یہ فکر انگیز باغات دراصل انسان کی حسِ لطیف اور شعور و ادراک کا دلکش اظہار تھے۔ یہ تصوراتی باغات Fantasy Garden تھے۔ ہر باغ کا بنیادی تخیل اور اس کی تفصیل اس کے باہر آویزاں تھی۔ ہر باغ اپنی جگہ کسی نہ کسی ملک کے لوگوں کی حسنِ تخیل کا شاہکار تھا۔ لیکن چند نام خاص طور پر خیال افروز تھے مثلاً ''ورِیم دا''۔ ''بچپن کی تلاش نو''۔ ''(بچپن کے) ایک مرغاب گاؤں کی یادیں''...... ''ابدی سرزمین کی کھوج''۔ ایک ناول نگار کے حوالے سے جو نابینا ہو گیا تھا...... ''دھندلکوں کا موسم'' کے نام سے دل کو چھو

لینے والا باغ لگایا گیا تھا۔ باغ لگانا ہمارا بھی تاریخی و تہذیبی ورثہ ہے۔ ہم جو شہر بنانے سے پہلے باغ
لگاتے تھے' یہاں ہماری نگاہیں کسی پاکستانی چمن کی تلاش میں سرگرداں رہیں۔ سے تھے تو آبادہ
تمہارے ہی........! 'Orchid' اس ملک کا قومی پھول ہے ہمارا یاسمین ہے۔ انہوں نے اپنے
پھول سے اظہار محبت کے طور پر اسے صدہا اقسام اور بے شمار رنگوں میں لگایا ہے چنانچہ ایک پورا فلور
صرف Orchid کی اقسام اور اس کی سجاوٹ کے لئے مخصوص تھا۔ انسان کی قوت نمو جب قدرت کی
قوت تخلیق سے ہم آہنگ ہوتی ہے تو کیا کیا گل و گلزار کھلاتی ہے۔ ذہن میں مسلسل بازگشت ہو رہی
تھی۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار وراغ آفریدی خیابان و گلزار و باغ آفریدم

خواتین اور اسکول کے بچوں کے آرائش گل اور فالتو چیزوں کو پھولوں کے حوالے سے
استعمال کرنے کے مقابلے بھی تھے۔ اس شو میں داخل ہو کر یوں لگتا تھا کہ پوری قوم کو سوائے پھول
پودوں کی نوک پلک سنوارنے کے کوئی اور کام ہی نہیں۔ فطرت سے لگاؤ یہاں کے لوگوں کی فطرت ثانیہ
بن گیا ہے۔ جانوروں اور پرندوں سے محبت کرنا اور انہیں ایک خوبصورت زندگی اور قدرتی ماحول
مہیا کرنا انہیں بچپن سے سکھایا جاتا ہے۔ عموماً لوگ خوش باش اور خوش مزاج ہیں۔
"جیو اور جینے دو" کا اصول روزمرہ زندگی میں کارفرما نظر آتا ہے۔ انفرادی و اجتماعی
معاملات میں فتنہ فساد کا آغاز ہی دوسروں کے معاملات میں بے جا مداخلت سے ہوتا ہے۔ لیکن اگر ہر
شخص کو یہ معلوم ہو کہ جہاں سے دوسرے کی ناک شروع ہوتی ہے وہاں میری آزادی ختم ہو جاتی ہے
تو "ناک" کا مسئلہ کھڑا نہیں ہوتا۔ بے مہار شخصی آزادی کے جلوے جابجا نظر آتے ہیں مگر اپنی حد تک
....قانون کی پاسداری ہر شخص کرتا ہے۔
سنگاپور میں مسلمانوں' عیسائیوں' بودھوں اور ہندوؤں کے خاص مذہبی تہواروں پر تعطیل
ہوتی ہے اور باہمی رواداری سے یہ دن منائے جاتے ہیں۔ فرقہ واریت اور مذہب کے نام پر

ہنگامہ کھڑا کرنے کی گنجائش ہے اور نہ حکومت ایسے اقدامات کی سرپرستی کرتی ہے۔ شہریوں کے تحفظ اور امن و امان کے سلسلے میں سخت قوانین ہیں یہی وجہ ہے کہ یہ ملک دنیا بھر کے سرمایہ کاروں کی توجہ کا مرکز بن گیا ہے۔ اگرچہ اس کے نتیجے میں یہاں مہنگائی میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ وقت کی آواز سننے اور سمجھنے والے ممالک تیزی سے ہر قسم کی مارکیٹ پر قابض ہوتے جا رہے ہیں۔ دیانتدارانہ تجارت ہمارے لئے سنت رسولؐ ہے اور میدان تجارت کبھی ہماری بھی جولانگاہ تھی۔ مگر دنیا کو یہ اصول سکھا کر ہم نے اغیار کے لئے میدان خالی کر دیا۔

خدا خوش رکھے عاصم اور بہنٹ کو جنہوں نے اصرار کر کے ہمیں ملیشیا کی سیر کا موقع بھی فراہم کیا۔ سنا ہے کہ پہلے ملیشیا کے ویزے کی ضرورت نہ تھی لیکن اب ضروری ہے۔ پاکستانیوں کے کاغذات کی غیر معمولی جانچ پڑتال کا تجربہ بھی ہوا۔ یہ ملک اب سنگاپور کا ہمسایہ ہے پہلے ایک ہی ملک تھا۔ مسلمانوں کے لئے موجودہ عالمی حالات میں یہ ملک عربوں کی سیر و تفریح کا خاص مرکز بن گیا ہے۔ لیکن نہ تو میں ماہر اقتصادیات و معاشیات' نہ میرا سیاست سے دور کا بھی کوئی واسطہ۔ مگر مجھے یوں محسوس ہوا کہ آج کی دنیا کے نقشے پر یہ ملک ایک روشن تر اسلامی ملک کے طور پر نمایاں ہو رہا ہے۔ سرمایہ کار دنیا سے کھنچ کر یہاں پہنچ رہے ہیں اور اس کی علامات نظر آتی ہیں۔ ان لوگوں کا ہاتھ بھی وقت کی نبض پر ہے چنانچہ وہ اپنے ملک کو سیاحوں اور سرمایہ کاروں کے لئے پرکشش بنانے میں کوشاں ہیں۔ صفائی ستھرائی اور دلکشی اس ملک کا طرۂ امتیاز ہے۔ کوالالمپور کا مینارہ اور جڑواں ٹاور جس میں مختلف کمپنیوں کے بے شمار دفاتر ہیں دور سے آنے والوں کی نظروں کو خیرہ کرتے ہیں۔ ان کے نیچے خریداری کے بڑے بڑے مراکز ہیں۔ مینارہ کی انتہائی بلند بند گیلری پر لفٹ کے ذریعے جا کر ہم نے شہر کا نظارہ کیا۔ خوبصورت مرکزی جامع مسجد اور اسلامک آرٹ میوزیم بھی دیکھے جس میں مختلف اسلامی ملکوں کا آرٹ' خطاطی سے لے کر زیورات اور فن تعمیر تک نہایت سلیقے سے پیش کیا گیا ہے۔ ایک بڑے ہال میں تمام اسلامی ملکوں کی مشہور مساجد کے نمونے موجود ہیں۔ روضہ تاج محل بھی ان ''مساجد'' کے درمیان نظر آتا ہے۔ تاہم کسی پاکستانی مسجد کی متلاشی نگاہیں ناکام رہتی ہیں۔ نہیں معلوم یہ کس کی ذمہ داری ہے؟ بہرحال ہم نے تاثرات کی کتاب میں اپنی اس معصوم خواہش کو قلمبند

کیا اور باہر نکل آئے۔ ہاں! ایک دلچسپ نظارہ مرکزی مسجد کے داخلی دروازے پر یہ تھا کہ مختصر لباس میں ملبوس متعدد غیر مسلم خواتین' دروازے کے قریب رکھے ہوئے حجاب اور برقعے پہن کر بصد شوق تصاویر کھنچوانے میں مصروف تھیں۔

ملیشیا کا مختصر دورہ ختم کر کے ہم واپس سنگاپور پہنچے۔ بینش کی ڈائری کے مطابق ابھی عرب سٹریٹ اور سینٹوسا آئی لینڈ کی سیر باقی تھی۔ سنگاپور میں عربوں کی آمد کی نشانی کے طور پر قدیم محلے کی نوک پلک سنوار کر اسے قائم رکھا گیا ہے۔ ایک بڑی اور خوبصورت 'مسجد سلطان' بھی یہاں موجود ہے۔ عید کی نماز کا بڑا اجتماع بھی یہیں ہوتا ہے۔ عید کو یہاں کی زبان میں ''ہری رایا'' کہتے ہیں۔ رمضان کی آمد آمد تھی چنانچہ ''ہری رایا'' کو سجایا جا رہا تھا۔ یہاں عربی اور ترکی کی ریسٹورنٹ میں منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے لوگ ضرور جاتے ہیں۔ ویسے بھی یہ قوم کھانے پینے کی شوقین ہے۔ جا بجا فوڈ سٹریٹس اور لذت کام و دہن کے سامان ہیں۔ سینٹوسا آئی لینڈ سنگاپور کے لئے قدرت کا ایک تحفہ ہے۔ اس جزیرے کو بنا سنوار کر جس طرح سیاحوں کے لئے جاذب نظر بنا دیا گیا ہے۔ وہ ایک الگ ہی کہانی ہے۔ یہاں سے کیبل کار چلتی ہے جو سمندر پر سے گزرتی ہوئی سنگاپور کی فلک بوس عمارتوں کی چھت پر جا اترتی ہے۔ آپ اترنا چاہیں تو نظارہ کر کے واپس جزیرے پہنچ جائیں۔ جزیرے میں Pink Dolphin Show اور زیر آب کی سیر ایک دلچسپ تجربہ تھا۔

خدا عاصم اور بینش کی عمر اور خوشیوں میں برکت دے۔ جنہوں نے ہمارے اس سفر کو ہر طرح یادگار بنانے کی پوری کوشش کی۔ ۱۳ اگست کو لاہور پہنچ کر ہمارا یہ دو ہفتے کا سفر اختتام پذیر ہوا۔ اپنے وطن کی سرزمین پر قدم رکھنے کا اپنا ہی نشہ ہے۔ دل میں ہزاروں آرزوئیں چٹکیاں لے رہی تھیں کہ اپنے وطن کی بہتری کے لئے مزید یہ کریں گے۔ وہ کریں گے۔ کہ عزیزم فیصل جو ہمیں لینے ایئر پورٹ آئے تھے ان کا موبائل بجنے لگا۔ خیریت ہے؟ زیدی صاحب نے سوال کیا۔ انکل ابھی ابھی لاہور میں دھماکہ ہوا ہے۔ گھر سے فون تھا کہ فلاں سڑک پر نہ آئیں۔

رپورٹ

ہما مزمل سالاری

'الاقرباء' ورکشاپ برائے تخلیقی نگارشات

موجودہ دور میں تعلیمی روابط قائم کرنا اور انہیں نشوونما دینا بہت ضروری ہے۔ مسلسل نمو اور ترقی کے لیے ایک اچھی حکمت عملی وضع کرنا بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ الاقرباء فاؤنڈیشن انہی نکات پر عمل پیرا ہے اور منزل کی طرف مختلف سفر طے کرتے ہوئے کامیابی سے اپنے مقاصد حاصل کر رہی ہے۔ اسی سلسلے کی کڑی ۳۰ اگست ۲۰۰۸ء بروز ہفتہ منعقد ہونے والی Workshop تھی، جس میں writing بالخصوص story writing skill اور dialogue writing میں بچوں کی رہنمائی کی گئی۔

محترمہ ماریہ صابری نے منتظمہ کے فرائض انجام دیے اور ان کی معاونت بیگم نذر زیدی، ہما مزمل سالاری (راقم الحروف) اور ہالہ صابری نے کی۔ اس workshop کا انعقاد EMS اسکول کے سرپرست اعلیٰ جناب و بیگم سید منسوب علی زیدی کے اشتراک سے ان کے سکول میں ہوا۔ اس ورکشاپ میں تیسری جماعت سے لے کر میٹرک اور O, level کے بچوں نے شرکت کی اور والدین نے بھی بچوں کو دوپہر 3 بجے پہنچانے اور شام ۷:۳۰ بجے واپس لے جانے کی ذمہ داری بطریق احسن انجام دی۔

وقت مقررہ پر ہالہ صابری نے اللہ تعالیٰ کے بابرکت نام سے ورکشاپ کی ابتداء کی اور مجلس منتظمہ کا مختصر تعارف کرایا۔ راقم الحروف نے الاقرباء فاؤنڈیشن کے اغراض و مقاصد پر انگریزی و اردو میں مختصر روشنی ڈالی۔ بعد ازاں ہالہ صابری نے جو خود بھی مانچسٹر یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہیں، نہایت دلچسپ انداز سے ورکشاپ کا آغاز کیا۔ ابتداء میں وہ بچوں کی دلچسپی کے مختلف سوالات پوچھ کر انہیں سوچتے، بولتے، ہنستے، مسکراتے اور خوشگوار موڈ میں لائیں، پھر story writing کے اہم نکات پر روشنی ڈالی۔ انہوں نے انگریزی اور اردو دونوں زبانوں کا خوب

استعمال کیا کہ ہر بچے کو ٹھیک ذہن نشین ہو جائے۔ محترمہ راشدہ منظور زیدی نے جو Beacon House School System میں اردو ادب کی استاد ہیں' نہایت مدلل انداز میں اردو کہانی نویسی پر روشنی ڈالی جبکہ راقم الحروف نے انگریزی میں story writing کے نکات سمجھائے۔ سب سے اہم ذمہ داری محترمہ ماریہ صابری نے انجام دی جو مسلسل اہم نکات کو black board پر لکھتی گئیں اور بچوں کی توجہ مرکوز کرنے کے لئے ان سے وقتاً فوقتاً مختصر سوالات پوچھتی رہیں۔ story writing کے تمام نکات کی وضاحت کے بعد بچوں کو ایک dramatic situation دے کر اپنی کہانی لکھنے کو کہا گیا کہ یہ workshop عملی اور تصوراتی طور پر سیکھنے کے لئے منعقد کی گئی تھی۔ ورکشاپ میں شریک طلباء طالبات کا تعلق مختلف جماعتوں سے تھا۔ لہٰذا انہیں گروپس میں تقسیم کیا گیا۔ ہر گروپ میں چار بچے شامل تھے اور ہر age group کے تھے اس سے نہ صرف story writing skill سیکھنے کا موقع ملا بلکہ بچوں کو ایک دوسرے کے قریب آنے اور عمروں کے فرق بھول کر group work کی افادیت اور تجربے کا موقع ملا۔ یہ نہ صرف دوسروں سے تبادلۂ خیالات کرنے بلکہ اپنی سوچ نکھارنے کا موقع بھی تھا۔ الاقرباء فاؤنڈیشن کا سب سے اہم مقصد ہی بچوں اور جوانوں میں شعور اجاگر کرنا اور مفادِ عامہ کے لئے بڑھ چڑھ کر کام کرنا ہے۔

غرض تمام بچے نہایت خوشگوار موڈ میں ہنستے مسکراتے اپنے تصورات کو استعمال کرتے ہوئے گروپ کی شکل میں کہانی لکھنے میں کامیاب ہو گئے۔ زبان کی کوئی قید نہ تھی اور انگریزی یا کسی بھی زبان میں اظہارِ خیال کیا جا سکتا تھا۔ اگلے مرحلے میں ہر گروپ کے بچوں نے کہانی پڑھ کر سنائی اور خوب داد وصول کی۔

ساڑھے پانچ تا چھ بجے بچوں کے لئے refreshment کا انتظام تھا۔ اس دوران بچوں نے کھایا پیا' کچھ دیر ادھر ادھر صاف ستھرے class rooms میں پھرتے رہے کہ EMS School کا ہر کلاس روم نہایت خوبصورتی سے مختلف charts کی مدد سے سجا ہوا تھا۔ چھ بجے دوسری

نشست تھی جس میں dialogue writing کے مختلف پہلو سمجھائے گئے۔ اس نشست میں بچے پہلے سے activate ہونے کے سبب جلدی اپنی اپنی کاوشوں کو ہاتھ میں لئے دو دو ساتھیوں کی شکل میں اپنے گروپ کو represent کرتے ہوئے دلچسپ dialouge سنانے کے لئے آگے آئے اور تقریباً سات بجے یہ مرحلہ بھی بخوبی اختتام پذیر ہوا۔

یہ بلاشبہ ایک بہترین پروگرام تھا جس سے بچوں نے اپنے تجربات و خیالات کو بہترین انداز میں تحریر کرنے کا فن سیکھا۔ الاقرباء کے اس کامیاب تجربہ سے نہ صرف بچوں میں لکھنے کی عادت کو فروغ ملا بلکہ ان میں اعتماد پیدا ہوا جو نہ صرف الاقرباء فاؤنڈیشن بلکہ ہمارے ملک کے روشن مستقبل کی علامت ہے۔ اس ورکشاپ سے بلاشبہ بچوں نے نئے لوگوں سے ملنے کی تربیت حاصل کی۔ معلومات کا زیادہ سے زیادہ تبادلہ کیا اور اپنی شخصیت کو فعال اور لچکدار ثابت کرنے کا فن سیکھا۔ اس ورکشاپ کی سب سے دلچسپ بات صدر الاقرباء فاؤنڈیشن جناب سید منصور عاقل کی ذاتی دلچسپی تھی کہ وہ تقریباً آدھ گھنٹہ اس ورکشاپ میں شامل رہے اور بچوں کو دیے جانے والے Participation Certificates پر دستخط کیے۔ آخر میں محترمہ شہلا اسلام، نائب صدر الاقرباء فاؤنڈیشن نے بچوں میں سرٹیفکیٹ تقسیم کیے۔ اس کے بعد فوٹوگرافی ہوئی اور یوں ہنستے مسکراتے کچھ سیکھتے سکھاتے یہ خوبصورت تقریب اختتام پذیر ہوئی

الرصابری لیکچر دیتے ہوئے

محترمہ شاہدہ زیدی اور محترمہ صابری ورکشاپ کا جائزہ لیتے ہوئے

ورکشاپ میں شرکت کرنے والے بچوں کے نام درج ذیل ہیں:

۱۔ ہما فرحان ۲۔ لبید حکیم ۳۔ محمد زین ۴۔ روانع فرحان

۵۔ عامر جان خان، ۶۔ محسن علی ۷۔ مامون صابری ۸۔ سدرہ فاطمہ

۹۔ صدف نور وقار   ۱۰۔ صدرخ وقار   ۱۱۔ حرا بشارت   ۱۲۔ اسد بشیر
۱۳۔ فائز حسن زیدی   ۱۴۔ سہیل حسن زیدی   ۱۵۔ وجیہا مزمل سالاری   ۱۶۔ ملیحہ مزمل سالاری

شہلا احمد

طب و صحت

دل کی بند شریانیں کھولنے کا اکسیر نسخہ (بشکریہ حضرت مولانا اللہ وسایا مدظلہٗ)

دل کی بند شریانیں کھولنے کا یہ نسخہ جناب مولانا حافظ بشیر احمد عثمانی کا آزمودہ ہے اور ان کے توسط سے حضرت مولانا اللہ وسایا کو پہنچا۔ مندرجہ ذیل نسخہ جناب مولانا بشیر احمد عثمانی نے دو ماہ استعمال کیا اور ان کی دو بند شریانیں کھل گئیں اور وہ بائی پاس سے محفوظ ہو گئے۔ مولانا صاحب کو یہ نسخہ ایک حکیم صاحب نے عنایت فرمایا تھا۔ نسخہ یہ ہے:

۱۔ لیموں کا رس...... ایک پیالی   ۲۔ ادرک کا رس........ ایک پیالی
۳۔ لہسن کا رس...... ایک پیالی   ۴۔ سرکہ سیب....... ایک پیالی

چاروں پیالی رس کو باہم ملا کر نصف گھنٹے تک دھیمی آنچ پر پکائیں یہاں تک کہ رس تین پیالی رہ جائے۔ تیار محلول کو آگ سے اتار کر ٹھنڈا کر لیں۔ جب اچھی طرح ٹھنڈا ہو جائے تو اس میں تین پیالی شہد شامل کر کے پوری طرح مکس کریں اور ایک بوتل میں محفوظ کر لیں، روزانہ نہار منہ کھانے کے تین چمچ کھائیں۔ انشاءاللہ بند شریانیں کھل جائیں گی۔

بیگم حلیمہ آفتاب

گھریلو چٹکلے

☆ **بھوک نہ لگنے اور کھانا ہضم نہ ہونے کی شکایت ہوتو:** اس قسم کی تکلیف میں انار دانہ کا چورن بہترین ثابت ہوتا ہے۔ پانچ تولہ سونٹھ میں انار دانہ' زیرہ سفید' نمک سفید' نمک سیاہ ایک ایک تولہ ملا کر باریک سفوف کی شکل میں پیس لیں اور صبح و شام چھ ماشہ کھائیں۔ انشاء اللہ بہت جلد افاقہ ہوگا۔

☆ **پرانی پیچش' اسہال اور سیلان الرحم (لیکوریا) کیلئے:** آم کی گٹھلی ان امراض کیلئے بہت مفید ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں گیلک ایسڈ کثیر مقدار میں ہوتا ہے۔ یہ گرم اور قابض ہوتی ہے۔ گٹھلی کو باریک پیس لیں اور دو تین گرام تک شہد کے ساتھ استعمال کریں۔ پیچش اور آؤں کی صورت میں اس کا استعمال دہی کے ساتھ کریں۔ انشاء اللہ جلد ہی افاقہ محسوس ہوگا۔

☆ **دانتوں کی مضبوطی کیلئے:** انار کے پھول دانتوں کو مضبوط بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ پھولوں کو خشک کر کے باریک سفوف بنالیں اور بطور منجن دانتوں پر لگائیں۔ دانت مضبوط اور چمکدار ہو جائیں گے۔

☆ **جسم میں نقاہت' بخار اور سانس پھولنے کی تکلیف ہوتو:** اس سلسلے میں انگور خشک یا تازہ دونوں صورتوں میں مفید ہے۔ اس میں شفاء بخش اجزاء بدرجہ اتم موجود ہوتے ہیں۔ اس میں موجود گلوکوز جسم کو توانائی بخشتا ہے۔ پیاس بجھتی ہے۔ جلن کا احساس کم ہوتا ہے۔ بخار اور سانس پھولنے کی تکلیف میں کمی آجاتی ہے۔ موسم کے دوران تازہ انگور کا استعمال فرحت بخشتا ہے جبکہ اس کا رس ٹھنڈک فراہم کرتا ہے۔

☆ **ذیابیطس اور اسہال کیلئے:** آم کے پتے' چھال گوند اور بیج سب دوا کے طور پر

استعمال ہوتے ہیں۔ نرم اور خشک پتوں کا رس سفوف کی شکل میں اسہال اور ذیابیطس کے لئے مفید ہے جبکہ تازہ پتوں کا جوشاندہ ادرک کی درخت کی چھال اور سیاہ زیرہ کے ساتھ دے اور کالی کھانسی کیلئے بے انتہا فائدہ مند ہے۔

☆ **زہریلے کیڑے کے کاٹے کا علاج:** اگر کوئی زہریلا کیڑا کاٹ لے اور کوئی دوا میسر نہ ہو تو فوری طور پر دار چینی پیس کر اس کا لیپ کر دیں۔ سوزش اور درد میں کمی ہو جائے گی۔ ازاں بعد کسی معالج سے مشورہ کر سکتے ہیں۔

☆ **پیشاب میں جلن اور بلند فشار خون کیلئے:** کچنار کی سبزی ان امراض کے لئے بہت مفید ہے۔ چنانچہ ایسے مریضوں کو کچنار کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرنا چاہئے۔

☆ **چہرے کے غیر ضروری بالوں کیلئے:** ایک چمچ میدہ میں آدھا چمچ عرق گلاب ملا کر لیپ سا بنا لیں اور غیر ضروری بالوں پر لگا لیں۔ خشک ہونے پر ہاتھ سے مل مل کر جھاڑ دیں۔ تھوڑے ہی دن میں بال کمزور ہو کر بالکل ختم ہو جائیں گے۔

☆ **تھکن دور کرنے کیلئے:** معمر حضرات کے علاوہ نوجوان بھی تھکن محسوس کرتے ہیں۔ اس کے لیے ایک گلاس پانی میں ایک چمچ شہد اور ایک چٹکی دار چینی کا سفوف ملا کر دوپہر کے کھانے سے قبل پی لیں' انشاء اللہ ایک ہی ہفتہ میں نمایاں فرق محسوس ہوگا۔

☆ **درد شقیقہ کیلئے:** اس کے لئے گائے کے دودھ میں اکیس بادام کوٹ کر ڈالیں اور پھر اس میں چاول اور چینی ڈال کر کھیر بنالیں اور سات دن تک بلا ناغہ کھائیں۔ انشاء اللہ درد جاتا رہے گا۔ لیکن اس کیلئے شرط یہ ہے کہ کھیر روزانہ تازہ تیار کریں۔

☆ **چہرے کا حسن و تازگی برقرار رکھنے کیلئے:** کیلا چہرہ کا حسن نکھارتا ہے اور تازگی برقرار رکھتا ہے۔ وہ اس طرح کہ کیلے کے چھلکے کا اندرونی حصہ چہرہ کے کیل اور دانوں پر روزانہ رگڑیے۔ انشاء اللہ جلد ہی فائدہ محسوس ہوگا۔

Conquering new Frontiers

Entering in the World of Progress